امن کا نوبیل انعام جیتنے والی برمی رہنما
آنگ سان سوچی
خوف سے رہائی
ترجمہ: شفقت تنویر مرزا
مشعل

خوف سے رہائی

اور دوسری تحریریں

آنگ سان سوچی

ترجمہ: شفقت تنویر مرزا

مشعل

آر-بی 5. سیکنڈ فلور. عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک. نیو گارڈن ٹاؤن لاہور-54600. پاکستان

خوف سے رہائی

مصنف: آنگ ساں سوچی

اردو ترجمہ: شفقت تنویر مرزا

ناشر: مشعل
آر بی 5 ' سیکنڈ فلور '
عوامی کمپلیکس ' عثمان بلاک ' نیو گارڈن ٹاؤن '
لاہور -54600 ' پاکستان
فون و فیکس: 042-5866859
E-mail: mashal@infolink.net.pk

طباعت: اظہار سنز پرنٹرز ' لاہور ' پاکستان

پیش لفظ

برما کی تحریک آزادی کے عظیم رہنما جنرل آنگ سان کی دبلی پتلی اور خوش شکل بیٹی اور ۱۹۹۱ میں امن کا نوبیل انعام پانے والی سوچی. خاتون سیاسی رہنماؤں کے اس طبقے سے تعلق رکھتی ہے. جو اگرچہ اپنے خاندانی پس منظر کی وجہ سے یا اتفاقی اور حادثاتی طور پر سیاست میں آئی ہیں لیکن ان کی ایک اپنی علمی اور فکری بنیاد بھی ہے اور وہ فلسفیانہ سطح پر سیاسی. معاشرتی اور معاشی حالات کا تجزیہ کرنے اور ملک وقوم کو درپیش مسائل حل کرنے کے لئے کچھ ٹھوس تجاویز پیش کرنے کی اہلیت اور قابلیت بھی رکھتی ہیں۔ "خوف سے رہائی" ایک ایسی ہی کتاب ہے جس میں جہاں برما کی اس نڈر اور جاں باز رہنما کی نجی اور سیاسی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تفصیل ملتی ہے وہاں اس خاتون رہنما کی سیاسی اور معاشرتی بصیرت کا مطالعہ کرنے کا موقع بھی ملتا ہے۔

کتاب میں شامل دوسرے لوگوں کے مضامین میں آنگ سان سوچی کی نجی اور سیاسی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ان مضامین سے سوچی کی اس انتھک جدوجہد اور اس طویل جنگ پر روشنی پڑتی ہے جو وہ اپنے ملک سے فوجی آمریت کے خاتمے اور جمہوریت کے قیام کے لئے لڑ رہی ہے۔ اس کے انٹرویو بھی اس کے سیاسی خیالات اور سماجی شعور کی نشاندہی کرتے ہیں لیکن کتاب کا اصل اور وقیع حصہ وہ مضامین ہیں جو سوچی نے خود لکھے ہیں۔ ان مضامین سے سوچی کی سیاسی اور معاشرتی بصیرت کا پتہ چلتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف عملی جدوجہد کرنے والی لیڈر ہی نہیں ہے بلکہ اپنے عمل کو فلسفیانہ بنیاد فراہم کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔

سوچی کی بالغ نظری اور فکری بالیدگی کا اندازہ خاص طور سے اس وقت ہوتا ہے جب وہ ہندوستان میں قوم پرستی کے فروغ اور جنوبی ایشیا کی جدوجہد آزادی کا موازنہ برما کی تحریک
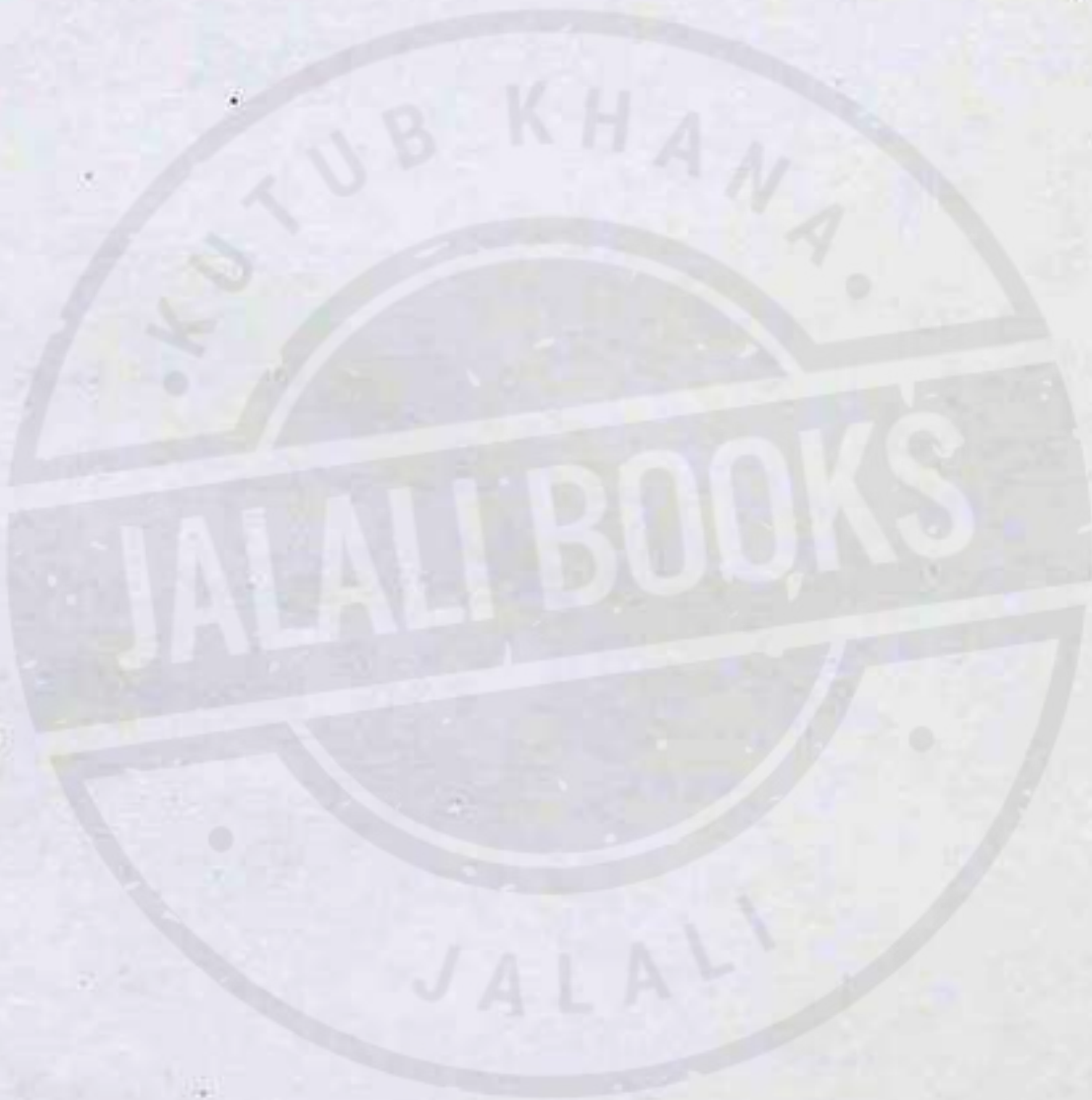
دیباچہ

واتسلاو ہاویل

آنگ سان سوچی کو امن کا نوبیل انعام مل گیا، بین الاقوامی طور پر بھی تسلیم کر لیا گیا کہ وہ جبر کے خلاف اور آزادی اور انسانی وقار کی سربلندی کے لئے جدوجہد کر رہی ہے۔ وہ اس انعام کی بہت مستحق تھی۔ اس نے اپنی بات صاف صاف اور پورے تسلسل سے کی ہے۔ اس نے خاموش ہو جانے کے لئے رشوت کے طور پر مستقل جلاوطنی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ نظر بندی کے دوران بھی اس نے صدق ایمان سربلند رکھا۔ وہ بے زور لوگوں کے زور کی غیر معمولی مثال بن گئی ہے۔ نوبیل انعام کے لئے اس کی نامزدگی میرے لئے اعزاز کا باعث ہے۔ میں ان سب کا ہم نوا ہوں جو انعام کے لئے اس کی نامزدگی کو سراہتے ہیں۔

آنگ سان سوچی کی برما میں انسانی حقوق اور جمہوریت کے لئے جدوجہد صرف اپنے ملک میں عدل و انصاف کے قیام تک محدود نہیں، بلکہ یہ دنیا بھر میں ان سب کی جدوجہد ہے جو اپنے مستقبل کا فیصلہ آپ کرنے کا حق مانگتے ہیں۔ جب تک اس دنیا میں آزادی کی جدوجہد جاری ہے اس وقت تک آنگ سان سوچی جیسی ہستیاں دوسروں کو میدان دغا میں اترنے کی ترغیب دیتی رہیں گی۔ آزادی کے لئے فریاد وسطی یورپ، روس، افریقہ یا ایشیا جہاں کہیں سے بھی بلند ہوتی ہے اس کا آہنگ اس کے معنی ایک ہی ہوں گے۔ سارے انسانوں کو وقار اور عزت دو۔ سارے انسانوں کو امیدیں دو۔

آنگ سان سوچی کو خاموش نہیں کیا جا سکتا۔ وہ سچ بولتی ہے اور اس کے الفاظ میں

برما اور پورے جہان کے تصورات جھلکتے ہیں۔ اس نے خود لکھا ہے ”برما والوں کے لئے یہ تعجب کی بات ہے کہ جو تصورات انسان کے ازلی وقار، اور ایک سے پیدائشی حقوق کو تسلیم کرتے ہیں، جو سمجھتے ہیں کہ ہر انسان کو عقل اور ضمیر کی دولت ارزاں ہوئی ہے اور جو بھائی چارے کے جذبے کے علمبردار ہیں، وہ تصورات برما کی مقامی اقدار کے خلاف کیسے ہو سکتے ہیں۔“

اس بہادر خاتون کو امن کا نوبیل انعام ملنا اس بات کی شہادت ہے کہ وہ ہم جیسے انصاف کے جویا انسانوں کی ترجمانی کر رہی ہے۔
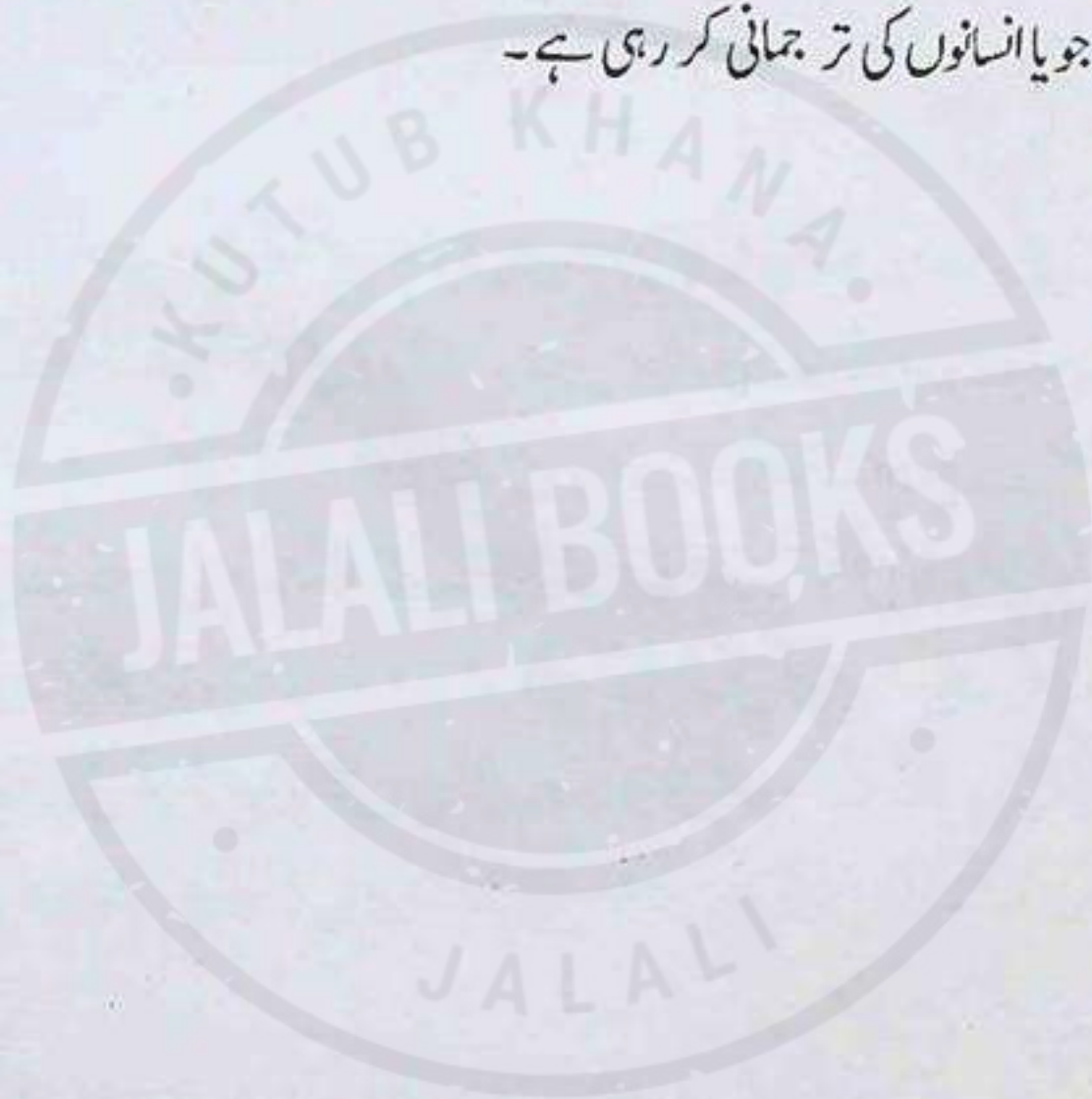
تعارف

مائیکل آرس

مارچ ۱۹۸۸ء کا آخری دن تھا، آکسفورڈ میں آج کی شام بھی دوسری شاموں کی طرح پرسکون ہی تھی۔ ہمارے بیٹے بستروں میں لیٹے پڑھ رہے تھے کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ سو نے ٹیلی فون اٹھایا اور پتہ چلا کہ اس کی ماں کو دل کا شدید دورہ پڑا ہے، ریسور رکھ کر سو نے فوراً ہی جانے کے لئے سامان پیک کرنا شروع کیا۔ مجھے دھڑکا لگا کہ اب ہماری زندگیاں ہمیشہ کے لئے بدل جائیں گی۔ اور دو دن بعد سو ہزاروں میل دور رنگون میں اپنی والدہ کی پٹی سے لگی بیٹھی تھی۔

سو کو ہسپتال میں مسلسل تین ماہ شب و روز تیمار داری کرنے کے بعد اندازہ ہوا اور ڈاکٹروں نے بھی بتایا کہ ماں کی حالت بہتر نہیں ہوگی، چنانچہ سو نے ماں کو اپنے رنگون والے گھر لانے کا فیصلہ کر لیا۔ گھر کے در و دیوار سے شناسائی اور میڈیکل ٹیم کی انتھک محنت کے سبب اتنا یقین ہو گیا کہ اس کے آخری دن پرسکون رہیں گے۔ جب ہمارے بیٹوں الیگزنڈر اور کم نے آکسفورڈ میں سمر ٹرم پوری کر لی تو ہم عازم رنگون ہو گئے۔ جہاں سو نے بڑے پیار اور محبت سے گھر کو امن و سکون کا جزیرہ بنا رکھا تھا۔ نچلی منزل میں سٹڈی والے کمرے کو ہسپتال کے وارڈ میں تبدیل کر دیا گیا تھا اور جب بزرگ خاتون کو اپنے نواسوں کے آنے کا علم ہوا تو وہ بے انتہا خوش ہوئیں۔

اگلے چند مہینوں میں طلبا نے گلیوں بازاروں میں احتجاج شروع کیا ان کا مطالبہ تھا کہ فوری طور پر انقلابی تبدیلیاں لائی جائیں۔ طلبا پر حکام شدید قسم کا تشدد کر چکے تھے۔ ریاستی

ذہن میں باپ کا بس ایک ہیولہ سا تھا۔ تاہم اس نے باپ کے بارے میں جو کچھ سنا اور معلوم کیا اس باعث اسے یقین ہو گیا کہ اس کا باپ بے غرضی اور جرات کا پیکر تھا اور برما کو آزاد اور جمہوری ملک بنانا چاہتا تھا۔ بعض لوگ کہتے کہ سو نے اپنے والد کو نہ دیکھا نہ جانا مگر اس کا ہیولا اس کے خیالوں پر چھا گیا ہے۔ سو نے آکسفورڈ میں اپنے قیام کے دوران اپنے باپ پر انگریزی اور برمی میں لکھی گئی کتابیں اور مضامین بڑی دلجمعی کے ساتھ اکٹھے کئے۔ سو جس طور سے عوام کی امیدوں اور تمناؤں کا مقبول مجسمہ بلکہ اوتار بن گئی ہے اس سے یہ حتمی نتیجہ تو نکلتا ہے کہ باپ بیٹی میں ایک گہری مماثلت ہے۔ ان کے اقوال و افعال اور ان کے بارے میں حقیقت اور افسانے میں غیر معمولی مطابقت پائی جاتی ہے۔ تاہم ۱۹۸۸ء سے قبل اس کا خیال نہیں تھا کہ وہ اتنے بڑے کام کے لئے جدوجہد کرے گی۔ جب وہ ماں کی تیمارداری کے لئے آکسفورڈ سے رنگون آئی تھی اس وقت وہ برما کے ادب پر لندن یونیورسٹی کے لئے ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھنے کی تیاری کر رہی تھی (اس وقت جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں اس مقالے کا خاکہ کمپیوٹر کی ڈسک پر موجود ہے میرا خیال ہے کہ وہ اس مقالے کے سلسلے میں بطور طالب علم اس کا اندراج سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز میں موجود ہے) اس کی یہ خواہش بھی تھی کہ وہ ایک دن برما کے طالب علموں کے لئے وظائف کی سکیم رائج کرے گی اور برما میں لائبریریوں کا جال پھیلا دے گی۔

بہر طور وہ ایک بات ہمیشہ مجھ سے کہا کرتی تھی کہ اس کے عوام کو کبھی بھی اس کی ضرورت پڑی تو وہ ان کو مایوس نہیں کرے گی۔ ہماری شادی یکم فروری ۱۹۷۲ء کو لندن میں ہوئی تھی اس سے آٹھ ماہ پہلے کی مدت میں جب میں بھوٹان میں تھا اور وہ نیویارک میں، تب اس نے مجھے ۱۸۷ خط لکھے تھے پچھلے دنوں میں نے دوبارہ ان خطوں پر نظر ڈالی۔ ان خطوں میں اس نے بار بار اس بات پر پریشانی ظاہر کی تھی کہ کہیں اس کی اور میری شادی کا اس کے اپنے خاندان اور برما کے عوام میں یہ مطلب نہ لے لیا جائے کہ اس طرح سو کی ان سے وابستگی کم ہو گئی ہے اس نے مجھے ان خطوں میں بتایا کہ ایک نہ ایک دن اسے برما واپس جانا ہے اور اس وقت اسے میری مدد کی ضرورت ہو گی۔ وہ اپنے خطوں میں اس مدد کو اپنا حق نہیں جتلاتی بلکہ میری ایک مہربانی ایک عنایت شمار کرتی ہے۔

"میرا صرف ایک سوال ہے کہ اگر میرے لوگوں کو میری ضرورت پڑی

تو تم اس وقت میری مدد کرو گے تاکہ میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو سکوں۔"

"اگر کبھی کوئی ایسی صورت پیدا ہو گئی تو زیادہ برا تو نہیں مانو گے؟ میں نہیں جانتی کہ یہ مرحلہ کب آئے گا لیکن بہرطور یہ مقام آسکتا ہے۔"

"بعض اوقات مجھے یہ خوف پریشان کر دیتا ہے کہ شائد حالات اور قومی مفادات ہمیں عین اس وقت الگ الگ کر دیں جب ہم دونوں بہت ہی شاداں و فرحاں ہوں اور اس وقت یہ علیحدگی ایک عذاب بن جائے. مگر یہ خوف سراسر بے معنی لگتے ہیں کیونکہ اگر ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اور جب تک یہ محبت اور چاہت ہے اس وقت تک مجھے یقین ہے کہ آخر کار محبت اور دلداری ہی فتح یاب ہو گی۔"

سو نے اپنے خطوں میں یہ لفظ اور اسی طرح اور کئی لفظ بیس برس بیشتر لکھے تھے۔ آج وہ اپنے ہی ملک میں ساری دنیا سے کٹ کٹا کر ضمیر کی قیدی بنی ہوئی ہے اور اس قید، اس صورت حال کے بیج تو بہت عرصہ پہلے بوئے جا چکے تھے۔

چنانچہ جب سو نے مجھے بتایا کہ وہ میدان میں کودنا چاہتی ہے تو میرے لئے یہ کوئی حیرت والی بات نہیں تھی۔ میں نے برسوں پہلے اس سے جو وعدہ کیا تھا کہ میں جدوجہد کے دوران اس کی مدد کروں گا اسے تو پورا کرنا ہے۔ البتہ میں نے یہ ضرور سوچا تھا کہ اگر ایسا موقع آیا بھی تو اس وقت آئے گا جب ہمارے بچے بڑے ہو چکے ہوں گے۔ لیکن لگتا ہے کہ مقدر اور تاریخ کسی خاص نظم و ضبط کے پابند نہیں ہوتے۔ وقت کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی وقت آپ کی سہولتوں کو ملحوظ رکھتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ انسانی تاریخ کے قوانین اتنے غیر یقینی ہیں کہ ان پر کسی فعل و عمل کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ سو کا تمام تر انحصار اس پر تھا کہ ایک تو اس میں عہد نبھانے کی قوت کمال کی ہے اور دوسرے دلائل و براہان میں اسے ملکہ حاصل ہے۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ ایک قومی ہیرو کی بیٹی کی نادر اور بے مثال حیثیت بھی اسے حاصل تھی یوں کہ اس کے سر پر ایک سایہ بھی تھا اور ایک بار بوجھ بھی۔ ہرچند حکومت نے اس کے والد کی شہرت اور نیک نامی کو اپنے مقاصد کے لئے

بھی استعمال کیا لیکن لوگوں کے دلوں میں اس کی ایسی حقیقی عزت اور محبت موجود ہے جسے مٹایا نہیں جا سکتا۔ یہ بات بھی ہے کہ اتنا عرصہ ملک سے دور رہنے کے باوجود سو اپنی برمی شناخت اور انداز کو نہیں بھولی۔ برمی وراثت کا بھرپور علم، برمی زبان بولنے میں حیران کن روانی، اور سب سے اہم یہ کہ انگریز سے شادی کرنے کے باوجود برمی شہریت اور پاسپورٹ ترک کرنے سے انکار۔ اس کی والدہ کی آخری بیماری کے باعث پیدا شدہ حالات میں انہی اوصاف کے سبب سوؤ کا میدان میں کودنا ناگزیر ہو گیا تھا۔

۲۳ رجولائی ۱۹۸۸ء کو نی ون کے مستعفی ہونے اور اس کے ساتھ ہی اس کی پارٹی کی کانگرس کی طرف سے برما کے سیاسی مستقبل کے بارے میں ریفرنڈم سے انکار کے باعث ملک میں ہیجان پیدا ہوا اور فوراً ہی سو کی رہائش گاہ ملک میں سیاسی سرگرمیوں کا بڑا مرکز بن گئی۔ جہاں کرفیو کھلنے کے اوقات میں لوگوں کی مسلسل آمدورفت جاری رہتی۔ زندگی کے ہر شعبہ اور عمر کے اعتبار سے ہر پود کا کارکن اس گھر پر حاضر ہوتا۔ سو ان سے عموماً انسانی حقوق کے بارے میں بات کرتی حالانکہ برما میں اس وقت انسانی حقوق کی اصطلاح کا کوئی خاص مفہوم نہیں بنتا تھا۔ پھر اس نے گھر سے نکل کر سیاسی گرداب بلا میں حصہ لینا شروع کر دیا جب پہلی بار اس نے ۲۶ راگست کو شویڈاگان میں ایک بہت بڑے ہجوم سے خطاب کیا تو الیگزینڈر کم اور میں اس کے ساتھ تھے۔

اس کے گھر میں بڑی پر جوش سرگرمیاں جاری تھیں مگر اس کے باوجود یہ گھر مرجع محبت بنا۔ اور اس کی یہ حیثیت ایک لحظہ کے لئے بھی متاثر نہیں ہوئی۔ سو میرے خیال میں ایک انتہائی غیر معمولی شخصیت ہے اور مجھے یہ بات کرنے کا حق بھی ہے کیونکہ ہماری شادی کو بیس سال ہو چکے ہیں تاہم یہ بات میں کبھی نہ سمجھ پاؤں گا کہ وہ کس طور ایک سا وقت اور توجہ ایک طرف اپنی مرگ بلب ماں کو دیتی دوسری طرف ان تمام سرگرمیوں پر صرف کرتی جس نے اسے ملک میں انسانی حقوق اور جمہوریت کے لئے جاری جدوجہد کا سربراہ بنا دیا تھا۔ یہ توازن دراصل غلط اور صحیح میں بے داغ فیصلہ کرنے کی صلاحیت اور وقوف اور دوسری طرف اٹوٹ فرض شناسی سے پیدا ہوتا ہے حالانکہ یہ دونوں باتیں بعض لوگوں پر ناقابل برداشت بوجھ بن جاتی ہیں مگر وہ یہ دونوں کام ہمیشہ انتہائی خوش اسلوبی اور وقار کے ساتھ کرتی آئی ہے۔

مقصد حاصل کرنا چاہتی تھی سو کا بڑھتا ہوا وقار اور مقبولیت ہی اس مقصد کے لئے خطرہ بن گئے تھے۔ اس واقعہ سے پہلے اور بعد میں سو نے مذاکرات اور مفاہمت کے لئے جس قدر اپیلیں کیں وہ سب ان سنی کر دی گئیں۔

اگلے سات ماہ میں سو نے پورے ملک کا دورہ کر کے اپنی پارٹی کو مضبوط کیا۔ میں اور بچے اس وقت واپس آکسفورڈ آچکے تھے۔ سو کو جب بھی موقع ملتا وہ ہمیں اپنا حال احوال لکھتی رہتی مگر ہمیں اس کے خطوں کی بجائے اخبارات کی خبروں پر انحصار کرنا پڑ رہا تھا۔ حکمران اس کو جس طور پر ہراساں کرتے یا اس پر کیچڑ اچھالتے ہمیں اس کا علم اخباروں سے ہوتا مگر عوام میں اس مہم کا اثر بالکل الٹا ہوتا، سو عوام میں اور زیادہ مقبول ہوتی جاتی۔ اس پر جس قدر یلغار ہوتی لوگ جوق در جوق اس کے جھنڈے تلے جمع ہوتے چلے جاتے۔

اب اگر پیچھے کی طرف نگاہ ڈالیں تو یہ اندازہ کرنا آسان لگتا ہے کہ پرانے نظام سے وابستہ مفاد والوں کو سو کی پارٹی کیوں سب سے بڑا خطرہ نظر آتی تھی۔ حکمران کا تکیہ اس بات پر تھا کہ نئی نئی پارٹیاں بنیں گی۔ پارلیمنٹ میں چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں ہوں گی جنہیں وہ جس طرح بھی چاہیں گے قابو میں لے آئیں گے۔ چنانچہ اس وقت کے سربراہ مملکت جنرل سامونگ نے سرعام یہ توقع ظاہر کی تھی کہ آئندہ حکومت دراصل کئی پارٹیوں کی مخلوط حکومت ہو گی۔ مگر ان ساری توقعات اور امیدوں کے برعکس ایک ہی پارٹی جھاڑو پھیر گئی۔

میں بتانے کی کوشش نہیں کروں گا کہ اس زمانے میں سو کی پالیسیاں، تحریکیں اور سرگرمیاں کیا تھیں۔ میں اس زمانے میں اس کے ساتھ نہیں تھا اس لئے چشم دید واقعات اور گذرے حالات کے بارے میں پورے یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ کام مستقبل کے مورخ کا ہے جسے وقت گزرنے اور نئی معلومات کے سامنے آنے کے بعد معروضی طور پر اس عہد کا تجزیہ کرنے کا بہتر وقوف ہو گا۔ تاہم میرے خیال میں وہ بھی یہی کہنے پر مجبور ہوں گے کہ سو نے اپنے آپ کو ایک اعلیٰ نصب العین کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ سو نے ایک ابھرتی ہوئی بے سمت اور بے قیادت بغاوت کو بروقت عظیم اتحاد میں تبدیل کر دیا۔ اس نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ یہ پرامن جدوجہد ہے جس کا بنیادی نصب العین انسانی حقوق کا

حصول ہے۔ اس نے اپنے ملک کے عوام سے اس انداز میں بات کی کہ جس انداز میں انہوں نے عرصہ سے بات سنی ہی نہ تھی۔ سو کی باتوں میں محبت اور احترام ہوتا۔ سول نافرمانی کی طویل مہم کے دوران اس نے حکمرانوں کے جاری کردہ کتنے ہی کالے قوانین توڑے۔ اس نے حکمرانوں کو ان کی زیادتیوں پر کئی خط لکھے مگر انہوں نے کسی کا جواب تک نہیں دیا اس کے ساتھ ساتھ وہ ان سے یہ گذارش بھی کرتی رہی کہ حکمرانوں کو مذاکرات کرنے چاہئیں مگر یہ سب کارلا حاصل رہا۔

جولائی ۱۹۸۹ء میں حالات ایک نئے موڑ پر آگئے۔ ۱۹ر جولائی کو اس کے والد اور اس کی کابینہ کی "شہادت" کا سالانہ دن منانے کی ریت چلی آرہی ہے چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ باقی دنوں میں وہ اس سب سے بڑی رکاوٹ کی نشان دہی کرے گی جو سیاسی تبدیلی میں آڑے آرہی ہے۔ لوگ یہ بات مانتے تو تھے کہ اب بھی ریٹائرڈ جنرل نی ون ہی فوج کو کنٹرول کرتا ہے مگر یہ بات سرعام نہیں کی جاتی تھی سو نے یہ بات علی الاعلان کہنا شروع کر دی۔ اس نے یہ شبہ بھی ظاہر کرنا شروع کر دیا کہ فوجی ٹولہ اقتدار منتقل ہی نہیں کرنا چاہتا۔ جب اس نے شہداء کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ایک جلوس نکالنے کا اعلان کیا تو حکمرانوں نے فوراً فوج کوچہ و بازار میں بھیج دی۔ سو نے محسوس کیا کہ بڑا خون خرابہ ہو گا چنانچہ جلوس کی تجویز ترک کر دی۔

ہمارے بیٹے الیگزینڈر اور کم آکسفورڈ سے پھر ماں کے پاس پہنچ چکے تھے، جب سے یہ سارا ڈرامہ شروع ہوا تھا اس وقت سے یہ ان کا تیسرا پھیرا تھا۔ میرے والد کا کچھ عرصہ پہلے سکاٹ لینڈ میں انتقال ہو گیا تھا اس لئے میں ان کے ساتھ نہیں آسکا تھا۔ ۲۰ر جولائی کو میں نے خبر سنی کہ سو کو گھر میں قید کر دیا گیا ہے۔ مجھے اس وقت کچھ اندازہ نہیں تھا کہ سو اور ہمارے بیٹے کن حالات میں ہیں۔ خوش قسمتی سے میرے پاس برما کا ویزا موجود تھا اور میں نے حکام کو بتایا کہ میں سیدھا رنگون آنا چاہتا ہوں۔

جونہی منگلاڈان اڈے پر جہاز رکا مجھے ٹارمک پر فوجی نقل و حرکت کا اندازہ ہو گیا۔ سپاہیوں نے جہاز کو گھیر لیا اور جیسے ہی میں سیڑھی سے نیچے آیا، مجھے پہچان لیا گیا اور مجھے وی آئی پی لاؤنج کی طرف لایا گیا۔ برطانوی سفارت خانے کا نمائندہ مجھے ملنے آیا تھا مگر وہ بھی مجھ سے رابطہ نہ کر سکا۔ تقریباً بائیس دن تک مجھے مکمل طور پر لوگوں کی نظروں سے غائب

رکھا گیا۔ کسی کو کچھ خبر نہ تھی کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔ برطانوی اخباروں نے خبریں چھاپیں کہ کس طرح آکسفورڈ کے ایک استاد کو غائب کر دیا گیا ہے۔ انگلستان میں میرے عزیز واقارب سخت پریشان تھے۔ حکومت برطانیہ اور یورپین کمیونٹی نے سفارتی سطح پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر سب بے سود............ میں لاپتہ ہو چکا تھا۔

ہمارے خاندان کے لئے غالباً یہ سب سے پہلا بڑا بحران تھا۔ بہرطور ان تین ہفتوں کے دوران کیا کیا کچھ ہوا یہ کہانی ایک پوری کتاب کی متقاضی ہے تاہم میں مختصراً عرض کروں گا۔ ایرپورٹ پر جو خوش اخلاق فوجی افسر مجھے ملا اس نے کہا کہ جن شرائط کے تحت سو کو گھر میں قید کیا گیا ہے اگر میں بھی انہیں تسلیم کر لیتا ہوں تو میں سو اور بچوں کے ساتھ رہ سکتا ہوں۔ شرط یہ بھی تھی کہ نہ میں کسی سفارت خانے سے کوئی رابطہ کروں گا نہ کسی ایسے شخص سے مل سکوں گا جو سیاست کے میدان میں ہے۔ میں نے کمال سچائی سے کہا کہ میں تو صرف اپنے بیوی بچوں کے پاس رہنے کے لئے آیا ہوں۔ مجھے شرط ماننے میں کوئی عذر نہیں۔ ہم ایرپورٹ سے چلے اور فوجیوں میں گھرے ہوئے گھر تک پہنچ گئے۔ دروازے کھولے گئے ہم گاڑی میں ہی اندر چلے گئے۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ اب کیا منظر دیکھنا پڑے گا۔

یہاں پہنچا تو دیکھا کہ سو نے تین دن سے بھوک ہڑتال کر رکھی ہے۔ اس کا واحد مطالبہ تھا کہ جب حکام نے اسے اس کے صحن سے گرفتار کیا اسی وقت وہاں پر موجود اس کے نوجوان حامیوں کو بھی فوجی پکڑ کر لے گئے تھے۔ اب اسے بھی جیل میں ان قیدیوں کے پاس جانے دیا جائے۔ سو کا خیال تھا کہ جیل میں ان نوجوانوں کے ساتھ اس کی موجودگی کے باعث زیادہ سختی نہیں ہوگی۔ اس نے ۲۰ر جولائی کی رات کو آخری بار کھانا کھایا تھا۔ اسی روز اسے گرفتار کیا گیا، اگلے بارہ دن اس نے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ بارہویں دن یکم اگست کو دوپہر کے وقت اس نے صرف پانی کا ایک گلاس پیا۔ اسی روز ایک فوجی افسر حکمرانوں کی طرف سے اسے یہ یقین دہانی کرانے آیا کہ نوجوان قیدیوں پر تشدد بھی نہیں کیا جائے گا اور مقدمات بھی عام قانون کے تحت چلائے جائیں گے۔ سو نے یہ بات مان لی اور ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے اسے فوراً انٹراوینس ٹیکہ لگایا۔ سو نے گزشتہ بارہ دنوں میں اس ڈاکٹر کی کوئی بھی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا اس وقت تک سو کا وزن بارہ پاؤنڈ کم ہو چکا تھا۔ ہاں مجھے

آج بھی یہ معلوم نہیں کہ کیا حکام نے اپنا وعدہ پورا بھی کیا تھا کہ نہیں؟

ان حالات میں بھی سو بڑی پر سکون رہی اور بچے بھی۔ اس نے بھوک ہڑتال کے دنوں میں آرام ہی کیا کچھ پڑھا اور ہمارے ساتھ باتیں کیں۔ ہرچند میں نے دکھاوا دیا کہ میں بھی پر سکون ہوں مگر ایسا ہرگز نہیں تھا۔ میں حکام اور سو کے درمیان رابطہ تھا۔ اس حیثیت میں مجھے رنگون کے سٹی ہال میں کیمروں کے سامنے لایا گیا تاکہ میں رنگون کمانڈ کے کمانڈر اور بے شمار افسروں کے علاوہ فوجی کونسل کی قیادت کے سامنے سو کے مطالبات پیش کروں۔ مجھ سے ہمیشہ مروت برتی گئی۔ سو کے ہڑتال ختم کرنے کے گیارہ دن بعد مجھے آخر کار برطانوی قونصل سے ملانے کے لئے ایک فوجی گیسٹ ہاؤس میں لے جایا گیا۔ فوجی کونسل کے حکام کی موجودگی میں میں نے سو کی بھوک ہڑتال کی تصدیق کی۔ بھوک ہڑتال کی خبر کسی نہ کسی طرح باہر پھیل گئی تھی۔ بعد میں مجھے علم ہوا کہ یہ خبر ٹائم میگزین کے ایشیا پیسفک ایڈیشن میں شائع ہو چکی تھی اس کے سرورق پر سو کی تصویر بھی چھپی تھی۔

آنے والے دنوں میں سو کا وزن اور توانائی بحال ہو گئی۔ بحران گزر چکا تھا اور ہیجان بھی کم ہو گیا تھا۔ بچوں نے سپاہیوں سے مارشل آرٹس سیکھ لئے۔ ہم نے گھر کو ٹھیک ٹھاک کیا۔ میں نے حکام سے یہ انتظامات کئے کہ سو کے لئے پارسل انگلینڈ سے بھیجے جائیں اور خط و کتابت بھی وہیں سے کی جائے۔ جب آکسفورڈ میں دوبارہ پڑھائی شروع ہونے والی تھی تو ہمارے گھر میں حالات معمول پر آ چکے تھے۔ چنانچہ ہم ۲ر ستمبر کو انگلینڈ روانہ ہو گئے۔

بچوں کو ماں سے ملنے کا یہ آخری موقع دیا گیا۔ انگلینڈ پہنچنے کے کچھ دن بعد ہی برمی سفارت خانے کی طرف سے ہمیں اطلاع دی گئی کہ بچوں کے برمی پاسپورٹ منسوخ کئے جاتے ہیں کیونکہ وہ برما کی شہریت حاصل کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ چنانچہ ان کے برطانوی پاسپورٹ بنائے گئے ان پر برما کا ویزا حاصل کرنے کی ہر کوشش ناکام ہوئی۔ ظاہر ہے کہ کوشش یہ کی گئی کہ سو کو بچوں سے علیحدہ کر کے مجبور کر دیا جائے کہ وہ مستقبل جلاوطنی کو قبول کر لے۔ مجھے بھی آنے والی کرسمس سے پہلے پندرہ دن کے لئے سو کے ساتھ قیام کرنے کی اجازت دی گئی۔ حکام کو یہ امید تھی کہ اس طرح شائد میں سو کو اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو جاؤں۔ چونکہ میں سو کے مستحکم ارادوں کو بخوبی جانتا ہوں اس لئے

سوچ بھی نہیں سکتا کہ میں اس کے عزم کو تبدیل کر سکوں گا۔ غالباً. اس لمحے انہوں نے محسوس کیا کہ میں ان کی مقصد بر آری نہیں کر سکتا۔

ان آخری ملاقاتوں میں ہم نے جو لمحے تنہائیوں میں ساتھ ساتھ گزارے وہ ہماری شادی کے کئی سالوں میں گزارے گئے لمحوں میں سے سب سے خوبصورت اور ناقابل فراموش ہیں۔ ان دنوں ہر طرف سکون ہی سکون تھا۔ سو نے ایک ضابطہ بنا رکھا تھا مطالعے اور پیانو بجانے میں اس نظم کو کبھی کبھی توڑ دیتا تھا۔ سو ان دنوں بدھ مت کے سوتر حفظ کر رہی تھی۔ میں ہر روز کرسمس کے لئے تحائف تیار کر رہا تھا اور کئی دن تک یہ کام کرتا رہا ہمیں دنیا جہان کے موضوعات پر بات چیت کرنے کے لئے ڈھیروں وقت دستیاب تھا۔ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ مستقبل کے حوالے سے یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔

ابھی میں وہیں تھا جب حکام سو کے پاس اپنی پارٹی کی طرف سے انتخابات کے بارے میں کاغذات لے کر آئے تاکہ اگر وہ قید میں رہتے ہوئے بھی الیکشن لڑنا چاہتی ہے تو ان کاغذات پر دستخط کر دے۔ سو نے دستخط کر دیئے۔ کئی ہفتوں بعد یہ بات سننے میں آئی کہ حکومت نے سازش کے تحت اس کے کاغذات نامزدگی مسترد کر دیئے مگر آخر کار اس سے بھی انتخابات کے نتائج پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ برما کے لوگوں نے ۲۷ مئی ۱۹۹۱ء کو ووٹ ڈالے اور اس پارٹی کے حق میں جو سو نے بنائی اور جس کی راہ نمائی کی تھی۔ نیشنل لیگ فار ڈیموکریسی کو بے مثال کامیابی حاصل ہوئی اس نے ۴۸۵ نشستوں پر امیدوار کھڑے کئے اور ان میں ۳۹۲ نشستیں جیت لیں گویا اسے اسی فیصد کامیابی نصیب ہوئی۔ حکمران ٹولے نے اس خیال سے الیکشن منعقد کرانے کی اجازت دے دی تھی کہ کوئی بھی پارٹی اکثریت حاصل نہیں کر سکے گی، متعدد پارٹیاں تھوڑی تھوڑی نشستیں جیت کر آئیں گی۔ لیکن سو کو یقین کامل تھا کہ اگر انتخابات منصفانہ ہوئے تو اس کی پارٹی اکثریت حاصل کر لے گی۔ تاہم میرا نہیں خیال کہ سو کو بھی اس قدر اکثریت حاصل ہو جانے کا اندازہ تھا۔ اب کے بار پھر اس کی تصویر ٹائم میگزین کے سرورق پر چھپی۔ یہ تصویر غالباً. ان دنوں کھینچی گئی تھی جب وہ ملک بھر کے دورے پر نکلی ہوئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں اور گرد اور دھول کے باعث اس کی آنکھیں خراب تھیں۔

یہ ووٹ ذاتی طور پر سو کو دیا گیا تھا کیونکہ اکثر ووٹروں کو تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ ان

ہیں جب اس نے سیاست کے میدان میں پہلا قدم اٹھایا یہ دستاویزات اس وقت تک کی ہیں جب اسے گھر میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ قاری کو ان تحریروں سے سو کے اراوتی ڈیلٹا کے جنوب سے کاچین سٹیٹ کے شمالی علاقوں تک کچھ دوروں کا اندازہ ہوتا ہے مگر اس نے سارے ملک میں اور بہت سے علاقوں کے دورے بھی کیے ہیں۔ یہ خیال رہے کہ ان سولہ دستاویزات میں جو کچھ ریکارڈ کیا گیا ہے وہ اصل بولے گئے یا لکھے گئے الفاظ کا عشر عشیر بھی نہیں۔ اس کے علاوہ اس کا جو کچھ ریکارڈ ہے وہ فی الحال ہماری پہنچ سے باہر ہے تاہم اس کی وہ آواز جسے ایک عرصہ سے خاموش کر دیا گیا ہے اس مختصر سے انتخاب میں سنی جا سکتی ہے۔

تیسرے حصے میں میں نے سو کے بارے میں دوسروں کی تحریریں شامل کی ہیں۔ ان میں سے دو تو سو کے اس زمانے کے بارے میں بڑی ذاتی سی یادداشتیں ہیں جب وہ جون تبدیل کر رہی تھی، یا یوں کہئے کہ ایک سنڈی سے تتلی بننے والی تھی۔ دوسرے مضامین میں اس کے بعد کے رول کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ لامحالہ ان مضامین میں کچھ تکرار اور پھر بازگشت بھی ہے لیکن مجھے امید ہے کہ یہ تکرار بھی سو کی تصویر کو اجاگر کرنے میں مددگار ثابت ہوگی۔ میں نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ لکھنے والوں کی تحریروں کو جوں کا توں ہی رکھا جائے تاہم کتاب کے مرتب کی حیثیت سے بعض حقائق اور اسلوب میں مطابقت پیدا کرنے کے لئے تبدیلی کی ہے۔ سو کے بارے میں جن جن واقعات اور آرا کا اظہار کیا گیا ہے میں ان کے مستند ہونے کی ذمہ داری نہیں لے سکتا کیونکہ جب یہ واقعات ہوئے میں موقع پر موجود نہیں تھا۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ ہر مضمون نگار نے پوری کوشش کی ہے کہ سچی بات ہی تحریر کی جائے۔

ستمبر ۱۹۹۱ء

یہ مسودہ پبلشر کے پاس بھیجے صرف سترہ دن ہوئے تھے کہ مجھے ناروے کی نوبیل پرائز کمیٹی نے ٹیلی فون پر بتایا کہ سو کو نوبیل انعام دیا جا رہا ہے۔ مندرجہ ذیل سطور میرے اس بیان کا حصہ تھیں جو میں نے دنیا بھر کے اخبارات کی طرف سے تنقید و اعتراض کو روکنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے جاری کیا تھا۔

"آج مجھے بتایا گیا ہے کہ میری عزیز بیوی سو کو امن کے نوبیل انعام سے نوازا گیا

ہے۔ بہت سوں کو پہلی بار یہ پتہ چلے گا کہ اس نے کس بہادری سے اپنے ملک میں بنیادی حقوق کی بحالی کے لئے عدم تشدد پر مبنی جدوجہد کی۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے کردار سے آج کی دنیا میں بہت سے اور لوگ حوصلہ اور تحریک پائیں گے۔

اس لمحے میں اور ہمارے بچے جس قدر فخر اور خوشی کے جذبات رکھتے ہیں بالکل ویسے ہی ہماری مایوسی اور مستقبل کے خدشات کے سائے بھی ہم پر پڑ رہے ہیں۔ مجھے خبر نہیں کہ انعام کمیٹی نے پہلے بھی کسی ایسے شخص کو انعام دیا ہے جو انتہا درجے کی تنہائی اور عقوبت میں مبتلا ہو۔ تاہم یقیناً یہ انعام ایسے حالات میں گرفتار کسی خاتون کو آج تک نہیں دیا گیا۔ برما کے فوجی حکمرانوں کے ہاتھوں سو گذشتہ کئی برس سے قید تنہائی میں ہے۔ ہمیں یعنی اس کے خاندان کو اس سے کسی بھی طور رابطہ کرنے کی اجازت نہیں، نہ ہی ہمیں اس کے حالات کا کوئی علم ہے ماسوائے اس بات کے کہ وہ بہت تنہا ہے۔ ہمیں تو یہ بھی علم نہیں کہ اسے ابھی تک اس کے گھر میں نظر بند کیا گیا ہے یا کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا ہے۔

لگتا ہے کہ برما کے حکمرانوں نے سو کو کئی بار یہ پیشکش کی ہے کہ اگر وہ ہمیشہ کے لئے ترک وطن کر جائے تو وہ اسے رہا کرنے کے لئے تیار ہیں۔ مگر میں سو کو جانتا ہوں وہ ایسا ہرگز نہیں کرے گی۔ وہ اپنے ایمان کی پکی ہے اور اس کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے تیار ہے۔ چنانچہ میرا خیال ہے کہ وہ اوسلو میں دسمبر کے مہینے میں اپنا انعام صرف اسی وقت خود وصول کرنے کے لئے آسکے گی جب برما کے حکمرانوں سے یہ ضمانت مل جائے گی کہ وہ اس کی برما واپسی میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالیں گے۔ بے شک اس کے بعد اسے پھر قید تنہائی میں ڈال دیا جائے۔

یہ میری دعا بھی ہے اور توقع بھی کہ امن انعام سو کے ہمیشہ کے اس مطالبے کی تکمیل کا وسیلہ بن سکتا ہے کہ ملک میں دیرپا امن کے قیام کے لئے مذاکرات شروع کیے جائیں۔ میں ایک طرح سے خود غرضانہ انداز میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ سو کے جسم و جاں کی بہادری کا جس بلند مقام پر اعتراف کیا گیا ہے اس کے نتیجے میں ہمارے خاندانی معاملات میں بھی آسانی پیدا ہو گی اور ہمیں شائد اس سے ملنے کی آخر کار اجازت مل جائے گی۔ ہمیں اس کی غیر موجودگی کا شدید قلق ہے۔

۱۴ر اکتوبر ۱۹۹۱ء

پہلا حصہ
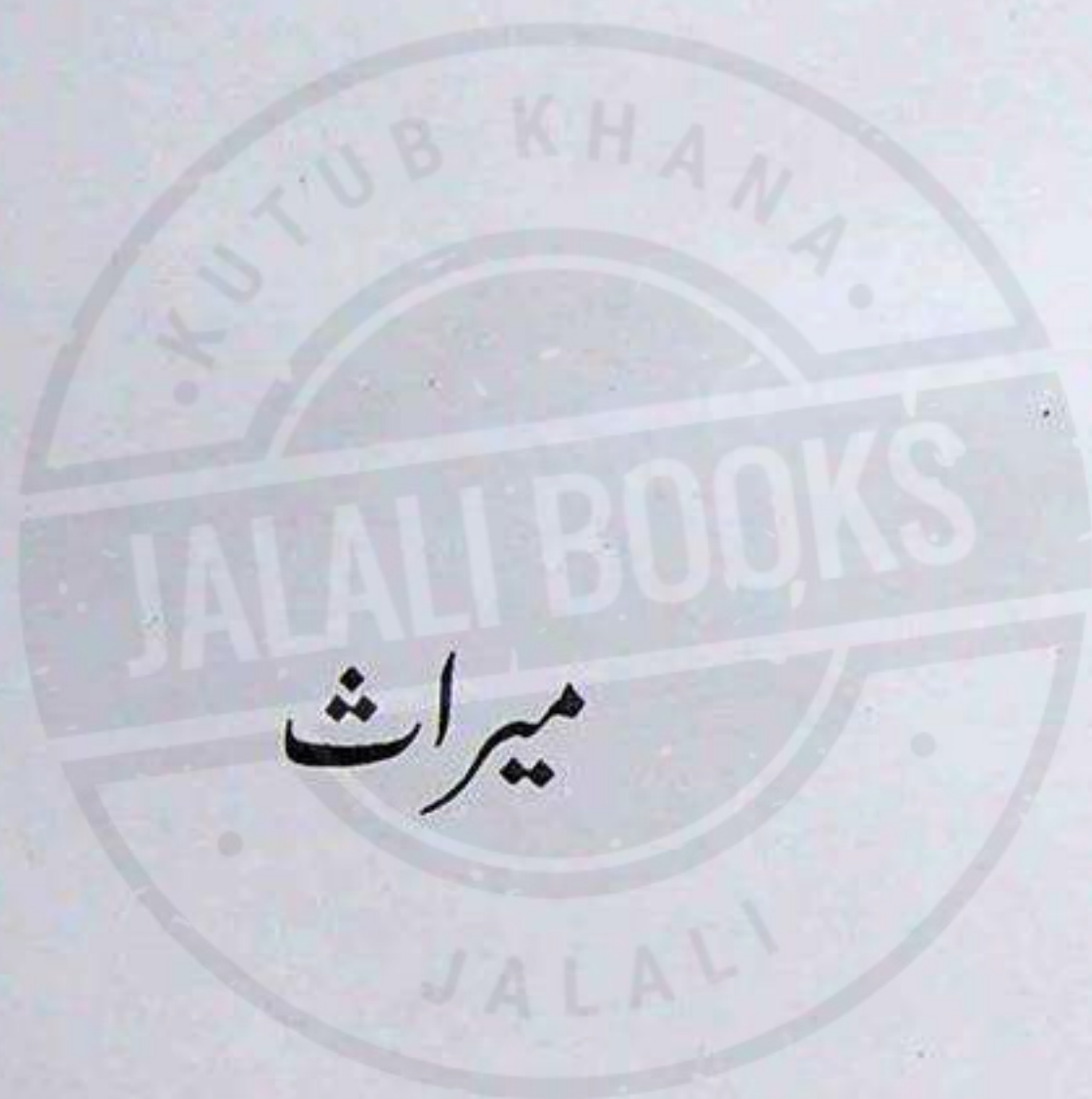
میراث

میرے والد

یہ مضمون پہلی بار ۱۹۸۴ء میں یونیورسٹی آف کوئنز لینڈ پریس کی طرف سے شائع کردہ سلسلہ کتب راہنمایان ایشیا کی ذیل میں شائع ہوا تھا اس کا عنوان آنگ سان تھا۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۱ء میں ایڈنبرا کے پبلشر کیسکا ڈیل پبلیکیشنز Kiscadale Publications نے روجر میتھیوز کے تعارف کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس کا عنوان تھا "برما کا آنگ سان ____ بیٹی کا لکھا سوانحی خاکہ ____ پہلا پیرا ان ایڈیشنوں کا دیباچہ تھا جو اکتوبر ۱۹۸۲ء میں آکسفورڈ میں لکھا گیا تھا۔

"میں اتنی چھوٹی تھی کہ مجھے اپنے والد کی وفات تک یاد نہیں۔ وہ کس قسم کے انسان تھے یہ جاننے کے لئے میں نے ان کی زندگی کے بارے میں مواد پڑھنا اور اکٹھا کرنا شروع کیا۔ یہ مواد جو میں پیش کر رہی ہوں چھپے ہوئے مواد پر مبنی ہے۔ صرف دو ذاتی معاملات میں میں نے اپنے خاندان کی روایت اور ان لوگوں کے بیان پر انحصار کیا جو میرے والد کو قریب سے جانتے تھے۔ اپنے ایک بہت ہی قریبی عزیز کے بارے میں لکھنا بہت ہی مشکل کام ہے اور مصنف پر اس قسم کے الزامات لگنے کا خدشہ موجود رہتا ہے کہ اس نے تحریر میں معروضیت سے کام نہیں لیا۔ سوانح نگار در حقیقت حالات و واقعات اور موجودہ مواد کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں اور کچھ دخل ان کی وقت نظر کا ہوتا ہے انہی بنیادوں پر وہ اپنی رائے یا فیصلے دیتے ہیں۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں صرف یہ کہہ سکتی ہوں کہ جس طور میں اپنے والد کو دیکھتی ہوں اس کی ایک دیانتدارانہ تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

آنگ سان ۱۳ر فروری ۱۹۱۵ء کو وسطی برما کے خشک آب و ہوا والے علاقے کے چھوٹے سے قصبہ نٹموک میں پیدا ہوئے۔ انگریزوں اور برمیوں کی تیسری جنگ اور مانڈلے میں بادشاہت کو ختم ہوئے تیس برس ہو چکے تھے اور اب سارے ملک پر برطانیہ حکمران تھا۔ نٹموک کے لوگ بادشاہوں کی ملازمت کیا کرتے تھے اور آنگ سان کے ننھیال میں سے بعض بزرگ اعلیٰ سرکاری ملازمتوں پر بھی فائز رہے تھے۔ ان کے والد یوپھا کسان خاندان سے تھے۔ غیر دنیادار اور انتہائی کم گو، اس قدر کم گو کہ وہ اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ کے باوجود اپنے پیشہ وکالت میں ناکام رہے۔ چنانچہ گھر کی گزر اوقات کے لئے زیادہ بوجھ بیوی ڈاسو پر پڑا جو بڑی ذہین اور جوش و جذبہ والی خاتون تھیں جن کے ایک چچا یومن یانگ نے انگریزوں کے خلاف ابتدائی مزاحمتی گروپوں میں سے ایک گروپ کی قیادت کی تھی، جو انگریزوں کے قابو آگئے اور ان کا سر قلم کر دیا گیا۔ کالہا (مغرب سے آنے والے اجنبی) یعنی انگریزوں کی غلامی قبول کرنے سے انکار کرنے والے بےباک محب وطن یومن یانگ پر علاقے کے لوگ بڑا فخر کرتے تھے اور خاندان کو بھی ان پر بڑا ناز تھا، ان کی یاد دلوں میں تحریک کو زندہ رکھتی تھی۔

آنگ سان اپنے بہن بھائیوں میں چھٹے نمبر پر تھے اور انہوں نے اپنے بارے میں جو حقیقت پسندانہ تحریر چھوڑی ہے اس کے مطابق وہ بیمار رہتے، صفائی کا خیال نہ کرتے، پیٹو تھے، ناک نقش کے طور اطوار سے غیر دلکش اور پھر اتنی دیر سے بولنا شروع کیا کہ گھر والوں کو یہ خوف لاحق ہونے لگا کہ کہیں لڑکا گونگا ہی نہ ہو۔ تاہم جو لوگ انہیں جانتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ وہ ان دنوں میں انتہائی بے طمع، حد درجہ ایماندار اور غریبوں سے محبت کیا کرتے تھے، آنگ سان خاندان کو ذہین اور پڑھے لکھوں کا خاندان مانا جاتا تھا، چنانچہ ان کے تینوں بھائیوں نے جلدی ہی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی لیکن آنگ سان نے اس وقت سکول جانے سے انکار کر دیا جب تک خود ماں ان کے ساتھ سکول نہیں جاتیں۔ مضبوط دل و دماغ کی ڈاسو کو اپنے چھوٹے بیٹے سے بڑا پیار تھا اس لئے آٹھ سال کی عمر تک سکول نہیں جانے دیا تا آنکہ خود آنگ سان نے فیصلہ نہیں کیا کہ وہ پڑھنے کے لئے سکول جائیں گے۔ برما کے بدھ بچوں پر لازم تھا کہ وہ تھوڑے سے عرصہ کے لئے بدھ مت کی رسومات وغیرہ سے آگاہ ہونے کی خاطر مقامی عبادت گاہ میں تعلیم حاصل کریں۔ جب بڑے بھائی کی

عبادت گاہ میں داخلہ کے سلسلے میں تقریب ہوئی تب آنگ سان نے سکول جانے کا عندیہ دیا۔ دراصل اس موقع پر ایک رسم ہوتی ہے کہ عبادت گاہ میں تربیت کے لئے جو بچہ جاتا ہے اسے سفید گھوڑے پر بٹھا کر پورے گاؤں کا طواف کرایا جاتا ہے۔ چنانچہ آنگ سان نے بھی یہ دیکھ کر عبادت گاہ میں طالب علم یا شاگرد بننے کی شدید خواہش کا اظہار کیا۔ ذہین ماں نے موقع غنیمت جانا اور بتایا کہ عبادت گاہ میں جانے سے پہلے اسے سکول میں لکھنا پڑھنا سیکھنا ہو گا۔

آنگ سان جلدی اپنی محنت اور نظم و ضبط کے بل بوتے پر نمایاں طالب علم بن گئے اور ہمیشہ کلاس میں اول رہے۔ انہوں نے بدھ مت کے مکتب میں پڑھنا شروع کیا جہاں کچھ کچھ جدید تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ چنانچہ ایسی درسگاہوں کو لاء کاٹک (Law katak) دنیاوی درس گاہوں کا نام دیا گیا تھا. تاکہ ان میں اور صرف بدھ مت کی روایتی مذہبی تعلیم دینے والی درسگاہوں میں امتیاز قائم رہے۔ بہرطور نٹموک کے سکولوں میں انگریزی نہیں پڑھائی جاتی تھی اور آنگ سان نے اپنے دو بھائیوں کے برابر رہنے کا تہیہ کر رکھا تھا جو انگریزی زبان سیکھ رہے تھے. ان دنوں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگریزی جاننا ضروری تھا۔ تیرہ سال کی عمر میں انہوں نے ژنیانگ ژوانگ کے نیشنل سکول میں داخلے کے لئے بھوک ہڑتال کر دی. دراصل ان کی والدہ اپنے چھوٹے بیٹے کو دوسرے شہر نہیں بھیجنا چاہتی تھیں۔ چنانچہ ماں کی رضا حاصل کرنے کے لئے بھوک ہڑتال کی گئی۔ آنگ سان کی خوش قسمتی کہ ژنیانگ ژوانگ کے سکول میں ان کے بڑے بھائی باون خود ٹیچر تھے. جنہوں نے اونگ سان کی تعلیم و تربیت اور دوسرے معاملات پر بھی بھرپور توجہ دی. باون کے انداز میں سختی بھی تھی اور گہری سوجھ بوجھ بھی۔ نوجوان طالب علم نے ذہانت اور حصول علم میں سرگرداں رہنے کا عمل جاری رکھا. ان دنوں پورے ملک میں بدھ مت کے سکولوں اور نیشنل سکولوں میں سرکاری طور پر ہائی کلاس سے پہلے (مڈل کی سطح) امتحان ہوا کرتے تھے. آنگ سان پندرہ سال کی عمر میں اس امتحان میں اول آئے اور وظیفہ کے علاوہ انعام بھی حاصل کیا۔

نیشنل سکول دراصل ۱۹۲۰ء میں رنگون یونیورسٹی ایکٹ کے خلاف تحریک کے بعد قائم کیے گئے تھے۔ ایکٹ کی مخالفت اس لئے کی گئی تھی کہ لوگوں کی نظر میں یہ قانون اعلیٰ

یہ بات قابل ذکر ہے کہ انہوں نے اپنی پہلی تقریر میں جس خیال کا اظہار کیا اس پر آخری دم تک قائم رہے اور وہ یہ تھا کہ مذہبی لوگوں کو سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہئے۔ اس سے تقریباً ایک سال پہلے انہوں نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ سیاست اور مذہب کا ملاپ خود مذہب کی روح کے منافی ہے۔ انہوں نے بدھ مت کے ایک سنگھ (مذہبی لوگوں کا اجتماع) سے اپیل کی کہ بدھ مت کو اتنا مصفا کریں کہ سارا جہان اس کے محبت اور بھائی چارے کے ابدی پیغام کو جان سکے...... آپ اپنے ملک اور عوام کے لئے سب سے بڑی سیاست یہی کر سکتے ہیں۔

آنگ سان کو عوام کی مقبول سطح پر صرف اور صرف سیاستدان بنا دیا گیا ہے مگر مذہب سے ان کا شغف بڑا گہرا تھا۔ زنیانگ ژوانگ میں طالب علمی کے زمانے میں ان کے باپ کا انتقال ہو گیا اس واقعہ نے ان کے اندر یہ خواہش پیدا کر دی کہ وہ بھکشو بن جائیں۔ بعد میں یونیورسٹی کے شروع کے زمانے میں ان کے دل میں ایک اطالوی راہب یو لا کناڈا U. Law Kanada کے لئے اس قدر عقیدت پیدا ہو گئی کہ انہوں نے استاد محترم (لاکناڈا) کے نقش قدم پر چلنے اور بدھ مت کی تبلیغ کے لئے کام کرنے کی اجازت اپنی والدہ سے مانگ لی۔ اجازت تو نہیں ملی مگر روحانی معاملات سے وابستگی ختم نہیں ہوئی۔ طالب علموں کی سیاست میں حصہ لینے اور اس میں مکمل طور پر ڈوب جانے کے باوجود انہوں نے اپنے ایک قریبی دوست کو حق اور تکمیل کی خاطر زیارت کرنے اور قول و فعل اور خیالات میں نیک نیتی اور خلوص پیدا کرنے کی شعوری جدوجہد کے بارے میں خط لکھا۔ انہوں نے اپنے نوجوانوں میں پیدا ہونے والے روحانی خلا کا بھی ذکر کیا اور کہا کہ اگر ہم اس لہر کا مقابلہ نہ کر سکے تو روحانی اعتبار سے ہمارا بالکل کباڑا ہو جائے گا۔

طالب علموں کی سیاست اور تھاکن

آنگ سان طالب علموں کی سیاست میں اولاً خاموشی سے داخل ہوئے اور پھر ۱۹۳۵ء کے بعد زیادہ زور شور سے اس میں حصہ لینے لگے۔ اس وقت تک انہوں نے نو NU ہلاپی Hla Pe (بعد میں لٹ یا Let Ya کے نام سے معروف ہوئے) رشید Rashid، تھین پی Thien Pe اور کیانیئن Kyan Nyein کے ساتھ مل کر کام

نے یہ لقب اس لئے اختیار کیا تھا کہ ان کی نظر میں برماوالوں کا ہی یہ پیدائشی حق ہے کہ وہ اپنے آقا خود ہوں۔ اس طرح نام میں ہی قوم پرستی کا ایک روپ آجاتا تھا۔ اندرونی اختلافات کے باعث یہ تنظیم بھی دو حصوں میں بٹ گئی اور آنگ سان اس تنظیم میں چلے گئے۔ جس کا راہ نما تھاکن کوڈا ہیمنگ Thakin Kodaw Hmaing تھا جس کا مطلب علم و دانش اور سیاست کے بزرگ مرد اعظم ہے۔ وہ اصلاً ایسی ایون کا سرپرست تھا۔ اسی دھڑے میں طالب علم نو Nu ہلاپی Hla Pe، تھیں پی Thein Pe اور دو اور راہ نما آئے تھے۔ یہ دونوں طالب علم راہ نما تو نہیں تھے مگر ان دونوں نے مستقبل کی سیاست میں اہم کردار ادا کرنا تھا ان کے نام تھان ٹن Than Tun اور سوئے Soe تھے۔ آنگ سان جلد ہی تنظیم کے جنرل سیکرٹری بن گئے اور بعد میں تنظیم کا منشور بھی بنایا۔

۱۹۳۸ - ۳۹ء کے درمیان بڑے زبردست واقعات ہوئے جنہیں سال ۱۳۰۰ کا انقلاب کہا جاتا ہے (یہ سن برمی کیلنڈر کے مطابق ہے اور برما کا نیا سال وسط اپریل سے شروع ہوتا ہے)۔ ژنیانگ ژوانگ کے پٹرولیم کے کارکنوں نے ہڑتال اور احتجاجی مارچ کیا۔ کسانوں نے زرعی اصلاحات کروانے کے لئے رنگون پر چڑھائی کی۔ طالب علموں نے احتجاج کیا جس میں پولیس کے لاٹھی چارج کے باعث اونگ گیا Gyaw کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد سکولوں میں مسلسل ہڑتال ہوتی رہی۔ برما کے لوگوں اور ہندوستانی مسلمانوں میں فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ مزدوروں کی ہڑتالیں ہوئیں مانڈلے میں مظاہرے ہوئے جن میں پولیس کی فائرنگ کے باعث سترہ مظاہرین ہلاک ہوئے اور اس کے بعد وزیراعظم باما Ba Maw کی حکومت ختم ہوئی۔ ان تمام واقعات کے باعث ایسی شدید بے چینی پیدا ہوئی جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی اور اس سے قوم پرستوں کی سرگرمیاں اور تیز ہو گئیں۔ لیکن ایسے زبردست واقعات کے باوجود برما کی دو سیاسی بیماریاں دھڑے بندی اور حسد سیاست پر منحوس سائے ڈالنے لگیں۔ سب سے زیادہ موثر سب سے زیادہ ممتاز اور نمایاں، سب سے زیادہ محب وطن ہونے کے دعوؤں اور کشاکش کے باعث گروہ بندی اور تلخی بڑھ گئی۔

آنگ سان کو ان چند لوگوں میں شمار کیا جاتا تھا جو حسد اور دھڑے بندی سے بالاتر

تھے۔ ان کا جھکاؤ بائیں بازو کی طرف تھا وہ ۱۹۳۹ء میں قائم کیے گئے ایک گروپ کے بانی رکن اور جنرل سیکرٹری بھی تھے جسے بعض لوگ مارکسٹ سٹڈی گروپ اور بعض برما کا پہلا کمیونسٹ سیل کہتے تھے۔ لیکن آنگ سان کمیونزم یا کسی بھی دوسرے تنگ اور محدود نظریے کے سلسلے میں شدت پسند نہیں تھے۔ انہیں مختلف سوشلسٹ نظریات میں خاصی کشش نظر آتی تھی لیکن ان کا اصل نصب العین یہ تھا کہ فکر و عمل کے کون کون سے طریقوں کے سبب برما کا اتحاد اور آزادی کی نعمت میسر آسکتی ہے۔ ۱۹۳۹ء میں یورپ میں جنگ چھڑنے کے فوراً بعد آنگ سان نے دیکھا کہ نو آبادیاتی طاقتوں کو مشکل یہ آن پڑی ہے کہ ان کے درپیش نو آبادیوں کے آزادی کے مطالبے بھی ہیں تو انہوں نے فریڈم بلاک بنانے میں بھی مدد دی۔ یہ دراصل باما Ba Maw کی سینیتھا Sinyetha Party ڈوبیاما ایسی ایون Asi-ayone طالب علموں اور بعض سیاستدانوں کا متحدہ محاذ تھا۔ باما Ba Maw کو اتحاد کا اناشین (اقتدار اعلیٰ کا مالک) اور آنگ سان کو جنرل سیکرٹری بنایا گیا۔ نو Nu نے اس بلاک کو تھاکن آنگ سان کے ذہن کی پیداوار قرار دیا۔ فریڈم بلاک نے عوام سے کہا کہ اگر انگریز جنگ کے اختتام پر برما کو آزادی دینے کا وعدہ کرتے ہیں تو جنگ میں ان کی مدد کی جائے اور اگر برطانوی حکومت یہ اعلان کرنے کے لئے تیار نہیں ہے تو پھر انہیں انگریزوں کی جنگی کارروائیوں کی مخالفت کرنی چاہیے۔ حکام نے ردعمل کے طور پر وسیع پیمانے پر قوم پرستوں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ ۱۹۴۰ء کے آخر تک تھاکن کے اور باما کے متعدد راہنما جیل میں تھے۔ اونگ سان کی گرفتاری کا بھی وارنٹ جاری ہو چکا تھا مگر انہیں بروقت پتہ چل گیا اور وہ غائب ہو گئے۔

جاپانیوں سے اتحاد

آنگ سان نے سوچا کہ کچھ عرصہ کے لئے مسلح جدوجہد کرنی چاہیے۔ بچپن میں وہ برما کو آزاد کرانے کے لئے ایسے ہی خواب دیکھا کرتے تھے مگر انہوں نے پرامن آئینی طریقوں سے آزادی کے حصول کے امکان کو رد نہیں کیا تھا۔ یونیورسٹی میں پڑھتے ہوئے انہوں نے سول سروس کے امتحان میں حصہ لینے کا بھی سوچا تھا اور وہ اس طرح ہندوستانی لیڈروں کی مثال سامنے رکھنا چاہتے تھے جو ان کی نظر میں تعلیم یافتہ بھی تھے۔ وطن سے محبت

بھی رکھتے تھے اور سیاست میں بھی سلیقے سے کام کرتے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب وہ طالب علم لیڈر کی حیثیت سے مشہور ہوئے تو انہوں نے رنگون یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر کو لکھا تھا کہ وہ پرامن انقلابی ہیں، تاہم برما کے حالات کے باعث انہیں اپنا راستہ تبدیل کرنا پڑا۔ ۱۹۴۰ء میں انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا تھا۔

"ذاتی طور پر میں محسوس کرتا تھا کہ بین الاقوامی سطح پر پروپیگنڈہ بھی ضروری ہے اور بین الاقوامی امداد بھی۔ لیکن میرے خیال میں اصل اور بڑا کام یہ تھا کہ برما کے اندر عوام کو فوجی جدوجہد کے لئے متحرک کیا جائے۔ میں نے بھی ایک خاکہ سا بنا رکھا تھا۔ انگریزوں کے خلاف ملک گیر عوامی مزاحمت کو درجہ بدرجہ آگے بڑھانے کی تحریک۔ اس کے ساتھ ساتھ شہری علاقوں میں صنعتی کارکنوں کی جزوی اور مکمل ہڑتالوں کا سلسلہ اور پھر آخر میں ایک بڑی فیصلہ کن ہڑتال۔ ملکی اور بین الاقوامی حالات میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ اس پروگرام پر عملدرآمد۔ عوامی مظاہرے، پھر سول نافرمانی، برطانوی سامراج کے خلاف معاشی مقاطع ان کے سامان کی خرید و فروخت کی بندش بعد میں سرکاری ٹیکسوں کی عدم ادائیگی کی تحریک اس کے ساتھ ساتھ فوجی اور پولیس چوکیوں پر گوریلا کارروائی...... ذرائع نقل و حمل کو منقطع کرنا جو آخر کار برما میں برطانوی نظم و نسق کو منجمد کر دے اور پھر بین الاقوامی حالات و واقعات کے مطابق اقتدار پر قبضہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ میں نے یہ بھی خیال رکھا کہ اس صورت میں برطانوی فوج خصوصاً غیر انگریز سپاہی بھی ہماری مدد کو آئیں گے۔ اس منصوبے میں میں نے سوچا تھا کہ ممکن ہے جاپان ہم پر چڑھ آئے...... مگر اس معاملہ میں میرا ذہن زیادہ صاف نہیں تھا (اس زمانے میں ہم سب میں سے کسی کا بھی ذہن صاف نہیں تھا تاہم ہو سکتا ہے کہ اب جبکہ بہت سے واقعات گزر چکے ہیں، کوئی یہ کہہ دے کہ اسے اس وقت اس بات کا پورا پتہ تھا)"

آنگ سان مانتے ہیں کہ یہ عظیم منصوبہ انہوں نے خود بنایا تھا مگر ان کے اکثر ساتھیوں نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہمارا تعلق بورژوائی طبقے

Hein تھان ٹن Than Tun اور تھئین پی Thein Pe نمایاں تھے) فاشسٹ جاپان سے امداد لینے کے خلاف تھے۔ تاہم آنگ سان اس بات کے حق میں تھے کہ جہاں سے بھی ملے ہمیں مدد لینی چاہئے اور پھر حالات و واقعات کے مطابق طریق کار طے کرنا چاہئے۔ بہرطور ان کے اپنے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کے نتائج کے بارے میں زیادہ نہیں سوچا تھا۔

ٹوکیو میں آنگ سان اور سوزوکی کے درمیان بظاہر ایک مفاہمت ہو گئی تھی اس کے باوجود دونوں جانب حجاب موجود تھا۔ سوزوکی آنگ سان کی حب الوطنی اور دیانتداری کی بنا پر عزت کرتا تھا مگر اس کا خیال تھا کہ آنگ سان کے سیاسی خیالات زیادہ پختہ نہیں۔ یہ تنقید کوئی اتنی بے جا بھی نہیں تھی۔ خود آنگ سان نے بھی لکھا ہے کہ انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے جاپانیوں کو حملے کی دعوت اس لئے نہیں دی تھی کہ وہ بھی فاشزم کی طرف مائل ہو گئے تھے بلکہ یہ تصور ہمارا اور ہماری پیٹی بورژوا ذہنیت کا تھا۔"

جاپان جاتے وقت بھی وہ پریشان تھے اور جب وہ وہاں پہنچے تو انہیں تسلی ہو گئی تھی کہ معاملہ خراب نہیں ہے تاہم انہیں پھر بھی بدگمانیاں تھیں۔ وہ جاپانیوں کی حب الوطنی، صفائی ستھرائی اور انکساری کے مداح تھے مگر انہیں جاپانیوں کی عسکری بہیمیت پر اعتراض تھا اس کے علاوہ جاپانیوں کے عورتوں کے بارے میں رویئے پر انہیں بڑا صدمہ ہوا تھا۔

آنگ سان فروری ۱۹۴۱ء میں چینی ملاح کے بھیس میں واپس برما آئے۔ وہ جاپان کی طرف سے جو پیشکش لائے اس سے یہ تاثر لیا گیا کہ برما میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کے لئے جاپانی اسلحہ اور سرمایہ دینے کے لئے تیار ہیں۔ منتخب نوجوانوں کو برما سے باہر لے جا کر فوجی تربیت بھی دی جائے گی۔ آنگ سان خود زیادہ دیر برما میں نہیں ٹھہرے اور ہلا پی Hla Pe اور تین دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ واپس جاپان چلے گئے، یہ لوگ اس گروپ کا ہراول دستہ تھے جو بعد میں تھرٹی کامریڈز کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ تیس جو بعد میں آزاد برما فوج کا مغز ثابت ہوئے اس بنا پر منتخب کئے گئے کہ وہ برما سے باہر جا سکتے تھے اس طرح جو لوگ جیل میں تھے وہ نہ جا سکے اور دوسرے وہ لوگ تھے جنہیں تھاکن پارٹی کے مختلف دھڑوں کو رام کرنے کے لئے منتخب کیا گیا جنہوں نے آگے چل کر تفرقوں کا بیج بویا۔

ان تیس لوگوں کو جزیرہ ہینان Hainan میں زبردست تربیت دی گئی۔ آنگ سان، ہلاپے Hla Pe، ٹن اوک Tun Oak، اور اونگ تھان Aung Than (بعد میں سیٹکیا Setkya کے نام سے مشہور) کو اعلیٰ کمانڈ اور انتظام و انصرام کی تربیت کے لئے منتخب کیا گیا۔ ٹن اوگ تھا کن پارٹی کے ایک دھڑے کی نمائندگی کرتا تھا، اسے گروپ کا سیاسی لیڈر منتخب کیا گیا۔ لیکن درحقیقت ان سب سے آنگ سان سربر آوردہ لیڈر کی حیثیت سے ابھرے اور وہ صرف ان تیس ساتھیوں کے لئے لیڈر نہیں بنے بلکہ آزاد برما فوج کے بھی لیڈر بنے۔ اگرچہ آنگ سان کوئی زیادہ تومند نہ تھے مگر وہ بڑے ماہر اور بہادر سپاہی بھی ثابت ہوئے اور مصائب اور مشکلات برداشت کرنے والے بھی۔ ان پر الزامات لگائے گئے کہ وہ انسانی رشتوں کو اچھی طرح نہیں سمجھتے لیکن یہی آنگ سان تھے جنہوں نے کمزور جسم و جاں والے سپاہیوں کو حوصلہ اور تازگی دی۔ نوجوانوں کا خاص طور پر خیال رکھا اور جب کیمپ کی مشکلات اور جاپانیوں کے خلاف جذبات بے قابو ہونے لگتے تو وہ ان کو بڑی خوبی سے ٹھنڈا کرنے کی صلاحیت کا مظاہرہ کرتے۔ زیر تربیت نوجوان بلاشبہ اپنے بعض استادوں کے لئے عزت اور محبت کا جذبہ رکھتے تھے تاہم برمیوں کو جاپان والوں کے کچھ رویئے اور طریقے سخت ناپسند تھے اور ۱۹۴۱ء کے آخر میں برما پر حملہ سے پہلے ہی دونوں نسلی گروہوں میں اختلاف بڑھنے لگے۔

آزاد برما فوج (برما انڈیپنڈنس آرمی BIA) میں ہینان کیمپ کے تربیت یافتگان، برما میں رہنے والے تھائی نسل کے نوجوان اور مینامی کیکان Minami Kikan کے ارکان شامل تھے۔ سرکاری طور پر اس فوج کے قیام کا اعلان دسمبر ۱۹۴۱ء میں بنکاک میں کیا گیا۔ سوزوکی کو جنرل کا عہدہ دے کر اسے فوج کا کمانڈر بنایا گیا جبکہ آنگ سان کو میجر جنرل کا عہدہ دے کر چیف آف سٹاف بنایا گیا۔ اس نومولود فوج کے ارکان نے حلف وفاداری اٹھایا۔ افسروں کے نام برمی زبان میں بہادری کے لئے استعمال کئے جانے والے الفاظ کے مطابق رکھے گئے اس طرح سوزوکی کا نام موئیگیو Moegyo (کوندۂ برق) اور آنگ سان کو تیزا Teza (آگ) کا نام دیا گیا۔ باقی کے تیس ساتھیوں میں جنہوں نے اپنی اپنی جگہ شہرت پائی لٹ یا Let Ya، سیٹکیا Setkya، نی ون Ne Win، ژان ینگ Yan Naing اور کیا زا Kyaw Zaw شامل تھے۔ تاہم میجر

جاپانی بھی تھے جو انسانیت اور عدل و انصاف کے اصول کے مطابق رہتے تھے اور انہوں نے برما والوں کو دوست بھی بنا لیا تھا مگر جارحانہ نسل پرستی ان کے کئے دھرے پر پانی پھیر دیتی۔

مینامی کیکان Minami Kekan کے ارکان سمجھتے تھے کہ انہوں نے برما کو آزادی دلانے کا جو وعدہ کر رکھا ہے وہ اس کے پابند ہیں مگر حالات نے جو رخ اختیار کیا تھا وہ اس سے خوش نہیں تھے۔ جب مارچ ۱۹۴۲ء میں جاپانیوں نے رنگون کو فتح کر لیا اس کے فوراً بعد سوزوکی نے ٹن اوک Tun Ok کی سربراہی میں برما کی مرکزی حکومت قائم کر دی مگر یہ حکومت زیادہ دیر قائم نہیں رہی جیسے جیسے برما کے دوسرے علاقے جاپانیوں کے قبضے میں آتے گئے جاپان کے فوجی ان پر کنٹرول کرنے لگے اور برما کے ساتھ ایک مفتوح قوم اور ملک جیسا سلوک کیا جانے لگا۔ آزاد برما، فوج کی طاقت بھی ناقابل رشک تھی۔ یہ فوج جب برما میں داخل ہوئی ہے تو بے شمار نوجوان اور پر جوش برمی اس میں شامل ہوتے گئے مگر انہیں موثر اور منظم فوجی بنانے کے لئے تربیت دینے کی ضرورت تھی۔ آنگ سان کو فوج کی کمان نہیں دی گئی۔ وہ صرف سوزوکی کے سینئر سٹاف آفیسر تھے۔ اور سوزوکی کا جاپان کی فوجی انتظامیہ سے معاملہ پر تنازعہ تھا کہ اسے اور آزاد برما فوج کو مستقبل میں کیا کردار ادا کرنا ہے۔ آنگ سان اور ان کے ساتھیوں میں یہ خیال جڑ پکڑتا جا رہا تھا کہ آزاد برما فوج کی کمان برمی آفیسروں کو ملنی چاہئے۔ اس ضمن میں لٹ یا Let Ya نے ڈرامائی انداز میں اس وقت کا نقشہ کھینچا ہے جب اس معاملہ پر لٹ یا، آنگ سان اور تیس کامریڈوں میں سے متعدد کامریڈوں اور جنرل سوزوکی کے درمیان تکرار ہوئی اس کے نتیجے میں آنگ سان کو آزاد برما فوج کا کمانڈر انچیف اور لٹ یا کو چیف آف سٹاف بنا دیا گیا۔

تاہم آنگ سان کو نہ تو اپنے بارے میں اور نہ ہی ملک کی حالت کے بارے میں کسی قسم کی خوش فہمی تھی۔ انہیں احساس تھا کہ آزادی کی منزل ابھی بہت دور ہے چنانچہ انہوں نے فوج کو زیادہ مضبوط اور زیادہ منظم کرنے پر توجہ دی انہوں نے فوج کو سیاست سے دور رکھنے کی بھی کوشش کی اور شہری معاملات میں دخل اندازی سے بھی گریز کیا۔ مگر انہیں یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ جس فوج کا وجود ہی سیاستدانوں کا مرہون منت ہے اسے سیاست سے الگ رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ جولائی ۱۹۴۲ء میں سوزوکی برما سے چلا گیا۔ آزاد برما فوج

کا نام برما ڈیفنس آرمی رکھا گیا، آنگ سان ہی کمانڈر انچیف تھے عہدہ کرنل کا تھا۔ مگر اس فوج کی ہر سطح پر جاپان کے مشیر بھی لگے ہوئے تھے اور برما کے افسروں کے اختیارات بڑے محدود کر دیئے گئے تھے۔ اگست کے مہینے میں برما میں جاپانی فوج کے سربراہ جنرل لیڈا نے برمی انتظامیہ قائم کی اور باما Ba Maw کو اس کا سربراہ نامزد کیا۔ بظاہر یوں لگتا تھا کہ برما کی حکومت برما کے لوگوں کو دے دی گئی ہے مگر اس کے پردے میں جاپان کا فوجی غلبہ اور بڑھ گیا۔

مزاحمت

آنگ سان اور ان کے ساتھیوں کو آزاد برما فوج کے مارچ کے دوران شدید جسمانی تکلیف کے سامنا کرنا پڑا۔ ایک طرف ملیریا دوسری طرف تھکن نے ان کے متعدد ساتھیوں کو ہسپتال پہنچا دیا۔ ان ہسپتالوں میں صدق اور ایمان والے ڈاکٹر اور نرسیں متعین تھیں جو مریضوں کو انتہائی مشکل حالات میں طبی امداد دیتی تھیں۔ آنگ سان کی شہرت ایک ہیرو کے طور پر بھی بڑھتی گئی اور ایک سخت گیر ناظم کی حیثیت سے بھی۔ چنانچہ وہ جونیئر نرسوں کے لئے حیرت انگیز شخصیت تھے۔ وہ ان کے قریب جانے سے ڈرتی تھیں اس لئے ان کے ساتھ سینئر سٹاف نرس ماکھن چیئ Makhinchyi کی ڈیوٹی لگائی گئی جو بڑی پرکشش جوان خاتون تھی اور جس کا اپنے کام سے اسقدر لگاؤ تھا کہ مریض اور ساتھی کارکن اس کی بہت عزت کرتے اور اس سے محبت بھی۔ انہوں نے آنگ سان کی بڑی دلجمعی، نرمی اور خوش مزاجی سے ایسی تیمارداری کی کہ ناقابل تسخیر کمانڈر انچیف اس کا اسیر ہو کر رہ گیا۔ شرمیلے پن اور نصب العین سے شدید لگن کے باعث وہ اب تک عورتوں سے دور ہی رہے تھے۔ جاپان میں سوزوکی نے آنگ سان کو ایک عورت کی پیشکش کی جو شائد جاپان کے اصول مہمانداری کا حصہ تھا تو آنگ سان کو سخت صدمہ ہوا اور شبہ بھی کہ بزرگ آدمی اس کے اخلاق کو خراب کرنا چاہتا ہے۔ بہر طور آنگ سان کو خبر تھی کہ ان کا نصب العین کیا ہے اور کس طور راست رو رہ کر زندگی گزارنی ہے کچھ عرصہ دوستی کرنے کے بعد آنگ سان اور ماکھن چیئ (بعد میں ڈاکھن چیئ کے نام سے مشہور ہوئیں) نے ۶ ستمبر ۱۹۴۲ء کو شادی کر لی۔

کے سلوک کی ضمانت ہونی چاہیے۔ انہیں برماوالوں اور کیرن کے درمیان جھگڑے پر بڑی تشویش تھی ۱۹۴۳ء کی دوسری تمام ششماہی میں تھان ٹن اور لٹ یا کے تعاون سے انہوں نے بھرپور کوشش کی کہ ان دو نسلی گروہوں کے درمیان مفاہمت پیدا ہو اور امن قائم ہو جائے۔ ان کی کوششیں رنگ لائیں اور برمی فوج میں کیرن بٹالین قائم کر دی گئی اس طرح برمی راہ نماؤں کو کیرن کا اعتماد حاصل ہو گیا۔

برما کے کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کی برما انقلابی پارٹی کے درمیان دشمنی کی حد تک اختلاف تھا۔ آنگ سان کو یہ مسئلہ بھی حل کرنا تھا۔ کمیونسٹ لیڈروں میں سو Soe تھا جس نے جاپانی قبضہ کے سارے عرصے میں خفیہ طور پر کام کیا، تھان ٹن Than Tun جنگلات اور زراعت کا وزیر بن گیا تھا. اور باہیئن Ba Hein تھا۔ جب کہ کیانیئن Kyaw Nyein اور باسوئے Ba Swe اہم سوشلسٹ راہنما تھے۔ آنگ سان نے ان دو فریقوں کو بھی متحد کرنے کے لئے بڑی کوشش کی۔ سیاسی اختلافات برمی فوج کے اتحاد و اتفاق کو بھی متاثر کرنے لگے تھے۔ چنانچہ مزاحمت کی تحریک کو کامیاب کرانے کے لئے اس سیاسی اتحاد کی بھی فوری ضرورت تھی۔ سو Soe نے فاشسٹوں کے خلاف تحریک شروع کر رکھی تھی اور اس کے پروپیگنڈہ کے باعث فوج میں بھی نفرت پیدا ہو رہی تھی اور آنگ سان پر بھی دباؤ آ رہا تھا۔ مہینوں اس مسئلہ پر تبادلہ خیال کے بعد اگست ۱۹۴۴ء میں آنگ سان سو Soe ، تھان ٹن Than tun اور باہیئن Ba Hien کے مابین ایک خفیہ اجلاس کئی روز تک ہوتا رہا جس میں آنگ سان کی تجویز کردہ فاشسٹ دشمن تنظیم کے قیام، اس کے منشور اور عمل کی منظوری دی گئی۔ اس کے فوراً بعد کمیونسٹ لیڈروں اور برما انقلابی پارٹی کے ارکان کے درمیان ایک ملاقات کرائی گئی جس میں آنگ سان نے برمی زبان میں ایک اعلان پیش کیا جس کا عنوان تھا "اٹھو اور فاشسٹ ڈاکوؤں پر ٹوٹ پڑو۔" اس اجلاس میں فاشسٹوں کے خلاف ایک نئی تنظیم (AFO) بھی قائم کر دی گئی۔ اس تنظیم کا سیاسی راہنما سو Soe تھا جب کہ تھان ٹن جنرل سیکرٹری اور اتحادی فوجوں سے رابطوں کا انچارج بنایا گیا اور آنگ سان تنظیم کے فوجی امور کے انچارج بنائے گئے۔ اس وقت برمی فوج میں کچھ ایسے نوجوان افسر تھے جو آنگ سان کے اس رویئے سے پریشان اور مایوس تھے کہ انہوں نے اپنے رازداروں اور معتمدین کا حلقہ اور تنگ کر لیا ہے

جو صرف چند راہنماؤں اور فوجی افسروں تک محدود ہے، وہ افسر عمل کے لئے بے تاب ہو رہے تھے۔ یہ نوجوان افسر اپنے طور پر مزاحمت کی منصوبہ بندی بھی کر رہے تھے تاہم جب اس بات کا علم آنگ سان کو ہوا تو انہوں نے ان افسروں کو اے ایف او کے اندر ایک خاص کام کرنے کا فرض سونپ دیا۔

اندرونی طاقتوں میں اتحاد کے بعد اب یہ دیکھنا تھا کہ مزاحمت کی تحریک شروع کرنے سے پہلے اتحادی فوجوں سے کس قسم کے رابطے اور تعلقات قائم کیے جائیں۔ آنگ سان اور اے ایف او کے راہنماؤں نے فیصلہ کیا کہ بیرونی امداد ملتی ہے یا نہیں ملتی ہم جاپانیوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے، ادھر اتحادیوں کو اب فتوحات حاصل ہو رہی تھیں اس لئے ان کے خیال میں اتحادیوں کے ساتھ تعاون کرنے سے اس مزاحمتی تحریک کو بھی عملاً فوائد حاصل ہوں گے۔ ۲۷ مارچ ۱۹۴۵ء کو مزاحمت کی تحریک تو شروع کر دی گئی مگر اس وقت تک برطانیہ سے کوئی مفاہمت نہیں ہو سکی تھی۔ ۲۷ مارچ کو پورے ملک میں برمی فوجی جاپانیوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس دن پہلے آنگ سان نے رنگون میں ایک تقریباتی پیریڈ میں حصہ لیا جس کے بعد وہ اور ان کے فوجی "مشقیں" کرنے کے لئے دارالحکومت سے باہر چلے گئے۔ اس وقت تک (جنرل) سلم Slim کی فوج مانڈلے کے شمال میں ایراوتی کو عبور کر چکی تھی اور تھان ٹن برطانوی فوجی افسروں سے رابطہ کرنے کے لئے ٹونگو پہنچ چکا تھا۔ تھوڑی مدت بعد ہی مزاحمت بھرپور طریق سے ہونے لگی۔ ۱۵ مئی کو آنگ سان ایک سٹاف افسر کے ہمراہ سلم سے ملنے کے لئے اس کے ہیڈکوارٹر پہنچ گئے۔ اس ملاقات میں آنگ سان نے اپنے آپ کو برما کی عبوری حکومت کا نمائندہ ظاہر کیا اور کمال دلیری کے ساتھ یہ مطالبہ کیا کہ انہیں اتحادی کمانڈر کی حیثیت دی جائے۔ آنگ سان نے ایک طرف برطانوی افسر سے زیادہ سے زیادہ مراعات لینے کی کوشش کی دوسری طرف اپنے حقیقت پسند، تعاون کار اور دیانتدار ہونے کا بھی ثبوت فراہم کیا۔ چنانچہ سلم کو یہ ادا پسند آئی اور اس کے دل میں آنگ سان کا احترام بھی پیدا ہوا۔ بعد میں سلم نے لکھا "مجھے اس کی دیانتداری نے سب سے زیادہ متاثر کیا، اس نے صرف زبان سے کام لے کر مجھے یقین دہانیاں کرانے سے گریز کیا۔ تعاون کے سلسلے میں بھی کوئی پھڑ نہیں ماری تاہم مجھے خیال ہوا کہ اگر وہ کچھ کرنے کی حامی بھرتا ہے تو پھر اپنے وعدے کا پاس کرے گا۔

آنگ سان اور سلم کے درمیان ملاقات کے بعد برمی فوج اور اتحادی فوج نے مل کر جاپانی فوج کے خلاف کارروائیاں شروع کر دیں، جاپانی فوج بڑی تیزی سے مار کھاتی گئی۔ ۱۵ر جون کو رنگون میں فتح کی پیریڈ کا انتظام کیا گیا۔ جن میں برطانوی سلطنت کے دستوں اور اتحادی فوجوں کے علاوہ برما کی فوج نے بھی حصہ لیا تھا۔ جاپانیوں کے خلاف مزاحمت کا عمل ختم ہو گیا۔ برما کے قوم پرستوں کے لئے کامیابی کا یہ عظیم لمحہ تھا جب نظریاتی اختلافات اور ذاتی مفادات کو ترک کر کے انہوں نے ایک عظیم مقصد حاصل کر لیا تھا۔
اگست ۱۹۴۵ء میں انٹی فاشسٹ آرگنائزیشن میں سماجی اور سیاسی مفادات رکھنے والی تنظیموں اور افراد کو شامل کر کے اس میں توسیع کی گئی اور اس کا نام انٹی فاشسٹ پیپلز فریڈم لیگ (AFPFL) رکھا گیا۔

انگریزوں سے مذاکرات

برطانیہ نے اے ایف او کی پیشکش قبول کر کے جاپان کا مقابلہ اتحادی اور برمی فوجوں کے اتحاد سے کیا اور یہ فیصلہ جنوب مشرقی ایشیا میں اتحادی فوجوں کے سپریم کمانڈر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی ذہانت کا نتیجہ تھا۔ ۱۹۴۲ء میں برطانیہ کے برما سے نکلنے کے بعد ہندوستان میں برما کی جو جلاوطن حکومت قائم کی گئی تھی وہ ان سینئر سرکاری افسروں پر مشتمل تھی جن کی اتھارٹی کو جوان قوم پرستوں نے نہ صرف چیلنج کیا تھا بلکہ ان کا انتظام بھی تہہ وبالا کرتے رہے تھے۔ یہ افسران اے پی ایف ایل سے تعاون کرنے کے سخت خلاف تھے بلکہ جب برطانیہ نے برما پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور اس کے ساتھ ہی فوجی انتظامیہ قائم ہوئی تو یہ افسر اس حکومت کے ذریعے اے ایف پی ایف ایل کو غیر قانونی جماعت قرار دلا کر آنگ سان کو بھی غدار قرار دے کر گرفتار کروانا چاہتے تھے۔ تاہم لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے صورتحال کا اندازہ معروضی طریقہ سے کرتے ہوئے یہ جانا کہ برما کا مسئلہ پرامن طریقہ سے حل کرنے کے لئے اس شخص کا تعاون حاصل کرنا ضروری ہے جسے برما کے لوگ اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں۔ فوجی انتظامیہ کا سربراہ انگریز افسر برما کے عوام کے بدلے مزاج سے اس قدر ناواقف تھا کہ اس کی جگہ ایک پیشہ ور فوجی میجر جنرل ہوبرٹ رائس کو مقرر کر دیا گیا۔
آنگ سان کے لئے فوری طور پر حل طلب مسئلہ برمی فوج کے مستقبل کے بارے

یہ عندیہ بھی دیا کہ اگر ضروری ہوا تو آزادی کے لئے وہ تشدد سے بھی گریز نہیں کریں گے۔ انہوں نے بڑے بڑے جلسوں کو خطاب کیا انہوں نے پولیس کی فائرنگ سے ہلاک ہونے والے کسانوں کے جنازوں پر انتہائی جذباتی اجتماع سے بھی خطاب کیا وہاں برطانوی انتظامیہ کی پالیسیوں کی مزاحمت بھی کی اور عوام کو آزادی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے للکارا بھی مگر انہوں نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ وہ اس مرحلے پر بھی جذبات کو مشتعل نہیں ہونے دیتے اور اپنے کنٹرول میں رکھتے ہیں۔

اس کے باوجود ڈورمین سمتھ اور ان کے مشیر یہ بات کرنے کے لئے تیار نہیں تھے کہ معاملہ پرامن طور پر طے کرنے کے لئے انہیں آنگ سان کا تعاون حاصل کرنا پڑے گا، اس کے برعکس وہ یہ بھی سوچتے کہ کیوں نہ دوسری پارٹیوں کو لیگ کے مدمقابل لا کھڑا کیا جائے اور یوں اس کی طاقت کا اندازہ لگایا جائے۔ ایسے سیاستدان بھی موجود تھے جو اس چیلنج کے لئے تیار تھے کیونکہ اے ایف پی ایف لیگ اور گورنر کی کونسل کے ارکان کے درمیان آزادی کے حصول کے سلسلے میں تو کوئی زیادہ اختلاف نہیں تھا یہ بات ایک انگریز مصنف نے گورنر کی کونسل کے بارے میں لکھتے ہوئے کہی کہ اصل مسئلہ ذاتی حسد اور رقابت ہے۔ اس کے علاوہ آنگ سان کو عوام میں اس حد تک مقبولیت حاصل ہو گئی ہے کہ وہ ایک طرح سے اس کی پرستش کرتے ہیں اس مقبولیت کے سبب آنگ سان کے خلاف مختلف حلقوں میں شدید حسد پایا جاتا تھا۔ عین اس وقت جب گورنر ڈورمین سمتھ اے ایف پی ایف لیگ کے مقابلے کے لئے بندے تلاش کر رہا تھا اور اس کے کچھ مشیر آنگ سان کی باغیانہ سرگرمیوں پر گرفتاری کا پرزور مشورہ دے رہے تھے اس وقت ٹن اوک Tun Ok نے جو کونسل کا نامزد رکن تھا آنگ سان پر قتل کا الزام لگا دیا۔ جن دنوں آزاد برما فوج برما میں آگے بڑھ رہی تھی ان دونوں گاؤں کے ایک سربراہ کا کورٹ مارشل ہوا اس پر الزام تھا کہ اس نے انگریزوں کے لئے کام کیا، انتہائی سنگدلی کا مظاہرہ کیا اور رشوت لی، کورٹ مارشل نے سزائے موت دی آنگ سان نے اس سزائے موت پر عمل کرایا ٹن اوک نے کہا کہ وہ تمام کارروائی کا چشم دید گواہ ہے اور یہ بھی پیشکش کی کہ اگر مقدمہ چلایا جائے تو وہ گواہی دینے کے لئے تیار ہے۔

آنگ سان کی فوری گرفتاری کے سوال پر حکومت میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ بعض

اعلیٰ برطانوی افسروں نے سفارش کی کہ آنگ سان کو فوری گرفتار کیا جائے اس طرح فضا صاف ہو جائے گی متوقع بغاوت ٹل جائے گی، لوگ آنگ سان کو بھول جائیں گے اور زیادہ دنگا فساد نہیں ہو گا۔ پولیس کے انسپکٹر جنرل نے اعتراض اٹھایا کہ ایک طرف تو تمام جنگی جرائم کے بارے میں عام معافی دینے پر غور کیا جارہا ہے دوسری طرف لیگ اور پی وی او کے لیڈروں کی گرفتاری سے حالات بہتر ہونے کی بجائے بغاوت کی آگ بھڑک اٹھے گی۔ برما کے کمانڈر انچیف نے پولیس کے نقطۂ نظر کی حمایت کی اور اس رائے کا بھی اظہار کیا کہ آنگ سان بہت سمجھدار ہیں اس لئے بغاوت کا آغاز نہیں کریں گے۔ دوسری طرف ٹن اوک کی تجویز کے بارے میں اختلاف تھا اور اس کی نیت پر بھی شبہ کیا جارہا تھا کیونکہ ٹن اوک نے ایک کتاب چھاپی تھی جس میں اس نے جاپانیوں کے قبضہ کے دوران اپنے تشدد کے واقعات کا بڑے فخر سے ذکر کیا۔ حالانکہ یہ کام اس کے فرائض میں شامل نہیں تھا۔ ڈورمین سمتھ نے ٹن اوک کے الزام کے بارے میں آنگ سان سے براہ راست بات کرنے کا فیصلہ کیا آنگ سان نے اس کی پوری ذمہ داری قبول کرلی اور کہا کہ کورٹ مارشل کے فیصلے کے مطابق سزائے موت دی گئی تھی۔

گورنر ایک بار پھر شش و پنج میں پڑ گیا۔ ایک طرف آنگ سان کی دیانتداری اور اخلاقی جرات تھی جس کا وہ معترف تھا دوسری طرف آنگ سان ہی اس کی حکومت کا سب سے بڑا مخالف تھا۔ اور اگر اس شخص کو قتل کے الزام میں ختم کر دیا جائے تو خود حکومت کو کتنے سیاسی فائدے ہو سکتے تھے؟ گورنر اس پہلو پر بھی سوچتا تھا، تاہم خوش قسمتی تھی کہ اس وقت برطانوی حکومت نے اس بارے میں فیصلہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اپریل ۱۹۴۶ء میں ڈورمین سمتھ سنگاپور کے دورے پر تھا اسے تار ملا کہ آنگ سان کو فوراً گرفتار کر لیا جائے۔ گورنر حکم پر عمل کرنے کے لئے فوراً رنگون پہنچا وارنٹ کی تعمیل کرائی جانے والی تھی کہ ایک دوسرا تار پہنچا جس میں حکومت کو آنگ سان کی گرفتاری سے روک دیا گیا تھا۔

اس واقعہ سے برما کی انتظامیہ کے بااختیار ہونے کے بارے میں مزید سبکی ہوئی جبکہ لیگ کو حکومت کی ہر حرکت کی خبر ہو جایا کرتی تھی۔ یہ خبریں پہنچانے والے حکومت کے مختلف محکموں میں کام کرنے والے بے شمار ملازم تھے جو لیگ کے حامی تھے۔ بات فوراً ہی

اگرچہ ہڑتال کے بارے میں تصفیہ رکوانے کی کوشش ناکام ہوئیں مگر یہ تو ان کوششوں کا صرف ایک حصہ تھیں جو لیگ اور آنگ سان کو ناکام بنانے کے لئے کی جارہی تھیں۔ اس قسم کی صورتحال کو طول نہیں دیا جانا چاہیے تھا سوشلسٹ کیانئین Kyaw Nyein تھان ٹن کی جگہ اے ایف پی ایف لیگ کا سیکرٹری جنرل بن گیا اور اکتوبر میں تمام کمیونسٹوں کو تنظیم سے خارج کر دیا گیا۔ اس فیصلے کی توثیق اگلے مہینے ہونے والی لیگ کی جنرل کانگرس میں کر دی گئی۔ آنگ سان نے کمیونسٹوں کے بارے میں کہا کہ وہ ملک کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنا چاہتے ہیں، انہوں نے برما کی آزادی کی بجائے اپنی پارٹی کو زیادہ اہمیت دی اور آنکھیں بند کر کے ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے اشاروں پر چلتے رہے جب کہ یہ بھی غور نہیں کیا کہ کیا یہ طریقے برما کی صورتحال میں مناسب بھی ہیں کہ نہیں۔ تھیَن پی نے کونسل سے استعفیٰ دے دیا اور الزام لگایا کہ آنگ سان اور ان کے ساتھی انقلابی کی بجائے اصلاح پسند بن گئے ہیں۔ انہوں نے برطانوی ڈپلومیسی کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں انہوں نے گورنر کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں اور وہ تنقید برداشت کرنے کو تیار نہیں ہیں۔

اگرچہ اے ایف پی ایف لیگ اور کمیونسٹ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے آنگ سان کی مارکسٹ سوشلزم سے وابستگی برقرار رہی اور انفرادی طور پر کمیونسٹوں سے بھی تعلقات قائم رکھے کیونکہ وہ بائیں بازو والوں کے اعتماد کے بڑے علمبردار تھے۔ انہوں نے کمیونسٹوں کے سرخ اور سفید گروپوں میں بھی صلح صفائی کرانے کی کوشش کی اور جب تھیَن تھان گروپ کو لیگ سے خارج کر دیا گیا انہوں نے پی وی او اور سوشلسٹوں کو مدغم کر کے مارکسٹ لیگ بنانے کے بارے میں غور و خوض کیا۔ نئی مجلس عامہ نے سو Soe کے کمیونسٹ گروپ پر سے پابندی ہٹالی مگر وہ مسلح انقلاب سے کم کسی بات پر ٹھہرتے ہی نہ تھے اس لئے جنوری ۱۹۴۷ء میں اسے پھر خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ سرخ اور سفید کمیونسٹوں خصوصاً پی بی ایف کے سروس مینوں کے دل میں آنگ سان کے لئے بڑا احترام رہا اور انہوں نے آنگ سان کے جیتے جی کبھی اس امکان کو رد نہیں کیا کہ آخرش ایک بار پھر اتحاد ہو جائے گا۔ تاہم آنگ سان برمی عوام کے اتحاد اور آزادی کے نصب العین پر کسی بھی نظریہ کو ترجیح دینے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔

دسمبر ۱۹۴٦ء میں اے ایف پی ایف لیگ کو برطانوی حکومت نے دعوت دی کہ برما کو خود مختار آزاد ملک بنانے کے سلسلے میں کیے جانے والے اقدامات کے بارے میں مذاکرات کیے جائیں۔ لیگ نے دعوت قبول کرلی۔ نئے سال کے آغاز میں جانے والے وفد کے سربراہ آنگ سان تھے اور اس میں متعدد سیاستدان کونسلر اور اعلیٰ سرکاری حکام شامل تھے۔ دہلی میں سٹاپ اوور کے دوران پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے آنگ سان نے بتایا کہ انہیں مکمل آزادی چاہیے، ڈومی نین کا درجہ منظور نہیں۔ اخبار نویسوں کے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ اگر برما کے مطالبات کو تسلی بخش حد تک نہ مانا گیا تو پھر انہیں پرامن اور مسلح جدوجہد کرنے یا دونوں طریقے اختیار کرنے کے بارے میں کوئی تامل نہیں ہو گا۔ انہوں نے آخر میں کہا کہ وہ بہتری کی امید لگا کر جارہے ہیں مگر بدترین صورت سے بھی نمٹنے کے لئے تیار ہیں۔ " برما سے روانہ ہونے سے پہلے نئے سال کی تقریر میں وہ یہ ساری باتیں کہہ چکے تھے۔ انہوں نے بڑی بے تکلفی سے یہ بات کی کہ برطانیہ والے پرامن تصفیہ چاہتے ہیں اور وہ خود بھی مسلح انقلاب کی بجائے پرامن تصفیہ کو ترجیح دیتے ہیں، تاہم اگر بنیادی مفاہمت اور سمجھوتے نہ ہوئے تو عوام کو قانون کے دائرے سے باہر کی جدوجہد کے لئے بھی تیار رہنا چاہئے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ آنگ سان اور لیگ نے مذاکرات کی ناکامی کی صورت میں مسلح جدوجہد کے لئے اسلحہ حاصل کرنے کا بھی انتظام کرلیا تھا اور پی وی او کو بھی تیار کرلیا تھا۔

مذکرات میں جو معاہدہ ہوا اس کا نام بھی آنگ سان اٹیلی معاہدہ رکھا گیا۔ مذکرات میں آنگ سان نے جو کارکردگی دکھائی اس کا ذکر ٹن ٹوٹ Tin Tut نے جو کونسل کا آزاد رکن تھا اور لندن جانے والے وفد کا بھی رکن تھا یوں کیا ہے:۔

> " آنگ سان نے یہ مطالبہ کیا کہ برما گورنمنٹ کے قانونی اور عملی اختیارات فوری طور پر برمی سرکار کو منتقل کیے جائیں، انتخابات اور آئین سازی کا کام بعد میں کیا جائے گا۔ وہ قانونی طور پر منتقلی کا مقصد تو حاصل نہ کرسکے مگر عملاً اقتدار کی منتقلی کی بات منوالی۔ تاہم یہ ایک ایسا فارمولا تھا جس کو اس کے مخالف اس کے وفد کی ناکامی کا رنگ بھی دے سکتے تھے۔ آنگ سان اپنے کم سے کم مطالبات پر ڈٹے ہوئے تھے تاہم انہیں یہ بھی بخوبی علم تھا کہ

چند نشستیں بعض آزاد اور کمیونسٹ امیدوار جیت سکے۔ سا، سئن، ما Saw- Sein- Maw گروپ کو اپنی یقینی ہار کا اندازہ تھا اس لئے انہوں نے انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا۔ لیگ پر الزام لگایا گیا کہ اس نے ووٹروں پر ناجائز دباؤ ڈالا مگر الیکشن ٹربیونل کی تحقیقات کے مطابق انتخابی نتائج دراصل عوام کی پسند کے عکاس ہیں

آنگ سان کی زندگی کے اس آخری مرحلہ پر جب قوم کی تعمیر کا چیلنج درپیش ہوا تو وہ سیاسی اعتبار سے زیادہ پختہ کار ہوتے گئے۔ طریق حکمرانی پر بھی عبور ہوتا گیا اور احساس ذمہ داری اور دوسری صلاحیتیں اپنا بھرپور کردار ادا کرنے لگیں۔ اس زمانے میں ہی ان کے بعض انگریز مخالفین بھی ان کا احترام کرنے لگے ان میں سے ایک نے تحریری طور پر ان خیالات کا اظہار کیا۔ "

> آنگ سان کو اب مدبرانہ صلاحیتوں کو فروغ دینا تھا جس سے ظاہر ہوا کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے کردار میں بھی پختگی آتی گئی۔ آخری دس ماہ میں تو وہ عملاً وزیراعظم تھے اور اس حیثیت میں انہیں پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ ان کا ملک کتنا بڑا ہے، اس میں کتنی زیادہ نسلیں آباد ہیں اور مسائل کس قدر پیچیدہ ہیں۔ کام کی زیادتی کے باعث ان کی صحت متاثر ہونے لگی اور بعض اوقات وہ چڑ بھی جاتے تاہم وہ معمولی آدمی نہیں تھے، حالات کا مقابلہ کرنا جانتے تھے، انگریز افسروں سے اب ان کو روزانہ واسطہ پڑتا تھا۔ انہوں نے بھی آنگ سان کی عزت کرنا شروع کر دی۔ ان کے قتل کے باعث ان کا ملک ایک ایسی شخصیت سے محروم ہو گیا جو مستقبل میں ملک میں ہونے والی لاقانونیت میں اپنے مقلدین کو نظم وضبط کا پابند بنا سکتا۔ "

انہوں نے ملک میں ترقی اور بحالی کے پروگرام بنانے کے لئے جون کے اوائل میں رنگون کے سورینٹا Sorrenta ولا میں متعدد کانفرنسیں بلائیں اپنے افتتاحی خطبوں میں انہوں نے ان باتوں پر زور دیا کہ ترجیحات قائم کی جائیں، وسائل کم ہوں تو بڑے پروگرام نہ بنائے جائیں، فوری مسائل کی نشاندہی کی جائے اور جو بھی پروگرام بنائے جائیں وہ ٹھوس قابل عمل اور لچک دار ہونے چاہئیں۔ انہیں علم تھا کہ جن ہتھیاروں اور طریقوں سے سامراج کے خلاف جنگ لڑی گئی تھی ضروری نہیں کہ آزاد ملک کی بقا اور ترقی کے لئے بھی

وہی حربے صحیح ثابت ہوں۔ اس لئے انہوں نے قوم کو متنبہ کیا کہ اب جب کہ اقتدار قوم کے ہاتھ میں ہے ہر برائی کا ذمہ دار سامراج کو قرار دینا صحیح نہیں اور اس طرح اپنا وقت اور توانائی ضائع نہیں کی جانی چاہئے کیونکہ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے۔ اب آنگ سان نے مستقبل پر نگاہ رکھ لی جب برما قوموں کی برادری میں اپنا جائز مقام حاصل کرے گا اور صحیح قوم پرستی کو ہی بین الاقوامیت کا ایک لازمی حصہ بننا ہو گا۔

سچ کڑوا ہو یا میٹھا آنگ سان سچ بولنے سے ہرگز نہیں جھجکتے تھے انہوں نے ۱۳ر جولائی ۱۹۴۷ء میں اپنی آخری تقریر میں برما کے عوام کو نصیحت کی کہ وہ نظم و ضبط کی پابندی کریں، قربانیاں دینے سے گریز نہ کریں ثابت قدمی کو شعار بنائیں اور یاد رکھیں کہ آزادی کے ثمر حاصل کرنے کے لئے برسوں محنت اور مشقت کرنی پڑے گی۔ آنگ سان دیانتداری سے اپنی منفی اور مثبت صفتوں کا بھی اندازہ لگاتے رہے۔ انہوں نے اپنے دوستوں کے سامنے اپنی کمزوریوں کا اعتراف کیا اور انہیں دور کرنے کا عہد بھی کیا جو صفات یونیورسٹی کے ایک نوجوان انقلابی میں برداشت کی جا سکتی ہیں وہ صفات اگر ملک کے نامور راہنما میں ہوں تو ناقابل برداشت بن جاتی ہیں، کردار کے کھردرے پہلوؤں کی تراش خراش کی ضرورت ہوتی ہے تنک مزاجی پر قابو پانا ہوتا ہے اور خواہ کتنی ہی مشکل کیوں نہ ہو مگر معاشرتی حسن آداب کو نبھانا لازمی ہوتا ہے۔

سرکاری طور پر اقتدار کی منتقلی کا کام آگے بڑھتا رہا ہے اے ایف پی ایف لیگ نے مئی کے مہینے میں ایک کنونشن بلائی اور اس میں آزادی کے بارے میں اپنی پالیسی وضع کی۔ ملک کا نیا نام یونین آف برما تجویز کیا گیا اور ایک کمیٹی بنائی گئی جسے آزادانہ خود مختار جمہوریہ کے لئے دستور تیار کرنا تھا۔ جس منزل کے حصول کے لئے اتنی مشکلیں جھیلی تھیں اب سامنے نظر آ رہی تھی چنانچہ آنگ سان میں بھی اضطراب کم ہونے لگا۔ کردار میں ٹھہراؤ آ گیا اور دیکھنے میں بھی اس بھنچے جبڑوں والے فوجی کمانڈر میں جس نے جاپانیوں کے خلاف مزاحمت کی تحریک میں اپنی فوج کی سربراہی کی اور آج کے آنگ سان میں نمایاں طرق نظر آنے لگا۔ اپنے آپ پر بھرپور اعتماد کے باعث طور اطوار میں بھی تبدیلی ہوئی اب پرسکون سنجیدگی مگر اس کے نیچے دور کہیں ایک درد ایک پریشانی اور تھکن کی موجودگی کا احساس بھی تھا۔ انہوں نے اپنی اس خواہش کا بھی اظہار کیا کہ آزادی کے حصول کے بعد سیاست چھوڑ کر اپنے خاندان پر

توجہ دینا چاہتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ لکھنے پڑھنے کا کام کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہونا تھا۔ ۱۹ر جولائی کو جب ایگزیکٹو کونسل کا اجلاس ہو رہا تھا آنگ سان اور چھ دوسرے کونسلروں کو فوجیوں نے آکر قتل کر دیا۔ قتل ہونے والوں میں آنگ سان کے سب سے بڑے بھائی باون Ba Win جو سول سروس کے سینئر رکن تھے شامل تھے. کونسل کا اجلاس بغیر کسی حفاظتی انتظام کے ہوا تھا کہ فوجی ایک دم سے کمرے میں گئے اور انہوں نے فائر کھول دیا۔ قاتل فرار ہو گئے مگر جلد ہی معلوم کر لیا گیا کہ وہ سا Saw کے گھر میں گئے ہیں۔ سابق وزیر اعظم سا Saw بہت اونچی خواہشیں رکھتا تھا۔ اور آنگ سان کے فوجی لیڈر بن کر ابھرنے کو برداشت نہیں کر سکتا تھا. آنگ سان کو "صرف بچہ ہی تو ہے" کہا کرتا تھا۔ وہ لندن جانے والے وفد میں شامل تھا مگر اس سے کچھ دیر پہلے ہی فوجی وردی میں ملبوس لوگوں نے اسے گولی مار کر زخمی کر دیا تھا اس کی آنکھ بھی ضائع ہو گئی تھی۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ سا کے نزدیک اسے زخمی کرنے والے آنگ سان کی رضاکار تنظیم Pyo کے بندے تھے چنانچہ سا نے اس بات کا انتقام لیا ہے۔ مگر جب مقدمہ چلا تو یہ بات سامنے آئی کہ اصل میں کونسل کے سارے ارکان کو قتل کرنا مقصود تھا اور لگتا یہ ہے کہ سا نے یہ مفروضہ قائم کر لیا تھا کہ آنگ سان اور اس کے ساتھیوں کے خاتمے کے بعد وہ برما کی حکومت کا سربراہ بن جائے گا۔ سا پر قتل کی ترغیب دینے کا الزام ثابت ہو گیا۔ چنانچہ اسے موت کی سزا دی گئی۔

اگرچہ آنگ سان تو جان سے گذر گئے مگر جس آزادی کی خاطر انہوں نے زندگی وقف کر رکھی تھی وہ برما کو مل گئی۔ اے ایف پی لیگ کے زندہ بچنے والے سب سے سینئر راہ نما نو Nu نے مذاکرات مکمل کیے جس کے نتیجے میں ۴ر جنوری ۱۹۴۸ء کو برما آزاد ہو گیا۔

اس مرحلے پر برما کی تاریخ جدید کے امریکی ماہر فرینک این ٹریگر Frank. N. Trager کی تحریر کا اقتباس غالباً بے جا نہیں ہو گا۔

> "اگر سارے بڑے بڑے واقعات کو کسی ایک بڑے آدمی کے کھاتے میں ڈال دیا جائے تو یقیناً یہ تاریخ کو مسخ کرنے کی بات ہو گی اور اس حد تک کہ یہ صفحات بھی دراصل اسی مسخ کرنے کے عمل کی گواہی دیں گے لیکن برما

کے حالات کے پیش نظر مناسب بات یہ ہے کہ ان بارہ سالوں کے ریکارڈ کا جائزہ لیا جائے جو آنگ سان کی قیادت میں تھاکنز کے پہلی بار سیاسی عہدہ کے حصول سے لے کر آج جنوری ۱۹۴۸ء میں طلوع آزادی تک پھیلا ہوا ہے۔"

یہی بات ایک دوسرے انداز میں بھی صحیح ثابت ہوتی ہے۔ آنگ سان کی زندگی کا مطالعہ برما میں تحریک آزادی کے پس منظر میں ہی کیا جا سکتا ہے اور خود اس طرز مطالعہ میں آنگ سان کے ذاتی محاسن کو بڑی حد تک نظر انداز بھی کر دیا جائے تب بھی نتیجہ وہی نکلتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے دوسرے عشرے کے شروع میں طالب علموں کی سیاست میں آئے اور پھر وہ سربسر آزادی کی تحریک سے وابستہ ہو گئے۔ یہی ان کی زندگی تھی اور اس دوران وہ ایسی شخصیت نہیں بنے کہ اپنے کردار کو دو حصوں میں تقسیم کر پاتے یعنی عوامی سطح پر ان کا روپ اور ہوتا اور نجی طور پر ان کا کردار اور ڈھنگ کا ہوتا۔ آنگ سان کی ساری کی ساری تصویر ایک ایسے نوجوان کی ہے جو انتہائی دیانتدار اور مضبوط کردار کا مالک ہے جس نے اعلیٰ مقصد سے گہری لگن اور پوری یکسوئی سے ملک کی راہ نمائی کر کے آزادی حاصل کی۔ بعض سیاسی مخالفین نے ان پر الزام لگائے ہیں کہ ان میں حصول درجات کی تباہ کن خواہش تھی۔ مزاج بے ڈھب تھا اور دوغلا پن بھی طبیعت کا حصہ تھا اور ایسے ہی الزامات ان لوگوں نے بھی لگائے ہیں جو غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف آنگ سان کی جدوجہد کو "غداری" کہا کرتے تھے۔ ان الزامات کو دراصل ان کے اعمال اور کارناموں سے الگ کر کے بھی دیکھا گیا ہے تاہم دیکھا جائے تو آنگ سان نے جب کبھی اپنے سے بہتر قائد کو دیکھا فوری طور پر اس کی ماتحتی بھی قبول کر لی اور مرکزی حیثیت صرف اس صورت میں اختیار کی جب انہیں یقین ہو گیا کہ اب صرف وہی اس ملک کو متحد کر کے آزادی کی دہلیز تک لے جا سکتے ہیں۔ کیانئن Kyaw Nayein طالب علمی کے زمانے سے اونگ سان کا قریبی ساتھی رہا اس کے الفاظ میں "قیادت آنگ سان کو دی نہیں گئی تھی، انہوں نے انہیں بے شمار صلاحیتوں کے باعث اسے حاصل کیا تھا۔" آنگ سان پر بعض اوقات جذبات بھی غالب آ جاتے اور بعض اوقات موڈ بھی بدلتے رہتے مگر انہوں نے تحریک آزادی کی سیاست میں ذاتی جھکاؤ یا احساس کو اجتماعی فیصلوں میں دخل انداز نہیں ہونے دیا۔ ہر مرحلے پر انہوں نے اپنے قریبی سیاسی

مون، ارکان (رطیین) اور شان۔

مجموعی طور پر برما کی آب و ہوا گرم اور استوائی (گرم مرطوب ہے) البتہ سطح مرتفع شان کی آب و ہوا معتدل ہے۔ کاچن اور چن کے صوبوں کے بعض علاقوں میں سخت سردی ہو جاتی ہے۔ ملک کے موسمی تغیرات میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ مون سون کے سبب چھ ماہ تک ملک میں بڑی بارش ہوتی ہے۔ برما میں بہار، گرمی، خزاں اور سردی کے موسموں کی بجائے صرف دو موسم برسات ابر (وسط مئی سے وسط اکتوبر تک) اور سردیوں کا موسم (بارشوں کے خاتمہ سے لے کر فروری کے آخر تک) ہوتے ہیں۔ ساحلی علاقوں میں اوسطاً بارش پانچ سو سینٹی میٹر (دو سو انچ) تک اور خشک علاقوں میں پچاس اور ایک سو پندرہ سینٹی میٹر (۲۵ اور ۴۵ انچ) کے درمیان ہوتی ہے۔ پورے ملک میں درجہ حرارت میں بھی فرق ہوتا ہے، گرمیوں کے موسم میں یہ ۳۸ سینٹی گریڈ (۱۰۰ فارن ہیٹ) تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ میدانی علاقوں میں دسمبر اور جنوری میں موسم بڑا خوشگوار ہوتا ہے۔ درجہ حرارت ۲۱ اور ۲۶ ڈگری سینٹی گریڈ (۷۰ اور ۸۰ فارن ہیٹ) کے درمیان ہوتا ہے۔ سطح مرتفع شان اور دوسرے پہاڑی علاقوں میں سردی ہوتی ہے اور ایسے مقامات بھی ہیں جہاں پارہ نقطہ انجماد تک گر جاتا ہے۔

برما کے دارالحکومت رنگون ہے جو ڈیلٹا کے علاقے میں ایک بندرگاہ بھی ہے۔ اصل برمی نام ینگون ہے جس کا مطلب ہے "خطرے ختم ہوئے" مگر انگریزوں نے اسے بگاڑ کر رنگون کر دیا۔ یہ نام بادشاہ النگ پاس Alaung Paya نے ۱۷۵۵ء میں رکھا تھا. اس نے یہ شہر فوج رکھنے کے لئے بسایا تھا اس فوج نے جنوب میں دشمن فوجوں کا صفایا کر دیا تھا۔ جہاں رنگون ہے کبھی یہاں پر ڈیگون نام کا خوشحال قصبہ ہوتا تھا۔ مگر شاہ النگ پایا کے زمانے تک یہاں صرف چند گھر ہی رہ گئے تھے۔ بندرگاہ کی حیثیت سے رنگون کی اہمیت سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں زیادہ بڑھ گئی اور برما پر ۱۸۸۵ء میں انگریزوں کے قبضہ کے بعد اسے دارالحکومت کا درجہ دے دیا گیا۔

برما کے بادشاہوں کا آخری دارالحکومت وسطی برما کے شہر مانڈلے میں تھا۔ مگر مانڈلے زیادہ پرانا شہر نہیں اس کو شاہ منڈون Mindon نے ۱۸۵۷ء میں آباد کیا تھا۔ یہ نام نواح میں واقع ایک مقدس پہاڑی کا ہے۔ روایت کے مطابق مہاتما بدھ نے دو ہزار

میرا دیس میرے لوگ

یہ تحریر "آیئے برما دیکھیں" کے زیرِ عنوان ۱۹۸۵ء میں برک پبلشنگ کمپنی لندن نے نو عمر قارئین کے لئے چھاپی تھی۔ مصنفہ نے اسی سلسلے میں نیپال اور بھوٹان کے بارے میں بھی مضامین لکھے تھے۔

برما ان ممالک میں سے ایک ہے جن پر فطرت مہربان رہی ہے۔ زمین زرخیز ہے اور چاول اور دوسری خوردنی اجناس کثرت سے پیدا ہوتی ہیں۔ نوع بنوع درختوں کے وسیع جنگل ہیں جن سے قیمتی ٹمبر حاصل ہوتا ہے۔

اس دھرتی کے اندر پٹرولیم بھی ہے۔ سندر معدنیات بھی اور قیمتی پتھر مثلاً روبی، سینفائر اور جیڈ بھی۔ دریا اور ندیاں مچھلیوں سے پر ہیں۔ سمندر سے صرف خوراک ہی حاصل نہیں ہوتی دنیا کے بہترین موتی بھی ہاتھ آتے ہیں۔ چنانچہ اگر برما کو سنہری سرزمین کا نام دیا گیا ہے اور اسے نوبہ نو سوغاتوں کی مشرقی جنت کہا گیا ہے تو یہ ہرگز بے جا نہیں ہے۔ لیکن دنیا میں جنت کسی بھی ملک میں نہیں ہے اور اپنے تمام تر وسائل کے باوجود برما بھی دنیا کی امیر قوموں میں شمار نہیں ہوتا۔ ؎ قطع نظر یہ انتہائی خوبصورت ملک ہے جس میں مختلف نسلوں کے لوگ آباد ہیں۔ برمی لوگوں کی اکثریت ہے اسی لئے اس خطے کا نام برما رکھا گیا ہے۔

برما کا رقبہ ۶۷۶،۵۵۲ مربع کلومیٹر (۲۶۱،۲۱۸ مربع میل) ہے۔ شمال میں چین، مغرب میں ہندوستان اور بنگلہ دیش اور مشرق میں تھائی لینڈ اور لاؤس ہیں۔ جنوب میں بحرہ ہند کی قدرتی ساحلی پٹی ہے۔ اس کی شکل تقریباً ہیرے جیسی ہے برما کو اکثر ایسی پتنگ کہا جاتا

دارالحکومت رنگون آگیا تو اس شہر کی اہمیت کم ہو گئی مگر مولیمین بہر طور ایک بڑا شہری مرکز ہے۔ یہ زندہ دل خوبصورت شہر ہے جس میں استوائی مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ استوائی خوشبوئیں اور کھانے بھی شہر کی خاصیت ہے۔ برما کی ایک معروف کہاوت ہے جس میں اس شہر کی معروف صفت کا بھی ذکر ہے اور باقی دو شہروں کے لوگوں کی نمایاں خوبیوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

مولیمین خوش خوراک

مانڈلے خوش گفتار

اور رنگون ظاہر کار

برما بنیادی طور پر زرعی ملک ہے، سارے ملک خصوصاً ایرا دتی ڈیلٹا کی آب و ہوا دھان کے لئے بہت مفید ہے۔ ایک زمانے میں برما دنیا میں چاول بر آمد کرنے والا سب سے بڑا ملک تھا۔ آج بھی ملک کی چالیس فیصد بر آمدی آمدنی اسی چاول سے آتی ہے مگر یہ بر آمدی جنس ہی نہیں برما کے عوام کی بنیادی خوراک بھی ہے۔ جو ہر کھانے کے وقت کھائے جاتے ہیں دور دراز پہاڑی علاقوں میں جہاں چاول کثرت سے پیدا نہیں ہوتا کم از کم دن میں ایک بار چاول ہی کھائے جاتے ہیں۔

برما کے میدانی علاقوں میں چاول بکثرت ہوتے ہیں یہاں کاشت کا نمی والا طریقہ رائج ہے۔ میدان بارش کے پانی سے یا خشک موسم میں آبپاشی کے طریقے سے بھرے رکھے جاتے ہیں۔ دھان کاشت کرنے کا موقع پر یہاں کے لوگوں کی زندگی کا بڑا اہم حصہ ہوتا ہے اور اس موقع کے لئے گیت اور رقص بھی بنے ہوئے ہیں۔ سال کے آخر میں فصل کاٹی جاتی ہے۔ ار کٹائی زیادہ تر دستی ہوتی ہے۔ ہر چند جدید طریقے اور مشینری بھی آچکی ہے مگر اب بھی روایتی طریقہ ہی چلتا ہے۔

برما کے پہاڑی علاقوں میں دھان کی کاشت کا عام طریقہ ہے کہ کاٹو اور جلاؤ جسے متبادل کاشت یا متحرک کاشت بھی کہا جا سکتا ہے۔ زمین کے ایک ٹکڑے میں درخت کاٹ دیئے جاتے ہیں اور جھاڑ جھنکار کے ساتھ انہیں جلا دیا جاتا ہے جب اس راکھ پر بارش پڑتی ہے تو زمین بڑی زرخیز بن جاتی ہے اس زمین پر دھان کاشت کیا جاتا ہے۔ چند سالوں بعد جب زمین کی زرخیزی کم ہو جاتی ہے اس کو چھوڑ کر نیا پلاٹ تیار کیا جاتا ہے۔ بعض پہاڑی

علاقوں میں پہاڑی کے ساتھ ساتھ ٹیڈس نما کھیت بنا کر بھی چاول کاشت کیے جاتے ہیں لیکن کاٹو اور جلاؤ والے طریقے کے مقابلے میں یہ کم رائج ہے۔

برما کے جنگلات ملک کی دولت کا بڑا وسیلہ ہیں۔ ملک کے مختلف علاقوں میں مختلف قسم کے جنگلات پائے جاتے ہیں۔ زیادہ اہم جنگلوں میں مختلف قسم کے درخت پائے جاتے ہیں جن میں ٹیش، پائنا کڈو Pyinakado اور پاڈوک Padauk شامل ہیں۔ ٹیش کی صفت یہ ہے کہ اس کی لکڑی بڑی مضبوط، دیرپا ہوتی ہے جو سکڑتی بھی نہیں۔ چنانچہ اسی بنا پر دنیا بھر کی قیمتی لکڑیوں میں ٹیش کی لکڑی بھی شامل ہے۔ یہ جہاز بنانے، گھر بنانے اور فرنیچر سازی میں کام آتی ہے۔ پائنا کڈو لکڑی سختی اور مضبوطی کی بنا پر لوہے کی لٹھ کہلاتی ہے اور بھاری تعمیراتی کام میں استعمال ہوتی ہے۔ برما میں ٹیش کے بعد پاڈوک کی لکڑی کو زیادہ کار آمد سمجھا جاتا ہے مگر یہ درخت برما میں صرف لکڑی کی وجہ سے ہی قیمتی نہیں جانا جاتا بلکہ جب اس کے چمکدار زرد خوشبودار پھول کھلتے ہیں تو وہ شدید گرمیوں کے بعد برسات کی آمد کی خبر دیتے ہیں۔ برما کی نظموں اور گیتوں میں ان خوبصورت پھولوں کا بڑا ذکر ہوتا ہے جو تھوڑے عرصہ کے لئے ہی مسکراتے ہیں۔

چاول کے علاوہ برما کی دوسری زرعی اجناس گنا، مونگ پھلی، دالیں، مکی اور تل ہیں۔ باجرہ، تمباکو، کپاس اور ربڑ بھی خاصی مقدار میں پیدا ہوتا ہے۔ برما میں پھل اور سبزیاں بھی نوع بنوع کی ہیں جو مختلف موسموں میں پیدا ہوتی ہیں، استوائی پھلوں میں سے برما میں پیدا ہونے والے پھلوں میں آم، کیلا، سیب، تربوز، پائن ایپل اور مینگوسٹین شامل ہیں۔ سطح مرتفع شان میں سنگترا، سٹرابیری اور ریو کیڈو ناشپاتی ہوتی ہے۔ انہیں معتدل آب و ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ صوبہ شان کے شمالی علاقوں کی اہم پیداوار چائے ہے برمی لوگ نہ صرف چائے بہت پیتے ہیں وہ چائے کے پتوں کا اچار ڈال کر بھی کھاتے ہیں۔ چن پہاڑیوں میں کافی بھی پیدا کی جاتی ہے اور وہاں سیب، ناشپاتی اور شہتوت بھی پیدا ہوتے ہیں۔ برما میں قیمتی زرعی اجناس کی اتنی قسمیں ہیں کہ اگر ان کا ذکر چھڑ گیا تو پھر ایک پوری کتاب صرف اس ایک موضوع کے لئے درکار ہوگی۔

برما کی معدنی پیداوار بھی قابل ذکر ہے۔ کوئلہ، پٹرولیم، قدرتی گیس، سیسہ، جست، ٹن، کچا لوہا اور چاندی خاصی مقدار میں نکالی جاتی ہے۔ وسطی برما میں اتنا تیل نکالا جاتا ہے کہ

پورے ملک کی ضروریات اس سے پوری ہو جاتی ہیں۔ سمندر سے تیل نکالنے کی کوشش ابھی
اتنی کامیاب نہیں ہوئی اور نہ ہی وہاں سے اتنی مقدار میں تیل حاصل ہوا ہے جتنا کہ میگوے
Magwe ڈویژن سے حاصل ہوتا ہے۔ یہاں بعض کنوؤں سے تو کئی صدیوں سے تیل
نکالا جا رہا ہے۔

کوئلہ، چاندی اور سیسے کے ذخائر صوبہ شان میں پائے جاتے ہیں۔ وہاں اور بھی
بہت قیمتی دھاتیں ملتی ہیں مگر سطح مرتفع شان کے قیمتی ہیرے بہت مشہور ہیں۔ برما کا یاقوت
دنیا میں سب سے اعلیٰ درجے کا مانا جاتا ہے۔ نیلم بھی اعلیٰ درجے کا شمار ہوتا ہے۔ نسبتاً
کم قیمتی پتھر مثلاً سپائنل Spinal ، پکھراج، زرقون اور ترمزنی بھی ملتے ہیں۔ کاچن کے
صوبہ میں (جیڈ) سبز پتھر اور اس کی اقسام پائی جاتی ہیں۔ ملک کے عین شمالی گوشے میں سونا
بھی پایا جاتا ہے مگر اتنی مقدار میں نہیں کہ اسے صنعت بنایا جاسکے۔ جست کی کانیں ٹیناسیرئم
ڈویژن میں ہیں اس کا ساحل برما کے موتیوں کا گھر ہے موتیوں کا کام گذشتہ چند سالوں
سے فروغ پر ہے۔

برما کی بڑی بڑی صنعتیں سیمنٹ، سگریٹ، کھاد، صابن، نمک اور سوتی دھاگے کی
ہیں۔ اکثر صنعتی سامان ملک کی ضرورت کے لئے تیار کیا جاتا ہے صرف کچھ سیمنٹ بر آمد کیا
جاتا ہے۔ ملک کی زیادہ تر بر آمدات زرعی ہیں اور کچھ قدرتی ہیں۔ بر آمدات میں چاول،
دالیں، ٹمبر، بنیادی دھاتیں اور چاندی شامل ہیں۔ برما کے قدرتی وسائل کی دولت بڑی ہے
مگر ملک کی ایک بڑی خصوصیت رنگارنگ کے لوگ ہیں، مختلف نسلوں کے لوگ مختلف رسوم
و رواج کے لوگ، برمی قوم کا کردار انہی لوگوں کی تاریخوں اور تہذیبوں نے بنایا ہے۔

ایک شورش زدہ تاریخ

کہا جا سکتا ہے کہ برما کی تاریخ اڑھائی ہزار اور ڈیڑھ ہزار کے درمیان قبل مسیح میں
وسطی ایشیا سے آنے والے مون Mon لوگوں سے شروع ہوئی۔ مون ایراوتی کے
ڈیلٹا، تھائی لینڈ اور ٹیناسریم کے علاقوں میں آباد ہوئے۔ باہر سے آنے والے سب سے
زیادہ طاقتور اثرات مذہب کے میدان میں تھے۔ ہندوستان سے ہندومت اور بدھ مت
آئے اور دونوں مون تہذیب پر اثرانداز ہوئے۔ ہندومت بعض عقائد اور سماجی رسوم کا

مجموعہ ہے جو صدیوں سے ہندوستان میں غالب مذہب چلا آرہا ہے۔ بدھ مت بعد میں آیا۔ یہ مذہب ایک ہندوستانی شہزادہ سدھارتھ کی تعلیمات پر مشتمل ہے۔ مہاتما بدھ ۵۶۰ قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ بدھ مت کا مدعا یہ تھا کہ ساری مخلوق کو زندگی یا وجود کے مصائب سے نجات دلائی جائے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے جھوٹے عقائد سے چھٹکارا پا کر اور مصائب سے آزاد ہو کر نجات پالی تھی اس لئے وہ بدھ کے نام سے مشہور ہوا جس کا مطلب ہے صاحب دانش۔

عموماً یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ مون شروع سے ہی بدھ مت کے پیروکار تھے پھر ایک ایسا وقت آیا کہ ان پر ہندومت کا سخت غلبہ ہوا اور بدھ مت زوال میں آگیا۔ لیکن گیارہویں صدی میں پیگو Pegu اور تھاٹن کی سلطنتیں بدھ مون کی خیال کی جاتی ہیں۔

مون کے بعد برما میں آنے والے تبتی برمنز Tibeto- Burmans تھے جو شمال سے آئے۔ برمی لوگ جو اس وقت برما کی اکثریتی نسل ہیں سمجھتے ہیں کہ ان کے تبتی برمنز آباؤاجداد پیوس Pyus ، کنیان Kanyans اور تھیک Thek تھے۔ کنیان اور تھیک نام تو رہ گئے مگر ان کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔ تاہم پیوس کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے انہوں نے اپنی اعلیٰ تہذیب کے آثار و شواہد چھوڑے ہیں۔ پیو رگوں کے ایک بڑے شہر کے آثار وسطی برما میں دریافت ہوئے ہیں۔ غالباً یہ شہر مسیحی دور کے آغاز میں موجود تھا اس کا نام بیک تھانو Beikthano ہے ہندو دیوتا وشنو کو برمی زبان میں بیک تھا تو ہی کہا جاتا ہے۔ یہاں سے بدھ کا مجسمہ یا کوئی اور ایسی چیز دستیاب نہیں ہوئی مگر یہ یقین کرنے کا ذریعہ ہے کہ وشنو کی عبادت کے ساتھ ساتھ بدھ مت کے کسی ایک مسلک کو ماننے والے یہاں موجود تھے۔

پیو لوگوں کے دو اور شہروں ہالین Halin اور تھیکٹیا یا Thayekinttaya میں کھدائی ہوئی ہے۔ خیال ہے کہ یہ شہر بھی تقریباً اسی زمانے یعنی پانچوں سے لے کر نویں مسیحی صدی تک آباد تھے۔ بیک تھانو کی طرح ہالین میں بھی کوئی بدھ مجسمے یا یادگاریں نہیں ملیں۔ لیکن تھیکٹیا میں بدھ مذہب کی اشیا دریافت ہوئی ہیں۔ شہر کے قریب تین پگوڈے بھی ہیں۔ یہ بدھ یادگار عمارتیں ہیں جو مقدس اور پوتر اشیا رکھنے کے لئے بنائی جاتی تھیں۔ پگوڈے مختلف قسم کی طرز تعمیر کے ہوتے ہیں۔ تھیکٹیا میں جو پگوڈے دریافت

Tripitaka نامی کتاب میں محفوظ ہیں۔ تھیراواد بدھ مت کو بعض اوقات ہنایان Hinayana بھی کہا جاتا ہے اور جس کا مطلب ہے چھوٹی گاڑی یا چھوٹا پہیہ صراط صغیر اس فرقے کو اس نام سے زیادہ تر مہایان Mahoyana بدھ پکارتے ہیں۔ مہایان کا مطلب ہے بڑا پہیہ یا بڑی گاڑی یا صراط کبیر۔ مہایان بدھ مت میں بہت کچھ ہندو مت اور تنترامت سے اخذ کیا گیا ہے ان میں متعدد خفیہ اور طلسمی رسومات اور عمل بھی شامل ہیں۔ مہایان فرقے کا خیال ہے کہ ان کا مسلک زیادہ وسیع ہے اس لئے تھیراواد مسلک کے مقابلے میں زیادہ بڑا ہے۔

اس بات کے شواہد موجود ہیں ایک بادشاہ اناوراتھا کے عہد میں برما میں بدھ مت کے دونوں مسالک کے ماننے والے موجود تھے۔ غالباً ۱۰۵۴ اور ۱۰۵۷ کے درمیان جب اناوراتھا نے تھاٹن Thaton میں قائم مون سلطنت کو فتح کر لیا تو تھیراواد مسلک تیزی سے پھولنے پھلنے لگا اور سب سے بڑا مذہب بن گیا۔ اناوراتھا مون علاقے سے جو سب سے زیادہ قابل ذکر مال غنیمت لایا ان میں قیدی بھی تھے اور تھیراواد راہب اور مذہبی کتابیں بھی۔ اس کے بعد پیگن کے لوگوں نے مذہب میں گہری دلچسپی لی اور پکے بدھ بن گئے۔

جب ترقی یافتہ اور مہذب مون لوگوں سے رابطہ قائم ہوا تو اس سے برما کی ثقافت بھی پرمایہ ہو گی۔ پیگن کی بعض ابتدائی اور قدیم عمارات مون کاریگروں اور کارکنوں کی مدد سے بنائی گئیں۔ اسی زمانے میں برمی زبان احاطہ تحریر میں بھی آنے لگی رسم الخط ہندوستان کا اختیار کیا گیا برمی زبان پر مون زبان، پالی اور بدھ مت کی مذہبی کتابوں کی زبان کا گہرا اثر پڑا۔

اناوراتھا کے عہد حکومت میں برما نے بڑی ترقی کی اور برما پر اس عہد کی چھاپ بڑی گہری ہے۔ اس نے وسطی علاقے، شمالی ٹینا سیریم، شمالی اراکان اور شان کے بعض علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کیا اور پہلی بار تین بڑے نسلی گروہوں کو ایک مرکز کے تحت لے آیا اور یوں ایک قوم بنا دی۔ اس کی سرپرستی میں تھیراواد بدھ مسلک کی جڑیں گہری ہوئیں برمی معاشرہ کی تشکیل میں اس مذہب بہت بڑا حصہ ہے۔

۱۰۷۷ء میں اناوراتھا کا بیٹا ساولو Saulu جانشین ہوا مگر اس نوجوان میں باپ والی

تھے۔ بہر طور یہ کوئی یقینی بات بھی نہیں۔ شان لوگوں کا پہلی بار حوالہ بارہویں صدی میں برمی زبان میں پتھروں پر کندہ عبارتوں میں آیا۔

تیرھویں صدی میں منگول سلطنت کی توسیع کے باعث بھاگنے والے تھائی لوگوں کا ریلا برما کی مشرقی سطح مرتفع میں آکر آباد ہوا آج کل اس علاقے کا نام تھائی لینڈ ہے برما کے شان لوگوں نے ایک طرف منگولوں کے غلبے کا مقابلہ شروع کیا دوسری طرف زوال پذیر پیگن سلطنت پر حملے شروع کر دیئے۔

تیرھویں صدی کے آخر اور سولھویں صدی گی پہلی چوتھائی کی درمیانی مدت میں شان وسطی برما پر غالب رہے۔ پیگن کے خاتمے کے بعد شروع میں تین مختلف سلطنتوں میں شان شہزادے حکمران ہوئے۔ لیکن چودھویں صدی کے نصف آخر میں ان سلطنتوں میں سے صرف آوا Ava نام کی سلطنت بچی۔ ہرچند آوا کے حکمرانوں کا تعلق شان قبیلے سے تھا مگر وہاں برمیوں کا اثر رسوخ بہت رہا۔ برمی ادب کو آوا کی سلطنتوں میں بڑا فروغ حاصل ہوا اور اس زبان کے کئی شاہکار اس زمانے میں تخلیق ہوئے۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت مذہبی موضوعات پر بدھ راہبوں کی لکھی ہوئی نظموں کو حاصل ہوئی۔ یہاں بدھ مت بذات خود بہت بڑی طاقت بنا رہا۔

جب پیگن کو زوال آیا تو مون باشندوں نے بھی برمی حکومت کا جوا اتار پھینکا۔ مون شان واریرو Warero نے ۱۲۸۷ء میں ٹینا سیریم کے ساحلی مقام مارتبان میں حکومت قائم کی۔ واریرو غریب خاندان سے ابھرا اور زیریں برما کا حکمران بن گیا۔ لیکن ہمسایہ تھائی لینڈ میں نئی ریاستوں نے مون پر اتنا دباؤ ڈالا کہ وہ مارتبان چھوڑنے پر مجبور ہو گئے اور انہوں نے ۱۳۶۹ء میں پیگو Pegu میں دارالحکومت قائم کیا۔

شاہ یزاڈھرتی Yazadhiriti پیگو میں ۱۳۸۵ء سے ۱۴۲۳ء تک حکمران رہا اس زمانے میں مون اور آوا کی ریاست کے بادشاہ من کھونگ Minkhaung کے درمیان متعدد جنگیں ہوئیں۔ پیگو اور آوا کے درمیان کشمکش میں شان سردار بھی ملوث ہو گئے اور ارکانی بھی ارکانیوں نے برما کے مغربی ساحل پر ریاست قائم کر لی تھی۔ یزاڈھرتی اور من کھونگ کی موت کے بعد دونوں ملکوں میں کشمکش بھی کم ہوتی گئی اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ آوا کو شان سرداروں کی جنگ جویانہ حرکتوں پر زیادہ توجہ دینا پڑ گئی تھی۔

مون ریاست میں کئی عشروں تک امن اور خوشحالی رہی۔ پندرھویں صدی میں دو بڑے حکمران گھرانے ہیں ملکہ شن سابو Shin Saw Bu ۱۴۵۳ء سے ۱۴۷۲ء تک حکمران رہی اور شاہ ڈھمازدی (۹۲ - ۱۴۷۲ء) دونوں زبردست مذہبی تھے اور انہوں نے تھیراواد بدھ مت کے فروغ کے لئے بہت کوشش کی۔ ان کے عہد حکومت میں شویڈاگون Shwedagon کے پگوڈے کی تعمیر اور سجاوٹ پر بڑی توجہ دی گئی۔ اس طور اس کا سنہری دور شروع ہوا۔ شویڈاگون رنگون کے پاس ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ لفظ شویڈاگون کا مطلب ہے "سنہری ڈاگون"۔ ڈاگون مون باشندوں کی آبادی تھی اب اسی جگہ پر رنگون آباد ہے۔ یہ پگوڈا برما کے لوگوں کو انتہائی متبرک اور عزیز ہے۔ اس عظیم پگوڈا سے بہت سی داستانیں بھی وابستہ ہیں۔ روایت کے مطابق پہلا پگوڈا مہاتما بدھ کی زندگی میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کی تصدیق تو نہیں ہو سکتی تاہم یقیناً یہاں پر ایک عمارت موجود تھی جس میں شروع سے ہی مہاتما بدھ کی متبرک یادگار اشیا رکھی گئی تھیں۔ شاہ دھمازدی نے پتھر کے جو کتبے یہاں نصب کیے تھے ان میں بتایا گیا ہے کہ کس طور پر پگوڈا تعمیر کیا گیا تھا اور کس طرح بیگو کے ہر بادشاہ نے اس کی شان و شوکت میں اضافہ کیا تھا۔ شویڈاگون مون باشندوں کی بدھ مت سے وابستگی کی سب سے بڑی علامت ہے۔

بیگو میں دو اور مشہور تاریخی عمارتیں ہیں جو بدھوں کے نزدیک واجب الاحترام ہیں۔ ان میں شویماڈا Shwemawadaw کا پگوڈا اور دوسرا شوتھا لیونگ Shweithelyaung موخرالذکر مہاتما بدھ کا بہت بڑا مجسمہ ہے جو ایک پہلو پر آرام کرتا دکھایا گیا ہے۔ یہ ۵۵ میٹر (۱۸۰ فٹ) لمبا اور ۱۶ میٹر (۵۲ فٹ) اونچا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شویماڈا پگوڈا میں دوسری متبرک اشیاء کے علاوہ مہاتما بدھ کے دو بال بھی رکھے ہوئے ہیں۔ یہ مجسمہ اور یہ پگوڈا شاہ دھمازدی کے عہد سے پہلے بنائے گئے تھے مگر اس نے ان کی اچھی دیکھ بھال کی اور مزید مذہبی یادگاریں یا زیارتیں بھی بنوائیں۔

برما کا مغرب سے پہلا رابطہ پندرھویں صدی میں قائم ہوا۔ شروع میں اطالوی تاجروں نے مون عہد حکومت میں برما والوں سے تجارت شروع کی۔ پرتگال والے بعد میں آئے مگر برما کے معلامات میں ان کا کردار زیادہ بڑا ہے۔ سولھویں صدی کے شروع میں پرتگیزیوں نے ہندوستان اور ملایا میں کوٹھیاں قائم کیں۔ انہوں نے مون شہر مارتبان میں

ثابت ہوا۔ قوم پرست سیاستدانوں نے عوام سے اپیل کی کہ جب تک انگریز برما کو آزاد کرنے کا وعدہ نہیں کرتے انہیں جنگی کارروائیوں میں کوئی مدد نہ دی جائے۔ حکومت نے متعدد قوم پرست راہنما گرفتار کر لئے۔ نوجوانوں کا ایک گروپ خفیہ طور پر برما سے باہر جاپان میں فوجی تربیت لینے چلا گیا۔ اس گروپ کا نام تیس ساتھی (تھرٹی کامریڈز) مشہور ہوا۔ جاپان آزاد اور طاقتور ملک تھا اس نے بیسویں صدی کے شروع میں روس کو شکست دی تھی اس لئے ایشیائی ملکوں میں اس کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ برمیوں کا خیال تھا کہ جاپان والے برما کو آزاد کرا دیں گے۔ آزاد برمی فوج قائم کی گئی جس میں سب سے اہم یہ تیس ساتھی تھے۔ ۱۹۴۱ء میں آزاد برمی فوج جاپانی فوج کے ہمراہ برما میں داخل ہوئی اور انگریزوں کو برما سے نکال دیا گیا۔

برما کے آزاد مملکت ہونے کا اعلان کر دیا گیا لیکن اصل میں ایک غیر ملکی حاکم کی جگہ دوسرے حاکم نے لے لی تھی۔ قابض جاپانی فوج نے بھی برمی عوام کو اپنا محکوم سمجھنا شروع کر دیا۔ حکومت اور انتظامیہ کے اہم عہدے برمیوں کے سپرد کر دیئے گئے اس طور برما کو ایک طرح یہ احساس ہوا کہ اب ان کی اپنی حکومت ہے مگر اصل اور حتمی اختیار اور اقتدار جاپانیوں کے ہاتھ میں تھا۔

آزاد برمی فوج کے کمانڈر انچیف آنگ سان نامی ایک نوجوان تھے وہ طالب علم راہنما تھے اور تیس ساتھیوں میں شامل۔ دوسرے ساتھیوں کی مدد سے انہوں نے جاپانیوں کے خلاف مزاحمت کی تحریک چلا دی اب جنگ کا نقشہ بھی پلٹنے لگا تھا، برطانوی فوجیوں نے برما پر دوبارہ حملے شروع کر دیئے۔ اب جاپانیوں کے خلاف مزاحمت کرنے والی آزاد برمی فوج اور انگریز فوج کے درمیان اتحاد ہو گیا۔ جاپانیوں کو شکست ہو گئی اور ۱۹۴۵ء میں جنگ اختتام کو پہنچی۔

یہ برما کی آزادی کی جدوجہد کا آخر نہیں تھا۔ برما والے نہیں چاہتے تھے کہ انگریز دوبارہ ان کے حاکم بن کر آئیں۔ آنگ سان نے سیاست میں حصہ لینے کے لئے فوج چھوڑ دی تھی اب وہ قوم پرست پارٹی اے ایف پی ایف لیگ کے راہنما تھے یہ پارٹی برما میں انگریزوں کی حاکمیت کی سب سے بڑی مخالف تھی۔ یہ پارٹی ملک کی مقبول ترین جماعت بنتی گئی اور انگریزوں کو برما والوں کے مطالبے ایک ایک کر کے ماننے پڑے۔ انگریز ایک طرف

سکیں گے۔ کیرن باشندوں کے دلوں میں اس بے اعتمادی کا سبب بعض برمی لوگوں کا رویہ بھی تھا مگر انگریزوں اور مشنریوں پر بھی دو نسلی گروپوں میں اختلافات پیدا کرنے کا الزام آتا ہے کیونکہ مشنریوں نے کیرن باشندوں میں زیادہ کام کیا تھا۔

آزادی کے بعد برما میں پارلیمانی جمہوریت قائم ہوئی۔ حکومت نے بغاوتوں پر قابو پالیا اور بڑی حد تک امن قائم ہو گیا تاہم باغیوں کو قابو میں رکھنے کے لئے فوج کو مضبوط کرنا پڑا۔ فوج کے بہت سے بڑے بڑے افسر سیاست میں بھی رہ چکے تھے اس لئے انہیں سرکاری معاملات میں دخل دینے کی آرزو ضرور تھی۔ ۱۹۶۲ء میں کمانڈر انچیف لی ون کی قیادت میں فوجی افسروں نے یونو کی منتخب حکومت کا تختہ الٹ دیا اس وقت سے اب تک برما میں فوج حکمران چلی آرہی اور کئی اعلیٰ فوجی وردی اتار کر بڑے بڑے افسر بنے ہوئے ہیں۔

برما سوشلسٹ پروگرام پارٹی کی راہنمائی میں فوجی حکومت نے برما کو سوشلسٹ جمہوریہ بنا دیا ہے۔ کوئی دوسری پارٹی قائم کرنے کی ممانعت ہے۔ اس قسم کے اقدامات اور لوگوں کی سیاسی آزادیوں کو اس لئے محدود کیا گیا ہے تاکہ حکومت مستحکم ہو اور ملک متحد۔ مگر اتحاد تو صرف لوگوں کے دلی تعاون سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ حکومت کو اب بھی باغیوں سے واسطہ ہے جن میں نمایاں ہیں کیرن، شان اور کمیونسٹ، معاشی معاملات بھی صحیح نہیں ہیں اور آج برما ایک خوشحال ملک نہیں ہے لیکن چونکہ اس کے وسائل بھرپور اور زرخیز ہیں اس لئے بہتر مستقبل کی امید ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ اور مستقبل تو ملک کے عوام کے ہاتھوں میں ہے۔

برما کی اقلیتیں

برما میں نوع بنوع کے لوگ ہیں جن کی زبانوں کی یا بولیوں کی تعداد سو کے قریب ہے لیکن ان سب کا تعلق بنیادی طور پر تین بڑے نسلی گروہوں سے ہے مون کھمیر تبتو برمنز، اور تھائی شان، برمیوں کے علاوہ سات مختلف امتیازی گروپ اتنی تعداد میں ہیں کہ ان کے علاقوں کو بھی مختص کیا گیا ہے یہ ہیں چن، کاچن، کیرن، کیہا، مون، اراکانی (راکھن) اور شان۔

چھوٹے مینڈک بنے ہوتے ہیں اس لئے انہیں مینڈک ڈھول کہا جاتا ہے یہ ڈھول بڑے مشہور اور بہت قیمتی ہوتے ہیں۔

صوبہ کیرن سے ملحق کیاہ Kayah صوبہ ہے۔ پہاڑوں اور آبشاروں نے علاقہ بہت خوبصورت بنا دیا ہے۔ لاپٹا آبشار کے قریب پن بجلی کا بڑا منصوبہ مکمل کیا گیا ہے کیاہ لوگوں کو کیرنیس Kerenis بھی کہا جاتا تھا جس کا مطلب ہے لال کیرن وہ اس لئے کہ ان کے کپڑوں کا رنگ سرخ ہوتا ہے۔ اس صوبہ میں اور نسلوں کے لوگ بھی آباد ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ معروف پاڈونگ Padaung ہیں جن کی عورتوں کو زرافہ کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ ان کی لمبی گردنیں جن پر گول زیور پڑا ہوتا ہے۔ دراصل لڑکی کے دس سال کی عمر تک پہنچنے کے بعد ہر سال ایک چکر اس کی گردن میں ڈال دیا جاتا ہے۔ بعض عورتوں نے بیس یا اس سے بھی زائد یہ رنگ پہن رکھے ہوتے ہیں۔

کیاز چونکہ شان اور کیرن کے درمیان آباد ہیں اس لئے دنوں طرف کی روایات اور رسمیں ان میں پائی جاتی ہیں۔ ان کے سرداروں کے ساؤبیا Saopya کہا جاتا ہے۔ (شان والے ساؤپیا Saopya کہتے ہیں) یہ علاقہ روایتی طور پر پانچ سرداروں میں منقسم تھا جن میں سے دو کی نسلیں دوسری جنگ عظیم سے پہلے ختم ہو گئیں اور باقیوں نے صوبہ شان کی طرح یہاں بھی موروثی حقوق اور مراعات سے دستبرداری اختیار کر لی ہے۔

جس طور کیرن مینڈک ڈھول کو بہت قیمتی شے سمجھتے ہیں اسی طور کیاہ بھی اسے قابل قدر قرار دیتے ہیں۔ یہ ڈھول صرف خوشی کے موقعوں پر بجایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی دوسرے ساز ہیں جن میں سنکھ، ڈھول اور سانس والے ساز شامل ہیں۔ ان میں سے بعض ساز بھینس کے سینگ سے بنائے جاتے ہیں۔ ان لوگوں میں ای یو E- yue والے لوک گیت بہت مقبول ہیں جو نسل در نسل ان تک منتقل ہوئے ہیں۔ ان گیتوں یا نغموں میں دنیا کی آفرینش سے لے کر اب تک کے حالات بیان کیے جاتے ہیں۔ ان گیتوں کے بغور مطالعہ سے ان باشندوں کی تاریخ اور اصل کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

کیرن لوگوں کی طرح کیاہ بھی قدیم زمانے میں ارواح کی پوجا کرتے تھے مگر اب انہوں نے عیسائیت اور بدھ مت اختیار کر لیا ہے۔ لیکن سب سے بڑا میلا یا تیوہار کوہٹوبو Kuhtobo کہلاتا ہے اور یہ بھی اس روح کی یاد میں منایا جاتا ہے جو بارش اور اچھا موسم

بنگالی اور اسلامی اثرات کے باوجود اراکان میں زیادہ تر بدھ مت ہی کا غلبہ رہا۔ روایات کے مطابق برما میں بدھ مت مہاتما بدھ کی زندگی میں ہی مغربی ساحل کے راستے آیا۔ اس کی تصدیق تو نہیں ہو سکتی مگر اراکانیوں نے مہاتما بدھ کا معروف مجسمہ دوسری صدی عیسوی میں بنایا۔ جب شاہ بوڈاپایا کے بیٹے نے اراکان کو فتح کیا تو وہ یہ مجسمہ مہامیامنی Maha Myamuni اپنے ساتھ لے گیا۔ یہ ملک کے بہت ہی مقدس مجسموں میں شمار ہوتا ہے اور مانڈلے میں رکھا گیا ہے۔ اراکانیوں کو اس مجسمے کے چھن جانے کا بڑا دکھ تھا۔ بہر طور اب بھی کئی اراکانیوں کا خیال ہے کہ اصل مہامیامنی تو اراکان سے باہر جا ہی نہیں سکتا تھا وہ یقیناً اراکان کے جنگلوں میں چھپا ہوا ہے۔

اراکان میں بدھ کے بے شمار مندر اور پگوڈے ہیں۔ اراکان والوں کے زیادہ تر تیوہار اور میلے وہی ہیں جو اہل برما کے ہیں اور ان میں بے شمار مماثلت پائی جاتی ہے۔ تاہم اراکان والوں کی رسم برما والوں کے لئے بالکل اجنبی ہے اراکان میں شادی چچیر، میسر پھپھیر یعنی کزنوں کے درمیان پسند کی جاتی ہے۔ غالباً اس کی وجہ اسلامی اثرات ہیں۔

اراکان کے ادب میں بعض شاہکار چیزیں ہیں۔ پندرھویں صدی کے ایک درباری شاعر کی نظم شہزادہ ارکان۔ ای۔جنیین E- gyin اسی قسم کی شاعری (ای جنیین) کی ابتدائی مثال ہے۔ ۱۸۲۶ء میں اراکان پر برطانوی حکمرانی کے بعد پڑھے لکھے طبقے کی زبان انگریزی ہو گئی اور ارکان کے ادب پر زوال آنے لگا۔ آج برما بلکہ پوری دنیا کے لئے ارکان کے ساحل سب سے زیادہ پر کشش سمجھے جاتے ہیں۔

برما والے سطح مرتفع کو بہت ہی خوبصورت اور رومان پرور سرزمین خیال کرتے ہیں۔ معتدل آب وہوا، جھیلوں اور پہاڑیوں نے اسے بڑا دلکش علاقہ بنا دیا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے اکثریت کا تعلق تھائی شان گروپ سے ہے جب کہ تبتو برمنز اور مون کھمیر ادب کے لوگ بھی خاصی تعداد میں ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ کم از کم ستائیس بڑے ضمنی گروپ ہیں جن میں شان Shan، پاؤ Pao، پالونگ Paulaung، کاچن Kachin، انتھا Entha اور ڈانو Danu گروپ شامل ہیں۔

برما کے بادشاہوں کے زمانے میں تو سات صوبے تھے جن کے حکمرانوں کو ساؤفاس (Saophas) کہا جاتا تھا انہیں بادشاہت کی پانچ اشیا یا نشانیاں استعمال کرنے کی اجازت

کے ذریعے پہنچائی جاتی ہیں۔ بھکشوؤں کے گروہ کو سنگھا کہا جاتا ہے۔ چنانچہ مہاتما بدھ، دھرم اور سنگھا تینوں کو تین ہیرے کہا جاتا ہے۔ چونکہ مہاتما بدھ کو بہت بڑا استاد سمجھا جاتا ہے۔ اس لئے برما والے تمام استادوں کا بڑا احترام کرتے ہیں والدین کو بھی محبت، عزت اور احترام کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ اس طرح تین ہیروں میں استاد اور والدین کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور برما کے بدھ ان پانچوں کو لائق احترام گردانتے ہیں۔

تمام اچھے بدھ پانچ مزید نصیحتوں کی پابندی کرتے ہیں۔ کسی کی زندگی نہ لینا، چوری نہ کرنا، زنا نہ کرنا، جھوٹ نہ بولنا اور نشہ نہ کرنا ——— جان نہ لینے والے حکم کا برمی لوگوں پر اس قدر اثر ہے کہ وہ کیڑے مکوڑوں کے پاؤں تلے کچلے جانے کے خوف سے راستہ تک بدل لیتے ہیں اور کچھ گوشت نہیں کھاتے۔ بعض کے نزدیک یہ بدھ تعلیمات کی خلاف ورزی ہے۔ برمی لوگوں کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ خود مہاتما بدھ نے گوشت کھایا تھا۔ بہرطور برمی لوگ زیادہ حقیقت پسند ہیں ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ خوش خرامی سے زندگی گذرانے کے قائل ہیں۔

برما کے تیوہار اور میلے بھی بدھ تاریخ کے واقعات سے متعلق ہیں۔ میلوں کے دن برمی کیلنڈر (قمری کیلنڈر) کے مطابق متعین کیے جاتے ہیں۔ بدھوں کے خاص دن چودھویں والے چاند کے دن آتے ہیں۔ کاسوں Kason ، واسو Waso (جون جولائی) اور تھیڈنگیوٹ Thidingyut (اکتوبر نومبر) خاص دن ہیں۔ کاسون مہاتما بدھ کی پیدائش، گیان اور برسی منانے کے لئے مخصوص ہے۔ مہاتما بدھ کو جو گیان حاصل ہوا اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے تمام جھوٹے اعتقادات سے آزاد ہو کر آخری سچائی کا راستہ دیکھ لیا اور یہ گیان بودھی یا بڑھ کے ایک درخت کے نیچے حاصل ہوا۔ چنانچہ اس روز لوگ بڑھ کے درختوں کو پانی دیتے ہیں۔

واسو کے پورے چاند کے موقع پر بھی مہاتما بدھ کی زندگی کے دوسرے واقعات خصوصاً ان کے پہلے واعظ کے حوالے سے تقریبات ہوتی ہیں، پہلے وعظ میں مہاتما بدھ نے اس سچائی کا ذکر کیا تھا جو انہیں حاصل ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اس روز سے بدھ کے چلے کا بھی آغاز ہوتا ہے جو تین مہینے تک جاری رہتا ہے۔ ان تین مہینوں میں بھکشوؤں کو سفر کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ چلے کے دوران مقدس دنوں میں اکثر بدھ پیروکار آٹھوں

کے آٹھوں احکامات پر عمل کرتے ہیں۔ یہ مقدس دن یوں ہیں چاند کے بغیر دن، چاند کی آٹھویں، چاند کی چودھویں پھر باقی کی آٹھویں۔ آٹھ احکامات دراصل پانچ بنیادی احکامات میں سے چار کا حصہ ہیں (نہ مارنا، قتل نہ کرنا، چوری نہ کرنا، جھوٹ نہ بولنا اور نشہ نہ کرنا) ان کے ساتھ ساتھ چار ممنوعات بھی ہیں، کسی غیر اخلاقی فعل کا مرتکب نہیں ہونا، دن کے بارہ بجے کے بعد روزہ یا کچھ کھانا نہیں، موسیقی رقص اور خوشبو سے اجتناب اور اونچی جگہ (یعنی آرام دہ بستر اور پلنگ وغیرہ) پر نہ سونا، بعض راسخ العقیدہ بدھ چلے کے پورے تین ماہ ان آٹھ ممنوعات پر عمل کرتے ہیں۔ دراصل چلے سے یہ مراد ہوتی ہے کہ اس عرصے میں لوگ گیان دھیان کریں اور اپنی اخلاقی بلندی کا خیال کریں۔ اس عرصے میں بدھوں کو شادی کرنے کی بھی اجازت نہیں۔ شادی کے سبب خاندانی زندگی شروع ہوتی ہے اور اس طور دنیا سے وابستگی بڑھ جاتی ہے۔ یوں نردان حاصل کرنے کا عمل اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

اکتوبر چلے کے ختم ہونے کا بھی مہینہ ہے اور برسات کے خاتمے کا بھی۔ یہ موج منانے کے دن ہیں۔ روایت ہے کہ مہاتما بدھ نے Tavatisma آسمانوں پر اپنی ماں کو اپنے مت کی تبلیغ کرنے کے لئے ایک چلہ کاٹا۔ (مہاتما بدھ کی ماں بدھ کے پیدا ہوتے ہی مر گئی تھی اور پھر بدھ مت کے اگلے جہانوں کے آسمانوں یا جنتوں میں سے ٹاواٹمسا میں پیدا ہوئی) چلہ کاٹنے کے بعد وہ واپس زمین پر آگئے اور لوگوں نے چراغاں کر کے ان کا استقبال کیا۔ اس مراقبہ کی یاد میں تین روزہ میلہ تھڈنگیوٹ Thidingynt ہوتا ہے ان تین دنوں میں پگوڈوں، خانقاہوں اور گھروں میں چراغاں کیا جاتا ہے۔ یہ موقع دراصل بزرگ اور عمر رسیدہ لوگوں سے بہتر سلوک سے بھی مختص ہے۔ اکثر برمی اس موقع پر اپنے بوڑھے دوستوں اور رشتہ داروں سے ملنے جاتے ہیں ان کے سامنے احتراماً جھکتے ہیں اور انہیں تحائف پیش کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا مذہبی تقریبات کے علاوہ بدھ مذہب کے کچھ اور میلے بھی ہوتے ہیں۔ بعض پگوڈوں کے اپنے میلے بھی ہوتے ہیں۔ سب سے بڑا میلہ رنگون کے شویڈاگون کے پگوڈا کا ہوتا ہے۔ یہ مارچ کے مہینے میں منعقد ہوتا ہے۔ شویڈاگون پگوڈا ایک سو میٹر (تین سو فٹ) کی بلندی پر ہے جو سونے کے ٹھوس ورقوں سے ڈھکا ہوا ہے اس کے اوپر سونے کی

برما کے ڈرامہ میں جو مغربی نغماتی اوپیرا سے کچھ کچھ ملتا جلتا ہے گانا بھی ہوتا ہے اور ڈرامائی نقل و حرکت بھی، دراصل اس پر بھی اٹھارہویں صدی میں تھائی لینڈ کے دربار کے ڈرامے کی چھاپ ہے۔ یامازات Yamazat قسم کے ڈرامے جو ہندوستان کی معروف رزمیہ نظم رامائن سے ماخوذ ہیں بار بار کھیلے جاتے ہیں۔ انیسویں صدی میں برما میں بھی بہت اچھے ڈراما نگار پیدا ہوئے جن کے ڈرامے آج بھی مقبول ہیں۔ ڈانس ڈرامہ ہمیشہ آرکسٹرا کے ساتھ کھیلا جاتا ہے۔ برما کے ساز پانچ قسم کے ہیں۔ کانسی کے تار والے۔ چمڑے والے، کھوکھلے ہوا کے اور دھات کے بغیر تیار کیے جو دوسرے سازوں کو آس دیتے ہیں۔ برما کی آرکسٹرا والی موسیقی میں بڑا تنوع ہے۔ یہ انتہائی کومل سروں سے لے کر گھن گرج والی اٹھان تک کو پیش کر سکتی ہے یہ گھن گرج والا آرکیسٹرا کی تقریب میں ضرور ہوتا ہے۔ آرکسٹر کا سب سے نمایاں ساز سینوینگ Hsainwaing کہلاتا ہے۔ یہ چمڑے کے اکیس چھوٹے ڈھول سے ہوتے ہیں، سازندے کمال مہارت کے ساتھ انہیں بجاتے ہیں۔ جو آرکسٹرا کے عین درمیان میں بیٹھ کر فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ایک اور ساز جو برما سے مخصوص ہے خمدار ستار جیسا ہوتا ہے جو سازندہ اپنی گود میں رکھ کر بجاتا ہے۔ کلاسیکل موسیقی ہمیشہ پوے Pwe کی تقریب پر ضرور پیش کی جاتی ہے مگر نوجوانوں میں خصوصاً یورپی اثرات کے تحت جدید موسیقی زیادہ مقبول ہونے لگی ہے۔ بہرطور برما کی موسیقی اور رقص کی روایات بھی بہت پرانی ہیں اور حکومت بھی ان کی سرپرستی کرتی ہے۔ اس لئے بدلتی ہوئی صورتوں کے باوجود ان کے (کلاسیکل موسیقی اور ڈانس) کے معدوم ہو جانے کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔

تفریح کا ایک اور وسیلہ پتلیوں کا تماشا بھی تھا مگر اس کی مقبولیت بہت کم ہو گئی ہے۔ یہ تماشہ اٹھارہویں صدی کے آخر یا انیسویں صدی کے شروع میں شاہی دربار کی تفریح طبع کے لئے پیش کیا گیا تھا۔ ایک تماشے میں اٹھائیس کردار ہوتے ہیں جو بھوت پریت یا روحوں نٹ Nats، ایک بادشاہ۔ ایک ملکہ۔ کئی درباریوں، جانوروں اور پرندوں پر مشتمل ہیں۔ مختلف پتلیاں بنانے کے لئے مختلف قسم کی لکڑی استعمال کی جاتی ہے اس کے علاوہ اس کھیل کے کچھ اور ضابطے ہیں مثلاً پتلیاں کس حساب سے سٹیج پر آئیں گی اور پھر ان سے کون سا ہاتھ کام لے گا۔ پتلی کا تماشہ دراصل ایک خاص قسم کی مہارت چاہتا ہے مگر افسوس کا مقام

جاتا تھا اسے بدھ مت کی اقدار کے فروغ کا وسیلہ بھی جانا جاتا تھا۔ جدید زمانے کے تقاضوں کے باعث اب تعلیم پر اور بھی زور دیا جانے لگا ہے تاہم والدین اب بھی یہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے اچھے بدھ بنیں۔

برما میں خاندان کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے، بچوں کو اپنے بزرگوں اور بڑوں کا احترام کرنا سکھایا جاتا ہے۔ برما میں یہ بات ایمان کی حد تک درست ہے کہ والدین نے بچوں کو جو محبت اور حسن سلوک دیا ہوتا ہے اس کا کوئی اجر ہے ہی نہیں۔ برمیوں کو یہ بات بتائی جاتی ہے کہ ہر چند بدھ نے اپنی ماں کو نروان دلایا تھا، مگر یہ نروان اس کا عشر عشیر بھی نہیں جو ماں نے بدھ کو دیا۔

خاندان اور خاندانی زندگی کی اتنی دیرینہ روایات کے باوجود برمیوں میں ناموں کے سلسلہ میں خاندانی نام کی روایت نہیں ہے۔ ہر مرد یا عورت کا اپنا الگ نام ہوتا ہے۔ جو خاندان کے باقی افراد سے قطعی مختلف ہوتا ہے۔ عورتیں بھی شادی کے بعد اپنا نام تبدیل نہیں کرتیں، مثلاً باپ کا نام یوتھئن ماں کا ڈاساٹن Daw Saw Tin ، بیٹے کا نام مونگ ٹن آئی Maung Tun Iye اور بیٹی کا نام ماکھن کھن Maw Khin Khin ہو سکتا ہے۔ یو۔ ڈا۔ مونگ۔ اور ما در اصل لقب ہیں جیسے مسٹر اور مسز (جناب و بیگم) برما میں عمر کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور اس اعتبار سے ہی ناموں کے ساتھ لقب بھی لگائے جاتے ہیں۔ یو U کا لغوی معنی چچا کے ہیں۔ جب ڈا Daw خالہ، چچی، پھوپھی کو کہا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ القاب کم عمر لوگوں کے لئے استعمال نہیں ہوتے۔ مونگ Maung کے معنی ہیں چھوٹا بھائی یہ اس وقت تک استعمال ہوتا ہے جب تک وہ جوان نہیں ہو جاتا اس کے بعد Maung مونگ کی جگہ کو Ko لے لیتا ہے جس کا مطلب ہے بڑا بھائی۔ لڑکیوں کے لئے ما Ma کا لفظ برتا جاتا ہے جس کا مطلب ہے بہن۔ بعض اوقات مرتبہ یا پوزیشن کے مطابق کسی فرد کو خطاب کیا جاتا ہے۔ جس نوجوان نے بڑی جلدی کوئی اعلیٰ مقام حاصل کر لیا ہو اسے یو U بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک بزرگ شخص کو جس کا سماجی مرتبہ چھوٹا ہے کو یا مونگ (بڑا یا چھوٹا بھائی) بھی کہا جاتا ہے۔

ایک شخص کے سماجی مرتبے کا اندازہ اس بات سے لگایا جاتا ہے کہ اسے کس قدر

برماوالے عموماً میٹھا کم ہی کھاتے ہیں۔ البتہ گرم اور مسالے دار چیزیں (سنیکس) انہیں زیادہ بھاتی ہیں۔ پڈنگ کی بجائے عموماً پھل استعمال ہوتا ہے۔ مغربی ایشیا کے دوسرے ممالک کی طرح برما میں بھی آم بہت پسندیدہ پھل ہے۔ آم کی بہت سی قسمیں پائی جاتی ہیں اور برماوالوں نے بھی اس کے کھانے کے نئے نئے ڈھنگ تیار کیے ہیں۔ چھوٹے سبز آم نگاپی (مچھلی کا لیپ) لگا کر کھانے کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں یا نمک مرچ کے محلول میں ڈبو کر نقل کیے جاتے ہیں۔ بڑے مگر نیم پختہ آموں کا سالن بنایا جاتا ہے۔ لیکن ان سب کے مقابلے میں میٹھے اور پکے آم کی لذت کا جواب ہی نہیں۔

سبز چائے کا استعمال برما میں بہت عام ہے۔ دودھ اور چینی والی چائے بھی پی جاتی ہے مگر اسے کچھ اس طرح سے ابالا جاتا ہے کہ کوئی پردیسی نہیں پہچان سکتا کہ واقعی یہ چائے ہے۔ بدھ ہونے کے باعث برمی لوگ شراب پر بہت ناک بھوں چڑھاتے ہیں مگر مقامی طور پر پام سے بڑی تیز شراب بنائی جاتی ہے۔ ان دنوں مغربی طرز کی بیئر بھی تیار کی جاتی ہے۔

بات چیت میں بھی کھانا بہت بڑا موضوع ہوتا ہے۔ جب دوستوں رشتہ داروں میں ملاقات ہوتی ہے تو ایک دوسرے سے اس موضوع پر بات ہوتی ہے کہ تم نے دوپہر کیا کھایا اور رات کیا کھاؤ گے۔ کھانے کے اس شوق کے سبب کھانا پکانے اور کھانے کی قسموں میں برما دنیا میں بڑی شہرت رکھتا ہے۔

برما میں زن و مرد لونگی (لنگی) باندھتے یا پہنتے ہیں۔ مرد لنگیوں کے اوپر مغربی طرز کی قمیص اور عورتیں چھوٹے فٹ ٹاپس (چولی) پہنتی ہیں۔ نوجوان لڑکیاں اب مغربی طرز کے بلاؤز اور ٹی شرٹس پہنتی ہیں۔ خاص خاص موقعوں پر مرد بغیر کالر کی قمیضیں ان پر چھوٹی جیکٹ یا واسکٹ اور سروں پر پگڑی پہنتے ہیں جسے گونگ بونگ Gaung baung کہا جاتا ہے۔ برما میں عورتوں مردوں میں لمبے بال رکھنے کا رواج ہے۔ چنانچہ ان مواقع پر مرد لوگوں نے بھی اپنے کالے چمکدار بالوں میں یاسمین کے سفید خوشبودار پھولوں کے جوڑے سجائے ہوتے ہیں۔ مردوں نے انگریزوں کے زمانے میں بال کٹوانے شروع کیے۔ لیکن اب بھی دیہات میں ایسے مرد نظر آتے ہیں جنہوں نے اپنے لمبے بال گوندھ رکھے ہوتے ہیں۔ عورتیں اب بھی بال لمبے ہی رکھتی ہیں۔ تاہم کچھ عرصہ سے لڑکیوں نے فیشن ایبل

نظر آنے کے لئے مغربی انداز میں چھوٹے بال رکھنے شروع کیے ہیں۔

برمی عورتوں کا کھلتا ہوا رنگ بھلا لگتا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں کچھ کمال تھناکھا Thanakha کا ہے۔ یہ ایک لیپ ہے جو تھناکھا کے درخت کی چھال پیس کر بنایا جاتا ہے۔ اس سے ایک تو دھوپ کے اثرات سے بچاؤ ہتا ہے دوسرے اس میں کچھ طبی فائدے بھی ہیں۔ یہ لیپ پیلے سے بیج رنگ کا ہوتا ہے جب یہ منہ پر لگایا جاتا ہے تو یوں لگتا ہے کہ کیچڑ مل دیا گیا ہو۔ اس کے باوجود آج بھی برمی عورتوں میں خوبصورت بننے کے لئے اس کا استعمال عام ہے۔ حتیٰ کہ سنگھار کے جدید سامان (کاسمیٹکس) کے باوجود تھناکھا کی مقبولیت کم نہیں ہوئی۔

دوسرے ایشیائی ممالک کی طرح برما میں بھی مغرب کی بنی اشیا کی بڑی مانگ ہے۔ کتابوں، فلموں اور باہر سے آنے والوں کے حوالے سے مغربی طرز فکر اور رویئے بھی برما میں آئے ہیں۔ موجودہ حکومت کی پالیسی کے مطابق سیاحوں کو ایک وقت میں صرف ایک ہفتہ قیام کی اجازت ہے۔ اس طرح غیر ملکی اثرات سے کچھ بچاؤ ہو جاتا ہے۔ ویسے بھی اکثر جنوب مشرقی ایشیائی ممالک کے مقابلے میں برما میں اپنی ثقافت اور روایات کا بہتر طریق سے تحفظ کیا گیا ہے۔ برما کے لوگوں کے لئے بیرون ملک جانے کی کم گنجائش رکھی گئی۔ اسی طرح باہر سے آنے والوں کو خاص پابندیوں کے تحت اجازت دی جاتی ہے۔ یوں برما باقی دنیا سے تھوڑا سا کٹا ہوا اور تنہا نظر آتا ہے۔ اس کے خود ساختہ علیحدگی یا تنہائی کے سبب بعض برمیوں کے نزدیک غیر ملکی اشیاء ایک طرح سے "شجر ممنوع" قرار پا کر ان کی خواہش کو بڑھا دیتی ہیں۔ اس پابندی کے باعث برما سائنٹیفک اور ٹیکنالوجی کی تعلیم و تربیت میں بھی پیچھے رہ گیا ہے۔

بعض برما والوں کے لئے مغربی سازو سامان اور ثقافت میں چاہے جس قدر بھی کشش موجود ہو ان کی روزمرہ کی زندگی پر آج بھی بدھ مت کا بہت اثر ہے۔ نوجوان جوٹی شرٹیں پہنتے اور مغرب کی پاپ میوزک شوق سے سنتے ہیں اکثر پگوڈوں میں بھی جاتے ہیں۔ برما والوں کو مذہبی زندگی معاشرتی زندگی سے الگ نہیں۔ برما والوں کے بڑے اجتماع یا تقریبات بھی مذہبی موقعوں پر ہوتے ہیں اور سب سے عام تقریب تو سنگوے hsoongway ہے اس موقع پر بھکشوؤں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ بہت سے دوست مدد کو

جاتا ہے بڑا مشہور ہے۔ اس کام کے بعض بہترین نمونے شویڈاگون کے فرش عبادت میں نظر آتے ہیں۔

بدھ کے مجسمے لکڑی، سنگ مرمر یا کانسی سے بنائے جاتے ہیں۔ بعض بہترین مجسمے مانڈلے اور نواحی دیہات میں بنائے جاتے ہیں۔ ان مجسموں کی فروخت ہمیشہ ہی بہت زیادہ رہی ہے کیونکہ لوگ نئے نئے مندر بناتے رہتے ہیں یا موجود مندروں میں اضافہ کرتے ہیں۔ برما والوں کو ماضی میں کبھی قدیم مجسمے جمع کرنے کا شوق نہیں رہا تصور یہ کیا جاتا ہے کہ یہ مجسمے کسی پگوڈا یا خانقاہ سے لئے گئے ہوں گے انہیں گھر میں رکھنا کسی عذاب کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ تاہم مغرب والوں نے جس طور پرانی اشیاء کو قدر و قیمت بڑھا دی ہے۔ اس کا اثر برما والوں پر بھی پڑ رہا ہے۔ اب پرانے قیمتی مجسموں کی سمگلنگ کوئی انہونی بات نہیں رہی۔ سمگل کیے گئے مجسمے اور دوسرے سامان کی نکاسی تھائی لینڈ کی سرحد کے راستے ہوتی ہے۔

لاکھ سے برتن بنانے کا فن برما میں بہت مقبول ہے۔ عموماً یہ خیال ہے کہ یہ فن چین میں پیدا ہوا اور برما میں اس کا رواج اس وقت ہوا جب اناوراتھا کی فوج تھاٹن سے واپسی پر مون کاریگر بھی ساتھ لے آئی۔ برما میں یہ فن چین اور جاپان کے مقابلے میں تھوڑا سا مختلف ہے۔ وہاں لاکھ ایک درخت میلن ہوروِیا یوسیٹاٹا Melan horroea usitata کی مختلف قسموں سے حاصل کی جاتی ہے۔ اس درخت کا رس نکال کر ایک خاص قسم کی راکھ میں ملایا جاتا ہے پھر اسے لکڑی، بنے گئے بانسوں یا بانس اور گھوڑے کے بالوں سے بنائی گئی اشیاء پر لگایا جاتا ہے۔ رنگ والی لاکھ لگانے سے پہلے بہت سا مواد سطح کو ہموار کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

لاکھ کے سجاوٹ والے برتن اور اشیاء کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ مشہور وہ ہیں جن پر سونے کا پانی یا ورق چڑھتا ہے۔ سطح پر ابھرے ہوئے نقش ہوتے ہیں یا کندہ کاری کی گئی ہوتی ہے۔ کندہ کاری والی اشیا کی اوپر کی سطح پر نقش یا نمونہ کندہ کیا جاتا ہے پھر اس ڈیزائن کے اندر رنگ والی لاکھ لگائی جاتی ہے زیادہ تر سرخ، کالا سبز اور پیلا رنگ استعمال ہوتا ہے۔ سونے کے پانی یا ورق والی شے پر ڈیزائن کے پس منظر میں کالا رنگ ہوتا ہے۔ اور کندہ کاری والی اشیا میں لاکھ میں راکھ، لکڑی کا برادہ استعمال ہوتا ہے تاکہ نقش سطح سے اوپر ابھر

ممالک کی فکری تحریکوں میں بڑھ گئی جہاں نو آبادتی حکمرانی رہی۔ چنانچہ برما کے ساتھ بڑی تفصیل سے تقابلی مطالعہ کے لئے مجھے بہترین مثال ہندوستان کی نظر آئی۔ اس لئے کہ دونوں ملک کئی عشروں تک انگریزوں کی ایک سی انتظامیہ کے زیرنگیں رہے اور پھر دونوں ملکوں نے دریں اثنا اپنا اپنا منفرد کردار قائم رکھا۔ برما کے دروازے شروع تاریخ سے ہی ہندوستان کے مذہبی اثرات کے لئے کھلے تھے۔ ان اثرات میں سب سے اہم بدھ مت ہے اور یہ برما کے لوگوں کی زندگی میں ناقابل شکست حصہ بن گیا کہ برمیوں کے بارے میں کہا جانے لگا "برمی ہو تو لازمی بدھ بھی ہو"۔ ہندوستان کے یہ ثقافتی اور مذہبی اثرات تھے جو برما نے اپنی مرضی سے اپنائے اور پھر انہیں اس طور اپنے معاشرے کا حصہ بنایا کہ دونوں معاشروں (برمی اور ہندوستان) میں ان کے بارے میں فرق بھی قائم ہوتا گیا۔ جب تک انگریز آیا تھا اس وقت تک ہندوستان کے برما پر اثرات مستحکم ہو چکے تھے بلکہ بعض کے بارے میں تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ بہت ہی پکے ہو چکے تھے اور یوں برما کی ثقافتی انفرادیت کا سبب بن چکے تھے۔ یوں برما اور ہندوستان کی فکری روایات کا تقابل کرتے ہوئے یہ بات سامنے رکھنی چاہیئے کہ بدھ مت کے تصورات اور افکار آئے تو ہندوستان سے تھے مگر اب انہیں بجا طور پر ہندوستان کے ہندو رویوں سے سراسر پاک سمجھا جانا چاہیئے۔

برما کے ساتھ ساتھ ہندوستان کو تقابل کا مطالعہ کے لئے منتخب کرنے سے کچھ اور مشکلیں بھی پیش آتی ہیں اور یہ مشکلات تقابلی مطالعے کے لئے معاملات کے انتخاب کی ہیں۔ برصغیر کے علم و ادب کے سارے شعبوں پر اگر توجہ دی جائے تو اس کے لئے کئی ضخیم کتابوں سے بھی بات نہیں بنے گی اس لئے یہ چھوٹی سی کتاب سارے قصے کی متحمل ہو ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ میں نے صرف ان پہلوؤں کا انتخاب کیا ہے جو برما میں فکری ارتقا سے مطابقت رکھتے ہیں۔ ضرورت سے زیادہ عمومیت اور معاملہ کو ضرورت سے زیادہ سیدھا سمجھنے کی غلطیوں سے بچا نہیں جا سکتا اور ان کا میں نے شروع میں ذکر کر دیا تھا۔ تاہم توقع کی جا سکتی ہے کہ تقابلی طریق کی دروں بینی کے سبب ان میں کسی حد تک ایک توازن قائم ہو جائے۔ یہ بات بھی واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ یہ مطالعہ زیادہ تر قیاس پر مبنی ہے. میں نے ممکن تشریحات اور تعبیریں پیش کر دی ہیں مگر مجھے اصرار نہیں کہ یہی تعبیریں حرف آخر ہیں۔

I

ہندوستان اور برما جن زمانوں اور حالات میں برطانوی سلطنت کا حصہ بنے وہ بہت مختلف قسم کے تھے۔ یہ ممکن نہیں کہ انگریزوں کے ہندوستان پر فتح پانے کا حال تاریخ وار درج کیا جائے جہاں یہ کام پوری دو صدیوں میں ہوا آغاز اس وقت ہوا جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۸۵۸ء میں اپنی فیکٹریوں کے اردگرد کی آبادیوں کا انتظامی کنٹرول سنبھال لیا اور وکٹوریہ کو یہاں کی بھی ملکہ بنا دیا گیا۔ جبکہ برما پر انگریزوں کا کنٹرول تین واضح مرحلوں میں ہوا جو نصف صدی سے زیادہ عرصہ پر محیط ہیں۔ ۶ - ۱۸۲۴ء کی اینگلو برمی جنگ کے بعد اراکان اور ٹینا سریم برطانوی سلطنت کا حصہ بنے۔ دوسری اینگلو برمی جنگ ۱۸۵۲ء میں ہوئی جس کے بعد پیگو کا صوبہ انگریزوں کے زیر اقتدار آیا اور آخر میں تیسری اینگلو برمی جنگ جو ۱۸۸۵ء میں ہوئی جب پورا ملک برطانوی سلطنت کا حصہ بن گیا اور برما میں بادشاہی ختم ہو گئی۔ برما کے لوگوں کے لئے یہ اپنے ماضی سے بڑا افسوس ناک انقطاع تھا جس کی برمی تاریخ میں کوئی مثال نہیں تھی۔ اگرچہ برما کا ماضی پر شور اور اکثر خراب بھی رہا مگر بہرطور وہ برما کے تسلیم شدہ نظام کا ناقابل تقسیم حصہ تھا۔

پہلی دو جنگوں کے بعد برما کے برطانوی سلطنت سے الحاق کے سبب برما والوں کی عزت تو کم ہو گئی ان کے اعتماد کو زیادہ ضعف نہیں پہنچا تھا۔ وہ آج کے برما کے وسطی خشک منطقے میں آباد تھے اور ہر چند بدھ مت میں یقین رکھتے تھے مگر ایسی عسکری روایات بھی رکھتے تھے جن کے تحت انہوں نے قابل بادشاہوں کی راہ نمائی میں اپنی سرحدوں میں اضافے بھی کیے۔ مضبوط حکمرانوں کے عہد میں انہوں نے جنوب میں مون. مشرق میں شان اور مغربی ساحل پر اراکان کو بھی برما کا حصہ بنالیا۔ بعض اوقات وہ منی پور، آسام اور تھائی لینڈ میں بھی جابرا جمان ہوئے۔ حکمران کا آخری خاندان اپنے بانی الونگ پایا کی عسکری جی داری کے باعث تخت حاصل کر سکا اس نے ۱۷۵۷ء میں مون سے زیریں برما چھینا. اس کے بیٹے بوڈا پایا Boda Paya نے ۱۷۸۹ء میں اراکان پر قبضہ کر لیا۔ چنانچہ جب ٹینا سریم اراکان اور پیگو کے صوبوں پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا تو بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے

جس کے سہارے وہ دوسرے مذاہب کے چیلنج کا بڑی شان سے مقابلہ کر سکتے تھے۔ مذہب سے ہٹ کر دوسرے پہلو پر نظر ڈالی جائے تو لگتا ہے کہ برما کے حکمران ہر چند انتظام و انصرام میں کمزور تھے مگر میدان جنگ میں انہوں نے بڑا نام کمایا۔ ان کی طاقت اور شاہانہ کروفر کا جنوب مشرقی ایشیا میں شہرہ تھا، تب برما کا بادشاہ اپنے آپ کو برطانیہ کی ملکہ کے برابر سمجھتا تھا۔ اور اس کا یہ دعویٰ ایسا بے جا بھی نہیں تھا بجز ان لوگوں کے جو قرون وسطیٰ کی ایک بادشاہت کو مغربی صنعتی انقلاب کے بعد ابھرنے والی قوموں کے حوالے سے جانچتے ہیں۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ برما کے عین درمیان میں بیٹھے حکمرانوں نے باہر دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں پر آنکھیں بند کر رکھی تھیں، سمندر سے دور تھے نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ تیسری اینگلو برمی جنگ نے انہیں ہلا کر رکھ دیا انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ سیاسی اعتبار سے انہیں فتح کیا جا رہا ہے تو اس کا سدباب کیا ہے، سیاسی ہزیمت کے بعد ثقافتی غلامی بھی شروع ہو گئی۔ مانڈلے کی فتح کے چار پانچ ماہ بعد تک خود انگریزوں کا ذہن بھی صاف نہیں تھا کہ اپنی نئی نو آبادی کے ساتھ کیا کریں مگر ۱۸۸۶ء کے شروع ہوتے ہی انہوں نے داؤ چلا دیا اور ووڈرف Woodruff نے The Men who raided India میں لکھا "برما ہندوستان کے مقابلے میں انتہائی مختلف ملک ہے مگر حالات کی ستم ظریفی نے اسے ہندوستانی سلطنت کا تتمہ بنا دیا ہے۔"

انیسویں صدی کے آخر میں سامراجیوں کا رویہ سخت ہوا۔ انگریزوں نے اپنے آپ کو دنیا کا اول درجے کا شہری سمجھنا شروع کیا اور اس حیثیت سے بدنصیب ملکوں کی تقدیر بنانے کا کلی حق بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"اب برطانیہ والے اپنی نو آبادیوں کی مقامی تہذیبوں اور ثقافتوں کے مقابلے میں اپنا ایک قسم کا تہذیبی بیج بھی برآمد کر رہے تھے جس کی پشت پر مضبوط انتظامیہ بھی تھی۔ بعض اوقات یہ پالیسی شعوری سطح پر ہوتی لیکن اکثر جبلتی، یا اتفاقی طور پر۔ بہر طور برطانیہ والے اگر معاملہ سمجھتے تو اسے ایک تاریخی جبر ہی قرار دیتے۔

"مقامی ثقافت کی طرف سے اس حملہ کے خلاف مختلف نوعیت کے

ردعمل ہوئے۔ مثلاً ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی تہذیبوں نے مغربی کلچر کو ایک عارضی صورت حال قرار دے کر لچک تو پیدا کی مگر وہ ٹوٹی نہیں جبکہ برما والوں کی طرح بعض نے اس کا نوٹس ہی نہیں لیا۔"

ہندوستان والوں کا لچک پیدا کرنے کا رویہ فلسفیانہ اور عملی سطح پر بہت پرانا ہے جو انہوں نے متعدد حملہ آوروں کے آنے کے بعد اختیار کیا۔ اس اعتبار سے وہ برما کے مقابلے میں نو آبادتی حاکموں کی لائی گئی تبدیلیوں سے نمٹنے کے لئے بہتر پوزیشن میں تھے۔ لیکن انگریزوں نے ہندوستان میں بھی ماضی سے تعلق کو کئی طرح سے توڑا اور متعدد نئی تبدیلیاں کیں۔ مسلمان حملہ آوروں نے ہندوستان کو اپنا گھر بنالیا تھا، ان کے اور ہندوؤں کے درمیان ایک نمایاں سرحد تو کھنچی رہی مگر وہ برصغیر کا اٹوٹ انگ بن گئے تھے۔ یہ برطانیہ کے لئے ہندوستان اولاً ایک دور دراز کی منڈی تھی مگر واقعات و حالات نے ایسا رخ اختیار کیا کہ وہ ان کی نو آبادی بن گیا جس پر ایک پیچ دار مگر غیر شخصی نوکر شاہی کے ذریعے حکومت کی گئی۔ شاید ہی کسی انگریز کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا کہ زندگی کا اتنا طویل عرصہ یہاں گزارنے کے بعد وہ یہاں ہی بس جائے گا۔ مقامی لوگوں سے علیحدگی کا یہ احساس سٹیم بوٹ کے ایجاد ہونے اور نہر سویز کے کھلنے کے بعد اور بھی بڑھ گیا اس طرح انگریز عورتوں نے بھی ہندوستان میں آکر مردوں کی دلجوئی شروع کر دی اور مرد انگریزوں کو مثالی لوگوں سے جن پر وہ حکومت کرتے تھے اور دور کر دیا۔

انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان دوری کی سب سے بڑی اور واحد وجہ ۱۸۵۷ء کی کشمکش تھی۔ جسے انگریز "سپاہیوں کی بغاوت" یا غدر کہتے تھے اور ہندوستانی کارل مارکس اور اینگلز کے الفاظ میں آزادی کے لئے ہندوستانیوں کی پہلی جنگ قرار دیتے ہیں۔ اس جنگ کے درمیان جو ظلم و ستم ہوا اس سے ایک تو نسلی امتیاز کا احساس بڑھا. آپس میں شک اور دوری بڑھی، کدورت بڑھی، اور یہ عناصر وکٹورین سامراج کے دور عروج میں تیزی سے اپنا کام دکھانے لگے۔ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان افتراق کی سب سے بڑی وجہ نسلی فرق ہے۔ مسلمان حکمرانوں نے بھی مغرور فاتحین، جیسا رویہ اپنایا اور مذہبی تشدد اور ایذا رسانی کے بھی مرتکب ہوئے مگر رنگ و نسل کے اعتبار سے انہوں نے اپنے آپ کو ہندوؤں سے برتر ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ایک ہندوستانی صحافی کے

الفاظ میں

"بلاشبہ رنگ کا امتیاز ہندوستانیوں میں بھی ہے مگر اس کا ایسا جارحانہ اظہار وہ ہرگز نہیں کرتے جیسا اکثر یورپین باشندے افریقیوں اور ایشیائیوں کے بارے میں کرتے ہیں۔ لگتا ہے کہ یورپینوں کی نظر میں رنگ کا خاص معاشرتی مفہوم ہے۔ کل تک اس کا سیاسی مفہوم بھی تھا اور وہ یہ کہ رنگدار سیاستدان یورپینوں کا سیاسی طور پر محتاج اور سماجی طور پر اس سے کم تر درجے کا مالک ہے۔"

Frank Maraes

Witness to an Era: India 1920 to Present Day

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے شروع میں سفید فام لوگوں میں نسلی برتری کا احساس اس قدر نہیں تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب طول طویل سفر کے بعد آنے والے سفید فام کو اپنے بیوی بچوں کے بغیر کئی سال تک مقامی لوگوں کے ساتھ رہنا پڑتا تھا، مقامی لوگوں سے رابطے کے لئے انہیں ہندوستانیوں سے ہی کام لینا پڑتا تھا اور جب انگریز کا مقامی عورت کے ساتھ طویل عرصے تک تعلقات رکھنا بھی کوئی عجوبہ نہ تھا۔ اٹھارہویں صدی آزاد خیالی (لبرل ازم) کا زمانہ تھا۔ ہندوستان میں ایسے خیالات و عقائد در آمد کئے گئے جو ہندو عقائد کے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ چیلنج ہی ہندوستانیوں میں فکری، سماجی اور مذہبی تحریکوں اور سوچ فکر اور عمل کا موجب بنے یوں ہندوستان کی نشاۃ الثانیہ شروع ہوئی۔ یہ تحریک ہندوستان میں نو آبادتی دور میں ہندوستانیوں کی فکر اور طریق کار کو متاثر کرتی رہی۔

انیسویں صدی کے ہندوستان کو ایک ایسا ملک قرار دیا گیا ہے جس میں بے اتفاقی، عدم اتحاد، کاہلی، کفر، تشکیک، لامذہبیت اور جھوٹے مذہب، علمی نمائش پسندی، غلامی، اندرون بینی، اجنبی سختی، اور انسان سے غیر انسانی سلوک جیسی بیماریاں موجود تھیں ۔ شاید یہ کسی حد تک مبالغہ آرائی ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ اس وقت ہندوؤں کے مذہب اور اخلاقیات کا ایک اٹوٹ حصہ ایسی رسومات ہی تھیں جو غیر انسانی تھیں مثلاً ستی کی رسم، بچپن میں شادی اور چھوت چھات۔ یہ چیزیں سیاسی ترقی پسندی اور انسانی قدروں سے براہ راست

ٹکراتی تھیں۔ ہندومت صرف ایک مذہب ہی نہیں بلکہ ایک معاشرتی نظام یا فلسفہ بھی تھا جو ہندوستان کے اکثریتی لوگوں کی زندگیوں میں سرائت کئے ہوئے تھا چنانچہ جو لوگ حالات میں اصلاح کے قائل تھے لامحالہ انہوں نے پرانی ہندو مذہبی کتابوں کی نئی تشریح اور تعبیر کرنا شروع کی۔

رام موہن رائے کو ہندوستانی نشاۃ الثانیہ کا جد امجد سمجھا جاتا ہے اس نے اپنے ایک دوست کو لکھا۔ "موجودہ ہندومت ہندوؤں کے سیاسی مفادات کے لئے قطعی مناسب نہیں۔ میرے خیال میں کم از کم ان کے سیاسی فوائد اور معاشرتی مفادات کے لئے ضروری ہے کہ ان کے مذہب میں کچھ تبدیلیاں لائی جائیں۔"

رائے ۱۷۷۱ء میں ایک برہمن گھرانے میں پیدا ہوا اس میں ایک مصلح بننے کی تمام خوبیاں موجود تھیں۔ سوچنے والا دماغ، چست فکر، وسیع المشربی، نئی بات کرنے سوچنے کا حوصلہ اور کئی زبانوں پر قدرت۔ اس کے مالی وسائل بھی خاصے تھے یہ سب ان افراد کا اثاثہ ہوتا ہے جو معاشرہ میں اصلاحات لایا کرتے ہیں۔ رائے نے معاشرتی اور مذہبی میدان میں جو بڑا کام کیا وہ ہے برہمو سماج کی بنیاد رکھنا۔ برہمو سماج کی بنیاد ویدوں اور اپنشدوں پر رکھی گئی، ہرچند یہ مذہبی تنظیم تھی مگر اس میں بت پرستی ترک کی گئی اور مسیحی مذہب کی کچھ اخلاقیات کو اس میں شامل کیا گیا۔

رام موہن رائے نے ہندوستانی نشاۃ الثانیہ کی نیو رکھ دی جو دراصل کوشش تھی ہندوستان کے کلاسیکل ورثے کو بچانے کے طریقے ڈھونڈنے اور اپنانے کی تاکہ یہ اپنا جوہر اور شناخت کھوئے بغیر نئی اور اجنبی یلغاروں کا مقابلہ بھی کرے اور تیزی سے تبدیل ہوتی ہوئی سوسائٹی کے تقاضے بھی پورے کر سکے، جن لوگوں نے رائے کی اس نشاۃ الثانیہ کو پوری انیسویں صدی اور پھر بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں تک ایک مضبوط اور موثر تحریک بنا دیا ان میں کیشب چندر سین، سوامی دیانند، آئی سی ودیا ساگر، ایم سی رانا رے، جی کے گوکھلے، سری رام کرشن اور اس کے بڑے چیلے سوامی دویکانند، اور د۔بندو گھوش، بنکم چندر چیٹرجی اور رابندر ناتھ ٹیگور بھی شامل تھے۔ ان مفکرین میں سے اکثر اس بات کو اہم قرار دیتے تھے کہ اصلاحات کا مذہبی، سماجی اور سیاسی روپ ساتھ ساتھ چلنا چاہئے۔ ان میں سے کچھ ایک پہلو پر زیادہ زور دیتے اور کچھ دوسرے پہلو کو اولیں سمجھتے

جبکہ کچھ ان دونوں پہلوؤں میں ایک توازن قائم کرنے کے قائل تھے۔ طریقوں اور اندازوں میں اختلاف کے باوجود بنیادی مقصد سبھی کا یہی تھا کہ شناخت ضائع کیے بغیر ہندوستان کی جدید حالات سے ہم آہنگی پیدا کی جائے۔

جب ہندوستانی دانشور اپنے ملک کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے مغرب سے در آمد شدہ خیالات و افکار کو جاننے، جذب کرنے اور ان کے مطابق نئی فکر دینے میں مصروف تھے اس وقت برما کے دانشور ادائی طرز فکر میں ڈوبے ہوئے تھے اور ماضی میں الونگ پایا کے خاندان کون کونگ Kon Cang کی فوجی کامیابیوں کی ترنگ میں خود کو بہت محفوظ سمجھتے تھے۔ اٹھارہویں صدی کے آخری نصف اور انیسویں صدی میں برمی لٹریچر بڑا پھلا پھولا، اس دوران پرانی اصناف کو مزید بنایا سنوارا گیا اور جدید موضوعات کو کلاسیکی سانچے میں ڈھالا گیا۔ ۱۷۶۹ء میں تھائی لینڈ کی فتح کے بعد وہاں سے جو مال غنیمت لایا گیا اس میں ڈرامے بھی شامل تھے۔ یہ صنف سب سے پہلے دربار سے وابستہ اہل علم و ادب میں مقبول ہوئی اور پھر برما کے عوام میں اسے ہر دلعزیزی حاصل ہوئی۔ شاہ بوڈا پایا ۱۷۸۱ء میں تخت نشین ہوا اس نے ہندوستان سے سنسکرت کی کتابیں (ڈرامے) منگوائیں۔ ہندوستان اور تھائی لینڈ سے در آمد کی گئی یہ باتیں کوئی ایسی عجوبہ بھی نہ تھیں لیکن ہمسایہ ممالک سے آنے والے ان فن پاروں نے برما کی تہذیب کو تقویت اور سرمایہ دیا۔ اٹھارہویں صدی کی سماجی آزادہ روی کی روح اور عقلی تشکیک نے ہندوستان میں نشاۃ الثانیہ کا پودا لگایا اور پھر اس کا اثر برما میں آگیا جو اب بھی اپنی روایات پر زیادہ نازاں تھا۔

ہندوستانی دانشوروں کی ہندو ورثے پر توجہ مرکوز کرانے میں ولیم جونز Walliam Jones اور میکس مولر Max Muller جیسے مستشرقین کا بھی بڑا حصہ ہے۔ ولیم جونز نے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال بنائی۔ دونوں سنسکرت کے پرانے مخطوطوں اور کتابوں کے مطالعے اور تحقیق کو بہت بڑا علمی مرتبہ دیتے تھے۔ ان کے تراجم سے ان بے شمار ہندوستانیوں نے بھی استفادہ کیا جنہوں نے اپنے ورثے سے آگاہ ہونے کے لئے سنسکرت نہیں پڑھی تھی۔

برما میں برطانوی منتظمین کی ایسی کوئی خواہش یا ضرورت نہیں تھی کہ وہ برما کے کلاسیکل علم و ادب کو علمی اہمیت دیں یا کم از کم انہیں اس قابل سمجھیں کہ ان کا نوٹس ہی

لے لیں۔ رنگون کالج ۱۸۷۳ء میں قائم کیا گیا اور اس کو کلکتہ یونیورسٹی سے منسلک کر دیا گیا۔ اس کے نصاب میں برمی زبان کی تدریس شامل نہیں تھی۔ کالج میں پالی زبان پڑھائی جاتی تھی مگر پالی زبان میں زیادہ تر لٹریچر بدھ مت سے متعلق تھا۔ جس کا منبع ہندوستان کی سرزمین تھی۔ بہرطور برما میں بھی مذہبی تحقیق و تدریس کے سلسلے میں وہی واردات ہوئی جو ہندوستان میں گذری تھی یعنی انہیں اپنے ہی عملی سرمائے کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں تھا۔

فکری تجسس اور تفتیش کا میدان بڑا تنگ تھا۔ بزرگوں کے سائے میں جوان ہونے یا لکیر کے فقیر بنے رہنے کے باعث برما کے دانشوروں میں نہ نئی اور اپنی سوچ تھی اور نہ ہی موجود نظام فکر یا کتابوں کی باتوں کی حقیقت جاننے کے لئے سوال کرنے کی ہمت۔ ایک عالم کی تمام تر تگ و تاز موجود کتابوں کی تشریح اور تفسیر یا موجود شرح کی وضاحتوں تک محدود تھی جو عہد حاضر کے سربر آوردہ دانشور کی نظر میں اکثر شرح در شرح بن جاتی تھی۔"

زیریں برما میں انگریزوں کے آنے کے بعد برمی لوگوں کو کوئی بیرونی ترغیب بھی نہیں دی گئی کہ وہ نئے حالات کی روشنی میں اپنے ادبی ورثے کا جائزہ لیں۔ مانڈلے کا بادشاہ روایتی تعلیم و تدریس کے روایتی طریق کی ہی سرپرستی کرتا رہا اسے اس نظام کو لاحق کوئی فوری خطرہ بھی نظر نہیں آیا۔ حتیٰ کہ ۱۹۳۰ء میں چاول کی تجارت کے فروغ کے باعث شاہ کی سلطنت سے بے شمار برمی باشندے نقل مکانی کر کے برطانوی علاقے میں جا بسے تب بھی برمیوں کو یہ خیال رہا کہ ایک غیر ملکی طاقت کی موجودگی کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

برما کے لوگوں کی دلجمعی یا اطمینان کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ برما کے معاشرے میں بلاوجہ کی ایسی پابندیاں اور مضر رسومات نہیں تھیں جو ہندومت میں تھیں چنانچہ ان کے خلاف ہندو کالج کلکتہ کے انقلاب پسندوں نے بغاوت کر کے گائے کا گوشت اور بیر (بڑ اینڈ بیف) کے نام سے ایک کلب بنایا اور مذہب کو سربسر ترک کر دیا تھا۔ اپنی رسومات کے باعث دوسروں کے دل میں اصلاح کرنے اور مذہبی میراث کو نئے انداز سے تقویت دینے کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس کے مقابلے میں برمی معاشرہ میں بدھ مت حلول کئے ہوئے تھا بدھ مت

میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جو عقل و فکر سے مطابقت نہ رکھتی ہو اور معاشرہ بھی معاشی ناانصافیوں سے پاک تھا۔ اس میں نہ تو چھوت چھات تھی اور نہ ہی سکہ بند طبقات۔ برما کی عورتوں کو جو حقوق اور مراعات حاصل تھیں ان پر برطانیہ کی خواتین کو بھی یہ رشک آتا ہو گا۔ ملک کے کونے کونے میں پھیلی خانقاہوں کے سبب کم از کم بچوں کی ابتدائی خواندگی کی شرح خاص اونچی تھی۔ بدھ مت کی تعلیمات کے ساتھ مافوق الفطرت لوک کہانیوں کا بہت بڑا خزانہ بھی تھا جن میں سے بعض کہانیاں ماقبل بدھ کے زمانے کی بھی تھیں۔ ان کہانیوں کے ذریعے بھی سننے والوں میں بدی اور حجاب کم ہی پیدا ہوتے۔ برما شہروں کا نہیں دیہات کا ملک تھا اور اس کا حکمران بادشاہ ہوتا تھا جو دور دراز علاقوں میں انتظامات کے لئے گورنر یا دوسرے کارندے مقرر کرتا تھا چنانچہ برمی دیہات کی معاشرتی زندگی ایسی خوبصورت تصویر پیش کرتی تھی کہ ایک پرانے انگریز افسر فیلڈنگ ہال کو کہنا پڑا

> "برما میں صرف اقتدار اعلیٰ اور بڑے افسر بہت برے تھے، صرف سیاسی نظام کے منتظمین کمزور اور بدعنوان تھے۔ باقی سب کچھ بہترین تھا۔ قوانین، سیلف گورنمنٹ اور عوام کے معاشرتی حالات قابل تعریف تھے۔ یہ معاملات اس قدر اچھے تھے کہ سڑی بسی مرکزی حکومت نہ بھی ہوتی تو لوگوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اور اگر اس معاشرے پر باہر سے حملہ نہ کیا جاتا تو یہ معاشرتی نظام طویل عرصے تک بخوبی چل سکتا تھا۔"

The Sort of People- (1909) :

تلک ۱۸۹۹ء میں برما آیا اور وہ بھی برما کے معاشرتی نظام کو دیکھ کر حیران رہ گیا گر اس سے بھی اس نے اپنے نظریات کو مضبوط کرنے کی دلیل حاصل کی کہ معاشرتی نظام اور اس میں اصلاحات کے مقابلے میں سیاسی عمل مختلف اور زیادہ اہم ہے۔

> "ہندوستان کے بعض اچھے لوگ ہر وقت یہ راگ الاپتے رہتے ہیں کہ سیاسی اصلاحات سے پہلے معاشرتی اصلاحات نافذ کی جائیں مثلاً چھوت چھات اور طبقاتی امتیاز کا خاتمہ، مذہبی آزادی، عورتوں کی تعلیم، مناسب عمر میں شادی، بیوہ کی شادی، طلاق کا نظام وغیرہ۔ ہندوستان کے ایک صوبے برما میں یہ معاشرتی صورتیں عملاً موجود رہیں لیکن برما کے لوگوں کو اپنے

برٹش برما کے لوگ صرف پولیس ریونیو اور عدالت کے حوالے سے برطانوی حکومت کو جانتے ہیں اور یہ شناسائی بہت ہی کم ہے۔ بلاشبہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ انگریزوں نے اپنے آنے سے پہلے قائم حکومت کے مقابلے میں ایک زیادہ بہتر اور معتدل قسم کی حکومت قائم کر دی ہے۔ لیکن بہت ہی کم یورپی باشندے برمی زبان بول سکتے ہیں، پھر یورپین لوگ اتنی تعداد میں برما میں موجود ہی نہیں، نتیجہ یہ ہے کہ زراعت پیشہ عوام کو برطانوی حکومت کی اس خواہش کا علم ہی نہیں کہ وہ انہیں پڑھا لکھا کر ان کا تہذیبی معیار بلند کرنا چاہتی ہے۔ یہ خیال ان تک کیسے پہنچایا جائے؟ ان کو حکومت کی اس خواہش سے کیسے آگاہ کیا جائے؟ میرا جواب یہ ہے کہ لوگوں کو اس حقیقت کا احساس دلانے کے لئے ہر ضلع میں ایک یا ایک سے زائد مڈل سکول کھولے جائیں جو ایسی جگہوں پر ہوں جہاں ان پر موثر طریق سے کنٹرول کیا جا سکے. یعنی جہاں پر کوئی یورپی افسر رہتا ہو یا ہیڈ کوارٹر ہو. وقت کے ساتھ ساتھ یہ سکول علم بھی پھیلائیں گے اور علم حاصل کرنے کی خواہش کو بھی تیز کریں گے، ان سکولوں کے ذریعے لوگوں کو یہ علم بھی ہو گا کہ حکومت مقامی لوگوں کو پڑھانا چاہتی ہے۔ میں ایک دم سارے ملک میں اتنے سارے سکول نہیں کھولوں گا مگر آہستہ آہستہ اور مناسب موقع ملتے ہی.......... تعلیم دینے کا طریقہ اینگلو ورنیکلر ہو گا لازمی ذریعہ تعلیم تو انگریزی ہو گی مگر برمی کو بھی بالکل نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔ بندرگاہ اور دوسرے متعدد مقامات کے لوگوں میں انگریزی سیکھنے کی خواہش پیدا ہو رہی ہے اس لئے مجھے اندازہ ہے کہ مقامی لوگوں کو مقامی ضرورتوں کے مطابق ہی انگریزی پڑھائی جانی چاہئے......

میں نے اس امداد کا بھی ذکر کر دیا ہے جو مشنریوں کی مدد سے قائم کئے گئے دیہی سکولوں کو دی گئی ہے۔ ان سکولوں کے علاوہ اس قسم کا کوئی سکول نہیں صرف بدھ مت کی خانقاہوں میں درس گاہیں ہیں، میرے خیال میں ہم کچھ عرصہ بعد ان خانقاہوں میں دی جانے والی تعلیم کا معیار بھی بہتر کر سکیں گے۔ اندرون ملک زراعت سے وابستہ لوگوں کو اچھی تعلیم دلانے کے لئے مجھے اس منصوبے سے زیادہ بہتر اور قابل عمل طریقہ نظر نہیں آتا۔ "

U. Kang A Survey of the history of Education in Burma bef-ore the British conquest and after-- Appendix I.

کام اس طبقے کے سپرد کر دیا جائے گا۔" --Selections from Education Records- Part I 1781-1839

اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پھیرے Phyre کے تعلیم کے بارے میں نظریات زیادہ ہمدردانہ اور زیادہ سیدھے سادے ہیں۔ وہ برما کے لوگوں کو تعلیم کے ذریعے یہ بتانا چاہتا تھا کہ حکومت کو ان کا خیال ہے اور وہ انہیں مزید مہذب اور ترقی یافتہ بنانا چاہتی ہے۔ معاملات کو آہستہ آہستہ چلایا جانا چاہئے۔ موجودہ خانقاہی نظام تعلیم کو ہرگز زیادہ نہ چھیڑا جائے۔ پھیڑے نے یہ بھی مانا کہ بندرگاہوں میں انگریزی سیکھنے کی خواہش موجود ہے جہاں زیادہ تر باہر سے آنے والے آباد ہیں اور برمی کم ہیں۔ لیکن ایسی صورت میں بھی وہ برمی زبان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتا تھا پھیڑے صرف یہ چاہتا تھا کہ لوگوں کو اچھی تعلیم دینے کے لئے سکول قائم کئے جائیں۔

میکالے کی تحریر میں گھن گرج اور شان و شوکت زیادہ ہے، اس کے ساتھ ساتھ انداز حاکمانہ ہے۔ لوگوں کو زیادہ تہذیب یافتہ بنانے کے بارے میں بھی وہ سوچتا ہے لیکن اس کے نزدیک فوری ضرورت ایک ایسا طبقہ بنانے کی تھی جو انگریزوں کو ہندوستان پر حکومت کرنے میں مدد دے سکے۔ اس سیاق و سباق میں انگریزی زبان کی عظمت کی بات تو سمجھ میں آتی ہے مگر اس کے ذریعے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں انگریزی یا سنسکرت کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانے کے سلسلے میں دونوں کی خوبیوں خرابیوں پر مباحثہ بھی ہوتا تھا بلکہ یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ انیسویں صدی میں انگریزی نے ہندوستان میں بڑی اہم حیثیت حاصل کر لی تھی۔ میکالے کی تحریر سے کم و بیش دس سال پیشتر رام موہن رائے نے لارڈ ایمہریسٹ Amberst کو مقامی یا مشرقی طریق تعلیم کے خلاف لکھ کر دلائل دیئے۔ رام موہن رائے نے لکھا "سنسکرت زبان اس قدر مشکل ہے کہ اسے سیکھنے کے لئے ایک عمر درکار ہے۔ یہی زبان علم کی ترویج کی راہ میں ایک طویل عرصے تک سب سے افسوسناک رکاوٹ بنی رہی ہے۔" رائے نے خود عربی، فارسی اور سنسکرت میں تعلیم حاصل کی تھی۔ مغربی تعلیم کی حمایت دراصل اس کے عقیدے کا حصہ تھی۔ رائے نے انگریزی زبان خاصی دیر بعد سیکھی اور وہ بھی ضرورت کے تحت لیکن اسے جلد ہی احساس ہو گیا کہ اس زبان کے ذریعے ہندوستانیوں کو فکر و خیال اور عملی ترقی حاصل ہو سکتی ہے۔ رام موہن رائے کے

بعد کی نسل کا ودیا ساگر سنسکرت کا بڑا عالم تھا جو نظام تعلیم میں انگریزی زبان کی اہمیت کا قائل تھا تاہم وہ مشرقی علوم اور طریق تعلیم میں ایک توازن بھی چاہتا تھا اور یہ بھی کہ مقامی زبانوں کو ترقی دینے کے لئے انگریزی سے مدد لی جائے۔ سنسکرت کے عالموں کی اعلیٰ اور بامحاورہ انگریزی اور ادب سیکھنے سے پہلے اعلیٰ بامحاورہ اور موثر بنگالی بنانا زیادہ ضروری ہے۔ صرف انگریزی جاننے والے عالم اپنے خیالات کا اظہار اعلیٰ اور بامحاورہ بنگالی میں نہیں کر سکیں گے۔ وریا ساگر ان طرح ساز لوگوں میں سے تھے جنہوں نے مقامی زبانوں کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے کی اہمیت کو جانا اور اس ضمن میں اس نے جو کوششیں کیں انہیں کی بنا پر انہیں بابائے بنگالی کہا جاتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ وہ میکالے کے نظریئے پر عمل کر کے مقامی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے کے قابل بنانے میں کوشاں تھے۔

پھیٹرے نے برما کے لئے جو تعلیمی منصوبہ بنایا اس میں یہ بات رکھی کہ مقامی زبان کو مرکزی کردار ادا کرنا ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس سلسلے میں ۱۸۵۴ء کے ایجوکیشن ڈسپیچ سے متاثر ہوا ہو جس میں یہ تسلیم کیا گیا تھا کہ ہندوستان میں تعلیم عام کرنے کے لئے مقامی زبانوں کی حوصلہ افزائی ضروری ہے۔ اور غالباً یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے اندازہ ہو گیا ہو کہ برما میں پہلے ہی ایک زبان موجود ہے جس کے ذریعے تعلیم کا دائرہ زیادہ سے زیادہ وسیع کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کی طرح برما میں بہت سی زبانیں اور بولیاں یا لہجے موجود ہیں لیکن مجموعی طور پر صرف برمی زبان ہی قومی درجہ رکھنے کی دعویدار تھی اس کے مقابلے میں کسی دوسری زبان میں اتنا لٹریچر نہیں تھا۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ جب شان بادشاہ وسطی برما پر حکومت کرتے تھے اس وقت بھی برمی زبان کا ہی غلبہ رہا۔ ۱۸۶۴ء میں پھیٹرے جن علاقوں کا حاکم تھا وہ اراکانیوں اور مون کے علاقے تھے مگر پھیٹرے نے جس زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی تجویز دی وہ برمی تھی۔ ۱۸۶۵ء میں برطانوی برما میں ورنیکلر تعلیم کے عنوان کی یادداشت میں اس نے لکھا۔

"ـــــ برطانوی برما کی تین چوتھائی آبادی کی مادری زبان برمی ہے۔
چنانچہ لوگوں میں تعلیم عام کرنے کے لئے منصوبے کی بنیاد اس بات پر رکھنا ہوگی کہ برمی زبان ذریعہ تعلیم ہوگی اس کے بعد دوسری زبانیں بولنے والوں کے علاقوں میں انہی کی زبان میں تعلیم یا اہتمام کیا جا سکے گا ـــــ" U.

Kaung- Appondix III

واضح رہے کہ اراکانیوں کا تعلق تبتو برمنز Tibeto- Burmans سے ہے اس لئے ان کی زبان کو قدیم برمی بھی کہا جاسکتا ہے۔ مون کا تعلق کھمیر نسل سے ہے ان کی زبان برمی زبان سے خاصی مختلف ہے۔ تاہم ان دونوں میں زمانہ قدیم سے باہمی ربط و ضبط چلا آرہا ہے۔ جنوب میں برمی زبان کو غلبہ تب سے حاصل ہے جب سے اس علاقے کو بار بار فتح کیا گیا خصوصاً جب ٹونگو خاندان نے تقریباً ایک صدی تک پیگو کو دارالحکومت بنائے رکھا۔

زمانہ قدیم سے بدھ خانقاہیں ہی برما کے لوگوں کے سکول تھے۔ لفظ سکول کے لئے برمی میں کیونگ Kyaung کا لفظ ہے جس کا اصل معنی ہے خانقاہ۔ تب سے اب تک سکول اور خانقاہ دونوں اداروں کے لئے یہی لفظ استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ مذہب اور تعلیم میں رشتہ بہت مضبوط تھا۔ جو کتابیں یا مواد پڑھایا جاتا تھا وہ نظم میں ہوتا۔ زبان برمی یا پالی ہوتی اور اس پر چھاپ مذہب یا اخلاق کی ہوتی۔ زیادہ تر بچے پڑھنے لکھنے کی سوجھ بوجھ حاصل کرنے کے بعد سکول چھوڑ دیتے ان میں کئی لکھنے پڑھنے کی مشق نہ کرنے کے باعث جو سیکھا ہوتا وہ بھی بھول جاتے۔ جو ذہین ہوتے وہ پڑھتے رہتے اور ان میں سے کئی ایک خود بھکشو بن جاتے۔ برما کے تمام نوعمر بچے زندگی میں کم از کم ایک بار ضرور مذہبی تربیت حاصل کرتے اس عمر (بارہ تیرہ سے سترہ اٹھارہ تک) میں وہ بھکشو بننے کی پہلی سیڑھی چڑھتے۔ پھر یوں ہوتا کہ بعض بچے عمر بھر کے لئے نہ سہی کئی سالوں تک بھکشو بنے رہتے۔ اس طرح کے بھکشو اگر جلد ہی اپنی عام زندگی میں لوٹ آتے تو نیک نام نہ کہلاتے مگر بھکشو طویل عرصے تک خانقاہ میں پالی کی کتابیں پڑھتے ان کے حافظ بن جاتے اور اپنے علم میں وسعت پیدا کرتے لوگ ان کے بڑے معترف ہوتے۔

قدیم برمی نظام تعلیم میں قیاس کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بدھ مت کو مکمل فلسفہ حیات سمجھا جاتا تھے اور یہ خیال برمی لوگوں کی روح کا حصہ بن چکا تھا۔ چنانچہ اس علم یا فلسفہ کو نہ تو آگے بڑھانے کے بارے میں سوچا جاتا تھا اور نہ ہی نئے فلسفوں کی جانکاری کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بدھ کی تعلیمات میں ہرچند رواداری بڑی اہمیت رکھتی ہے لیکن وہ یک لنگی واحد بن گیا۔ سرحدیں تو وسیع تھیں مگر ان میں

لچک کوئی نہیں تھی۔ مذہبی اختلافات بھی کوئی خاص نہیں تھے اور جو تھے بھی تو وہ خانقاہی ضابطوں کے بارے میں ہوتے تھے جسے ونایا Vinaye کہا جاتا ہے۔ اس طرح اثر پڑتا کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق عبادت گاہ یعنی خانقاہ بدل لیتے۔ لیکن یہ ترجیحات بھی تمام بھکشوؤں کی عزت واحترام میں فرق نہ آنے دیتیں کیونکہ لوگوں کی نظر میں سب بھکشو مہاتما بدھ کی تعلیمات کو عام کرنے کا مقدس فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی بہت بڑی اقلیت کے باوجود ہندو ازم میں برما کے بدھ مت کے مقابلے میں زیادہ فرقے یا مسلک تھے۔ دیوی دیوتا بہت ہیں۔ عبادت کرنے کے جدا جدا کئی ڈھنگ ہیں۔ فلسفہ بڑا پرپیچ ہے اور اسے سنتوں اور عالموں نے اپنی اپنی تعبیروں اور تشریحوں کے باعث مزید پیچیدہ بنا دیا ہے۔ اس انتشار یا رنگارنگی کا جواز یہ تلاش کر لیا گیا ہے کہ اصلاً لفظ ہندو مذہب کی نہیں جغرافیائی اصطلاح ہے جس سے مراد وہ لوگ ہیں جو وادئ سندھ میں رہتے تھے اور انہیں کوئی نام نہیں دیا جا سکا تھا۔ ہندو مذہب کے سلسلے میں اگر یہ بات نہ مانی جائے تو متبادل صورت یوں ہوگی کہ کسی نتیجے یا آخری نتیجہ تک پہنچنے کے لئے کم از کم نصف عمر اس موضوع پر تفتیش و تحقیق میں گزار دی جائے۔ خوش قسمتی سے اس کتاب کی تیاری کے لئے موخرالذکر دشوار گزار راستہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف اس بات کی طرف اشارہ کر دینا بہت ہے کہ ہندوستان میں مذہبی قیاس نئی چیز نہیں۔ اسی مذہبی قیاس نے بدھ، وردھرمانہ مہاویر، Varotdharmana Mahavir ناگ، ارجن، کبیر اور رام کرشن پرم ہسا کو پیدا کیا، یہ چند زیادہ معروف روحانی لوگوں میں سے ہیں ورنہ ان کے علاوہ اور کئی مسلک پیدا کرنے والے بھی گذرے ہیں حیرت ہے کہ ہندو مت اپنی تنگ دامنی اور حجابات کے باوجود بہت لچک دار مذہب ہے۔ یہی لچک تھی جس کی بنا پر ہندوستانی نشاۃ الثانیہ کے مفکر برطانوی حکمرانی میں فکر و دانش اور فلسفہ کے حوالے سے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوئے۔

نراد سی چودھری بنگالی نشاۃ الثانیہ کا آخری صحیح وارث ہے۔ اس کا خیال ہے کہ مغربی طرز حکومت افکار اور کلچر کے باعث جو تبدیلیاں آئیں اور ان کے بارے میں ہندوؤں کی طرف سے جو بھی ردعمل ہوا ہندوستانی دانش ور اپنی تحریروں میں انہی کے بارے میں مندرجہ ذیل سوالوں کا جواب دیتے رہے ہیں۔ یا یوں کہ ان کی تحریریں مندرجہ ذیل

والوں کے بارے میں اس کا خیال ہوا کہ وہ خوش باش، کھلے، بے پرواہ، اور بچگانہ قسم کے لوگ ہیں جن کے بارے میں گہرے فلسفیانہ انداز میں سوچنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے جواب میں برمی لوگوں نے بھی یہی سوچا کہ انگریزوں سے صرف واجبی مگر ضروری تعلق ہی رہنا چاہئے جو ایک حاکم اور رعایا کے درمیان ہوتا ہے۔ سو ہندوستان اور برما کے درمیان کس قدر فرق تھا، ہندوستان میں تو انگریز بھی معاملہ کو بڑی سنجیدگی سے لے رہا تھا اور جواب میں ہندوستانی بھی معاملات کو عقل و دانش کی سطح پر سمجھنے کی گہری خواہش رکھتا تھا اور اس کے سبب مغربی سانچے میں ڈھلے دانش ور اور فلاسفروں کا حلقہ پیدا ہو رہا تھا۔ یہ درست ہے کہ پوری آبادی میں یہ طبقہ بہت ہی چھوٹا سا تھا لیکن اوپر والے طبقے پر اس کا اثر بڑا گہرا تھا اور اس طبقے نے مستقبل کے لیڈروں کے لئے دروازے کھول دیئے جنہیں بیسویں صدی میں آکر تحریک آزادی کو پورے عروج پر پہنچانا تھا۔

II

جب نو آبادتی حکومت برما میں زیادہ مضبوط ہو گئی تو پھر برما والوں کو بھی تساہل چھوڑنا پڑا۔ ایشیا اور افریقہ کے دوسرے نو آبادتی ممالک کی طرح برما والوں کو بھی آخر کار ماننا پڑا کہ جن کو برطانوی حکومت کی نوکری کرنا ہے انہیں انگریزی بھی سیکھنا پڑے گی اور مغربی طرز کی تعلیم بھی کسی نہ کسی حد تک اپنانا ہو گی۔ قدرتی بات تھی کہ زیریں برما بالائی برما کے مقابلے میں ترقی کر رہا تھا ماڈرن ہو رہا تھا اور اراکان کے کئی لوگ وہ پہلے برمی شمار ہوتے ہیں جنہوں نے نو آبادی طریق تعلیم سے استفادہ شروع کیا۔ اور یہ بات بھی تو ہو سکتی ہے کہ اراکان اور بنگال کے درمیان تاریخی طور پر ثقافتی اور بعض اوقات سیاسی تعلقات بھی رہے ہیں چنانچہ ممکن ہے اراکانیوں میں غیر ملکی اثرات قبول کرنے کی استطاعت زیادہ ہو گئی ہو۔ اراکان اور مون ایک ہی وقت انگریزوں کے زیر نگیں آئے تھے مگر اراکان نے جس تیزی سے انگریزی تعلیم یافتہ افراد پیدا کئے مون نے ان کے مقابلے میں بہت کم انگریزی خواں پیدا کئے۔ زیریں برما میں ایک اور نسلی گروہ کیرن کا تھا انہوں نے بھی عیسائی مشنریوں کے اثر کو تیزی سے قبول کیا جبکہ یہ مشنریاں انگریزی عہد اقتدار میں بڑھتی چلی گئیں۔ عیسائیت قبول کرنے کے بعد اکثر نے مشنری تعلیم بھی حاصل کی اور پھر جدید تعلیم یافتہ طبقے

کے طور پر ابھرنے لگے۔

مقامی لوگوں کے علاوہ دوسرے ممالک سے آئے آباد کار جدید تعلیم حاصل کرنے کے زیادہ آرزومند تھے۔ برطانوی پالیسی کے تحت ایسے تجارتی اور پیشہ ورانہ کاموں کے لئے چینیوں اور ہندوستانیوں کے برما میں آنے کی حوصلہ افزائی کی گئی جو زراعت پیشہ برمی نہیں کر سکتے تھے۔ برما میں اور زمین زیر کاشت لانے سے مزید نئے مزدوروں کی ضرورت پڑی اور یہ مزدور ہندوستان نے فراہم کئے۔ اب برمیوں کو نہ صرف حاکم انگریزوں سے بلکہ چینی اور ہندوستانی لوگوں کی روز افزوں تعداد سے بھی خطرہ محسوس ہونے لگا۔ ان غیر ملکیوں (چینیوں اور ہندوستانیوں) نے برما کی معاشی ترقی میں اہم کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔ غیروں کی اتنی بڑی تعداد بے روک ٹوک چلی آئی تھی جو برما کی روائتی معاشرے کی توڑ پھوڑ کرنے کا بڑا سبب بنی۔ توڑ پھوڑ کا دوسرا سبب مستعد حکومت تھی جو اس معاشرے میں تیزی سے تبدیلیاں لا رہی تھیں جو عرصے سے سماجی رسوم و رواج کے مربوط نظام میں رہ رہا تھا۔ اب برمیوں کے لئے لاپرواہی اور تساہل کی کوئی گنجائش باقی نہیں تھی۔ اب انہیں جوابی کارروائی کی ضرورت محسوس ہونے لگی اب انہیں یہ بھی فیصلہ کرنا تھا کہ جوابی کارروائی کے لئے کون سے ہتھیار استعمال کئے جائیں روائتی یا جدید؟

برما کے بادشاہ اپنے دارالحکومت کو کائنات کا مرکز تصور کیا کرتے تھے اور جن عالم فاضل لوگوں کو ترقی اور شہرت مطلوب ہوتی تھی وہ اس مرکز کی طرف آتے تھے۔ یوں دارالحکومت ثقافتی اعتبار سے بھی بہت مضبوط ہو جاتا اور انعام و اکرام اور عزت و مرتبہ بھی اسی شہر میں ملتا۔ جب مانڈلے سے واحد شاہی جوڑا جلاوطن کر دیا گیا تب وہاں پر ثقافتی خلا پیدا ہوا۔ برمی زبان و ادب کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں ہوئی اور نو آبادیاتی حکومت نے جو مواقع پیدا کئے تھے ان کو حاصل کرنے کے لئے انگریزی کی تعلیم لازمی تھی۔ برمیوں کا مقابلہ چینیوں اور ہندوستانیوں سے آپڑا تھا جنہیں مغرب کے لوگوں اور ان کے اداروں سے کاروبار اور تعلقات کا بہت پرانا تجربہ تھا اس لئے ان مواقع کو گرفت میں لانا بھی خاصا مشکل تھا۔ جب تک بالائی برما میں برمیوں کی حکومت رہی انہیں کبھی یہ خوف لاحق نہیں ہوا تھا کہ ان کی سرزمین پر ان کی جگہ کوئی اور حاکم ہو گا۔ پھیئرے نے ۱۸۶۵ء کی اپنی یادداشت میں، جس کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے، لکھا تھا: برمی لوگوں کو یہ احساس دلانے کی ضرورت ہے کہ

اگر انہوں نے اپنے بچوں کو اچھی اور معقول تعلیم نہ دلوائی اور پڑھے لکھوں میں اضافہ نہ کیا تو یقیناً دوسری نسلوں کے لوگ ان سے آگے نکل جائیں گے۔"

انگریزوں کے آنے کے بعد برما میں جس تیزی سے تبدیلیاں آئیں وہ بڑی خطرناک تھیں۔ ٹینا سریم میں مولیمین اور اراکان میں اکیاب چند سالوں کے اندر اندر بڑے شہر بن گئے۔ ان میں ایسی تجارتی اور دیسی بدیسی چہل پہل ہوئی کہ برما والے سوچ تک نہیں سکتے تھے۔ جب برطانوی حکومت نے رنگون کو دارالحکومت بنایا تو وہ بھی انتہائی مختصر عرصہ میں نیم دیسی نیم بدیسی شہر بن گیا جبکہ انیسویں صدی سے اسے برمیوں کی بجائے ہندوستانیوں کا شہر کہا جانے لگا تھا اور پھر پرنس اور پرنس آف ویلز (بعد میں جارج پنجم اور ملکہ میری) کے ۱۹۰۶ء کے برما کے دورے پر لندن ٹائمز Times کے نمائندہ خصوصی نے لکھا۔

"اس جدید شہر میں انسانوں کی مختلف نسلوں اور رنگوں کا فشار اور فتور ہے، برمی، یورپین، چینی اور ہندوستانی ایک دوسرے سے گویا گتھم گتھا ہیں۔ یہاں جنوبی ہندوستان اور بنگال سے آنے والے تارکین وطن کی تعداد برمیوں سے زیادہ ہے. یہاں چاروں طرف چینی ہی چینی نظر آتے ہیں جو تجارت میں سب سے آگے نکل گئے ہیں اور جو اس شعبہ میں اپنے آپ کو حکمرانوں انگریزوں کے مقابلے میں زیادہ برتر ثابت کر چکے ہیں۔ پہلی نظر میں یہ بتانا مشکل ہے کہ ان میں سے کون سے لوگ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ باثر اور نمایاں ہیں لیکن یہاں ایک تاریخی یادگار ایسی ہے جس کا پورے رنگون پر سایہ ہے یہ آج بھی ایک قوم کی روح کی نمائندہ ہے اور یہ ہے شاڈیگن پگوڈا...... " U. Kaung Section II

ٹائمز کے نمائندہ کا مشاہدہ بہت بھرپور تھا اس میں اس بات کو تسلیم کیا گیا تھا کہ برمی عوام کی زندگی میں بدھ مت اور اس کی نمائندہ علامتوں کی کتنی اہمیت ہے۔ بیسویں صدی کے ساتھ ساتھ پورے ملک میں قدیم معاشرے کی ٹوٹ پھوٹ تیز تر ہونے لگی تو خطرے کی پہلی گھنٹی مذہب ہی کے شعبہ میں سنائی دینے لگی۔ مانڈلے پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد جن لوگوں نے بغاوتوں میں حصہ لیا تھا ان کی خاصی بڑی تعداد نے بدھ عبادت گاہوں کو میدان جنگ میں تبدیل کر دیا تھا۔ برما کے بادشاہوں کے زمانے میں ملک میں ایک روحانی نظم و

ضبط قائم کرنے کے لئے خانقاہوں کا مذہبی سربراہ تھاتھانابینگ (سنگھاراجہ) مقرر کیا جاتا تھا۔ جب زیریں برما پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو انہوں نے تھاتھانابینگ Thathananabaing کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا یہ پالیسی تنگ نظری پر مبنی تھی۔ تھاتھانابینگ کا کنٹرول ہٹتے ہی روحانی نظم وضبط میں زوال آنا شروع ہوا اس کے ساتھ ہی مذہبی حلقوں کو یہ خطرہ بھی نظر آنے لگا کہ بدیسی حکمرانوں کے عہد میں بدھ مت بھی زوال پذیر ہو گیا چنانچہ ان دو عوامل کے حوالے سے بیسویں صدی میں مذہبی لوگوں میں انگریزوں کے خلاف اتحاد پیدا ہونے لگا۔ بالائی برما پر انگریزوں کا قبضہ کے بعد تھاتھانابینگ کی حیثیت تسلیم کرانے کے لئے حاکموں سے اپیل کی گئی جو انہوں نے رد کر دی اور موجود تھاتھانابینگ کے ۱۸۹۵ء میں انتقال کے بعد یہ عہدہ ہی ختم ہو گیا۔ اب مذہبی حلقوں میں یہ ضرورت محسوس کی جانے لگی کہ صورت حال سے نمٹنے کے لئے متحد ہونا ضروری ہے۔ اور ۱۸۹۷ء میں مانڈلے میں بڈھا ساسانہ نوگاہا ایسوسی ایشن Budha Sasana Noggaha بنائی گئی جس کا نصب العین بدھ مت کا تحفظ اور فروغ قرار پایا۔ لیکن اس تنظیم کا دائرہ کار محدود رہا اس سے اگلے عشرے میں برما میں قومی سطح کی تنظیمیں قائم ہوئیں اور راہ نما ابھرے۔

اکثر یہ بات کہی جاتی ہے کہ ہندوستان میں قوم پرستی کا آغاز ہی انگریزی حکمرانی میں ہوا جبکہ برما میں ثقافتی یک رنگی کے سبب قوم پرستی ہمیشہ سے موجود رہی ہے یہ ہم آہنگی زیادہ تر بدھ مت سے پیدا ہوئی لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بدھ مت نے قوم پرستی کو فکری مدد دی البتہ یہ ہوا کہ مذہب نے برمیوں کو اپنے بارے میں ایک تصور قائم کرنے میں ضرور مدد دی اور یہ تصور اپنے آپ کو غیر ملکیوں سے الگ رکھنے کا تھا اور غیر ملکیوں میں صرف انگریز ہی نہیں بلکہ ہندوستانی اور چینی بھی شامل تھے۔ یوں برمیوں میں ایسی نسلی نفرت پیدا نہیں ہوئی جیسی ہندوستان میں پیدا ہوئی تھی بلکہ ان میں بجا طور پر خوف پیدا ہوا کہ اگر غیر ملکیوں کی حکمرانی کو ختم نہیں کیا گیا تو ایک منفرد قوم کی حیثیت سے ان کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ برمیوں کی نسلی بقا کے لئے انگریزوں کے مقابلے میں ہندوستانی اور چینی بڑا خطرہ سمجھے گئے جو بیسویں صدی کی قوم پرستی کا نشانہ بھی بنے۔ ان تارکین وطن نے نہ صرف برما کی معیشت کو قابو کر لیا انہوں نے برما کی عورتوں سے شادیاں بھی شروع کر دیں اور جنسی تعلق بھی ...... یہ برمیوں کی مردانگی اور نسلی پوترتا دونوں

پرور تھا۔

برما میں قوم پرستی دراصل بنیادی طور پر روایات ہی کا تسلسل تھی۔ اس میں بنیادی عناصر اور سرچشمے بھی مقامی تھے لیکن اس پر برطانوی افکار اور اداروں کا اثر ضرور پڑا تھا۔ انڈین نیشنل کانگرس کا وجود ایک انگریز کا مرہون منت تھا اور ہندوستانی قوم پرستوں کی سیاسی تحریکوں میں اینی بیسنٹ Annie Besant جیسے انگریز لوگ بھی شامل تھے۔ لیکن برما کی تحریک آزادی میں انگریزوں کا کوئی حصہ نہیں تھا اور جو حالات تھے ان میں یہ حصہ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ دنیا والوں کو برما والوں کا چہرہ مطمئن اور ہنسی بکھیرتا نظر آتا تھا مگر ان کی روحوں کے اندر جو قوم پرستی موجود تھی اور جس کا اظہار کم ہی ہوتا تھا اس حوالے سے وہ غیر ملکی شے خیال یا فرد کو دل سے کبھی قبول نہیں کرتے تھے۔ غیر ملکی تصورات کو قبول کرنے کے لئے انہیں برمی روایات میں گوندھنا پڑتا تھا۔ عجب بات یہ تھی کہ برما کے لوگ اپنی نسلی شناخت کی بجائے ثقافتی یکجہتی کو زیادہ اہمیت دیتے تھے وہ اس غیر برمی کو زیادہ عزیز جانتے تھے جس نے بدھ مت اور برمی ضابطہ حیات کو قبول کر لیا ہو۔ اس کے مقابلے میں وہ اس برمی کو غیر جانتے تھے جس نے کوئی دوسرا مذہب یا عقیدہ اختیار کر لیا ہو۔ دوسری صورت میں یہ ثقافتی انتہاپسندی لوگوں کو تنگ نظر بنا رہی تھی جس کی بنا پر وہ وقت کے ساتھ ساتھ ہونے والی تبدیلیوں کو بڑی مشکل سے قبول کرتے تھے۔ دوسرے زاویئے سے دیکھا جائے تو یہ رویہ بڑا ترقی پسندانہ تھا کہ نئے عناصر کو اپنے ثقافتی ڈھانچے کا حصہ اس وقت بنایا جائے جب اس بات پر فکری ایقان ہو کہ انہیں معاشرہ جذب بھی کر لے گا۔ لیکن چونکہ برما کے لوگوں نے ایسی معاشرتی اور مذہبی رسومات اور عقائد کو اختیار کر رکھا تھا جن کے سبب فکری جستجو کی ضرورت ہی کم محسوس کی جاتی تھی اس لئے فکر و دانش کی سطح پر یہ ایقان آسانی سے پیدا نہیں ہوا۔

زبان اور خیال کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہندوستان میں ہندوؤں نے انگریزی زبان کی اہمیت جلدی محسوس کر لی جس کی بنا پر وہ برطانوی راج میں ترقی اور مراعات حاصل کرنے کی دوڑ میں سابق مسلمان حکمرانوں کو پیچھے چھوڑ گئے۔ ہندو سیاسی اور فکری ہر دو میدانوں میں بھی آگے نکلنے میں کامیاب ہوئے ہندوؤں میں ایسی بڑی بڑی شخصیتیں پیدا ہوئیں جنہوں نے میکالے کے مطابق مقامی پڑھی لکھی مگر انگریز راج کو تقویت دینے والی

جماعت کے تصور کو پس پشت ڈال کر مغرب والوں کو ہندوستان کی مذہبی اور سیاسی امنگوں کا روپ دکھایا۔ سوامی دویکا نند، سری آرو بندو، ٹیگور، گاندھی، رادھا کرشن اور نہرو۔ یہ لوگ اس قابل تھے کہ انگریزی کے ذریعے اپنے نظریات سے پوری دنیا کو روشناس کرا سکیں۔ اس لئے کہ ان میں یہ صلاحیت تھی کہ وہ اپنی بات بڑے سلیقے کے ساتھ مغرب کے فکری لب و لہجے میں پیش کر سکیں اور دنیا نے ان نظریات پر سنجیدگی سے غور شروع کیا۔

ہندوستان کے لوگوں نے بھی مغربی تعلیم سے آراستہ لوگوں کی قیادت کو بسرو چشم قبول کیا۔ سودیشی تحریک مقامی کلچر اور معیشت پر مبنی تھی اس کی بنا پر ان لیڈروں کو کھدر پہننا پڑا لیکن یہ امر طے شدہ تھا کہ وہ انگریزی میں کام کریں گے۔ انگریزی میں لکھیں گے حتیٰ کہ پنڈت نہرو کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ خواب بھی انگریزی میں دیکھتے تھے۔ انگریزی کے اس قدر استعمال کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہندوستان میں کوئی معیاری قومی زبان نہیں تھی لیکن جب پڑھے لکھے ہندوستانی نے اپنی سیاسی اور فکری زندگی میں انگریزی کی ضرورت کو تسلیم کر لیا تو اس کے نقطہ نظر میں بھی اب خاص قسم کا فرق پڑ گیا۔ نزاد سی چودھری بڑے معقول انداز میں اس مسئلے پر لکھتا ہے:

"—— جدید ہندوستان کے کلچر کے بنیادی طور پر غیر ملکی ہونے کا پہلا ثبوت یہ ہے کہ اس کی بنیادیں جس لسانی ڈھانچے پر رکھی گئی ہیں وہ انگریزی زبان، مقامی بے اثر کی گئی زبان اور بولی جانے والی مخلوط زبان کا ملغوبہ ہے دوسرا ثبوت یہ ہے کہ اب ہندوستان کے جدید ادب، آرٹ، فکر و خیال اور اخلاقی اور روحانی سرگرمیوں کی شکل یا ہیئت سربسر غیر ملکی ہے اور نثر میں ادب تو پیداوار ہی برطانوی عہد کی ہے۔"

یہی مصنف بنگال کی نشاۃ الثانیہ کے بعد فکری روایت میں آتے تنوع کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بیسوی صدی کے شروع میں اس کے باپ کا چھوٹا سا گھر مشرقی بنگال کے کسی چھوٹے قصبے میں تھا وہاں جو کتابیں تھیں ان میں بائیبل کا بنگالی زبان میں ترجمہ، ملٹن کی کلیات کننگھم کی ہسٹری آف سکھ، وارن ہیسٹنگز کے خلاف فرد جرم پر برک کی تقریریں، شیکسپیئر کے کچھ کھیل، بنکم چندر چیٹرجی کے ناول اور مائیکل مدھو سودن دت کی

نظموں کے مجموعے شامل تھے۔"

نراد چودھری کے اوائل عمر میں یہ نام مشہور تھے جن میں متذکرہ بالا نام بھی شامل جانیئے۔ ملکہ وکٹوریہ اور پرنس البرٹ، نیپولین، رافیل، ولنگٹن، سیڈسٹون، مارٹن لوتھر، جولیس سیزر اور عثمان پاشا۔ ان کے فوراً بعد آنے والے نام تھے۔ فاکس، ٹپ، میرابو، رابسپائرے، اور ڈینٹن اور مہابھارت اور رامائن کے ساتھ ہومر بھی شمار ہوتا تھا۔

نراد چودھری کے خیال میں بنکم چندر چیٹرجی ہندوستان کے انتہائی موثر دانشوروں میں سے تھا۔ وہ ایک ایسے شریف بنگالی کی تصویر کے مشابہہ ہے جو مغرب اور ہندوستان کے علم وادب کا زبردست عالم اور فنون کا بڑا اعلیٰ ذوق رکھنے والا ہو۔ یہ بھی تعجب کی بات نہیں کہ جنگ سے پہلے انگریزی اور ہندوستانی تہذیب کی بہترین آمیزش کلکتہ میں نظر آتی ہے۔

ہندوستان میں بنگال میں سب سے پہلے انگریزی راج قائم ہوا اور اس دور غلامی میں زیادہ عرصہ کلکتہ ہی دارالحکومت بنا رہا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ جدید تعلیم حاصل کرنے والوں میں بنگالیوں کی نفری بہت تھی۔ مگر بنگال کے علاوہ بھی ہندوستان کے مختلف علاقوں کے لوگ تھے، ممکن ہے کہ انہوں نے بنگال میں نشاۃ الثانیہ کی شدید خواہش کو محسوس نہ کیا ہو لیکن مغربی تعلیم اور علم وادب سے ان کی آگاہی قابل ذکر تھی۔ رانا ڈے، گوکھلے، تلک مہاراشٹر کے تھے، رادھا کرشن جنوبی ہند کے علاقہ مدراس سے تعلق رکھتا تھا، جواہر لال نہرو کشمیری برہمن خاندان کا چشم و چراغ تھا جو الہ آباد میں آباد تھا۔ یہ سب لوگ مغربی تہذیب سے آراستہ ہندوستانیوں کی ایک کلاسیکل تصویر پیش کرتے ہیں۔ نہرو کو ہیرو یا کیمبرج بھیجنے سے پہلے انگریزی ٹیوٹروں نے انگریزی پڑھائی تھی۔ نہرو اپنے خیالات اور احساسات کے اغیار کے لئے یورتیپدز، اسکائلس اور ژئیس کے حرف و سخن استعمال کرتا ہے۔ بھگوت گیتا بھی اس کے جستجو پسند اور سوال اٹھانے والے ذہن کو اچھی لگی اس کی نظر میں یہ نظم سیاسی اور سماجی بحران، بلکہ انسان کے روحانی بحران کے بارے میں لکھی گئی تھی۔ نہرو نے بھگوت گیتا اور سنسکرت کے دوسرے شاہکار اصل زبان میں نہیں بلکہ انگریزی میں ان کے ترجمے پڑھے تھے۔

نراد سی چودھری کا کہنا ہے کہ بہت کم ہندوستانی دل و دماغ میں مکمل ہم

تجویز پر فوراً عمل کرنے کا ارادہ کیا۔ انگلستان پہنچنے پر پہلے تین مہینے تو اس نے رقم خرچ کی اور انگریزی جنٹلمین بننے کی کوشش کی مگر پھر سنجیدگی سے پڑھائی پر توجہ دی اور اپنے اخراجات ہر ممکن حد تک کم کر دیئے۔ گاندھی نے ماں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ انگلستان میں گوشت کو ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔ انگلینڈ میں کچھ عرصہ تو اسے گوشت سے پرہیز کے باعث پریشانی اٹھانی پڑی مگر بعد میں اسے ایک ایسا ریستوران مل گیا جس میں صرف سبزیاں پکائی جاتی تھیں۔ دریں اثنا اس نے سبزی خوری پر کتابیں بھی ڈھونڈلیں ان کتابوں کے بعد وہ بالارادہ سبزی خور ہو گیا لیکن اس سے پیشتر وہ صرف یہ سمجھتا تھا کہ وہ ماں سے کیا گیا عہد انگلستان میں قیام تک نبھائے گا اس کے بعد وہ علی الاعلان بغیر ڈر خوف کے گوشت کھایا کرے گا۔ یہ ابتدائی خیالات و افکار بعد میں عملی زندگی سنوارنے میں کام آئے۔ گاندھی ذہنی اعتبار سے باعمل آدمی تھا اس لئے وقت کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے مناسب خیال وضع کر لیتا۔ گاندھی پر ہندوازم کا گہرا اثر تھا لیکن اس میں عقلی فکر کے اعتبار سے ایسی لچک موجود تھی کہ اس نے مغربی افکار میں سے ضرورت کے خیالات کو جو اس کی اخلاقی اور معاشرتی سکیم میں فٹ ہوتے تھے قبول کر لیا۔

ہندوستان میں نشاۃ الثانیہ نے جو روایت شروع کی اس میں سب سے اہم عنصر مشرق اور مغرب اور نظریہ اور عمل کا امتزاج تھا۔ برما میں ایسی روایت پیدا نہ ہو سکی اس لئے پڑھے لکھے اور عوام کی خواہشات اور امنگوں کے درمیان کوئی نقطۂ اتصال نہ بن سکا۔ رنگون برما کے عرصہ قدیم سے چلے آ رہے مرکزی علاقوں سے دور تھا چنانچہ جب رنگون کو دارالحکومت بنایا گیا تو سیاست اور ثقافت کو ضعف پہنچا۔ جب شاہ تھیبا اور اس کے خاندان کو مانڈلے سے لے جایا گیا اور محل خالی ہوا تو برطانوی سپاہیوں نے لوٹ مار مچا دی جس میں برمی زبان کے بے شمار مخطوطے ضائع ہو گئے۔ تباہ کن لوٹ مار ایک ہفتے تک جاری رہی۔ تب اسے روکا گیا اور اتنی تباہی کے بعد بھی اتنے مخطوطے بچ گئے کہ وہ چالیس بیل گاڑیوں کا مال تھے۔ آٹھ سال بعد ان کتابوں کو رنگون کے گورنمنٹ سیکرٹریٹ میں رکھا گیا۔ انہی مخطوطوں کی بنا پر برما کے عالم یوٹن U.Tin نے کون بونگ خاندان کی تاریخ لکھی۔ بالائی برما پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد پورے برما کو ایک چپ لگ گئی تھی جو بیسویں صدی میں اس وقت ٹوٹی جب تہلکہ ڈالنے والی متذکرہ بالا تاریخ اور اس جیسی تحریریں وجود میں

آئیں۔

برمی زبان میں سب سے پہلی کتابیں روم کے وٹیکن پریس میں چھپی تھیں۔ یہ اٹھارہویں صدی کے آخر کا زمانہ تھا انیسویں صدی کے شروع میں سرام پور کی مشنریوں نے برمی رسم الخط کا ٹائپ فیس تیار کیا ان سے بعض ٹائپ اور ایک پریس ۱۸۱۶ء میں برما میں بپٹسٹ مبلغ ایڈونیرام جوڈسن Adoniram Judson کو بھیجا گیا۔ لیکن کچھ عرصہ تک اس پریس سے زیادہ کام نہیں لیا گیا اور برما کی کتابیں کلکتہ میں چھپتی رہیں۔ پھر ٹیناسریم کا بھی انگریز ہندوستان سے الحاق ہو گیا۔ برمی میں سب سے پہلی کتابیں مولمین میں مشنریوں نے چھاپیں جو بائبل اور اس کے حصوں پر مشتمل تھیں دوسری اینگلو برمی جنگ کے بعد یہ پریس رنگون منتقل کر دیا گیا۔ برما کے باقی کے آزاد اور خود مختار حصے میں پہلا پریس ۱۸۶۸ء میں مانڈلے میں لگایا گیا۔ یہ پریس شاہ مینڈون Mindon نے شاہی محل کے شمال میں واقع اپنے باغ میں لگایا تھا۔ چند سال بعد مانڈلے گزٹ کے نام سے برمی زبان میں اخبار جاری کیا گیا۔ یہ اخبار بادشاہ کی ملکیت تھا اور مہینے میں چار بار شائع ہوتا تھا۔ لیکن برطانیہ کے زیر قبضہ برمی علاقے سے اخبار پہلے ہی شائع ہونا شروع ہو گیا تھا۔ پہلا اخبار مولمین کرانیکل تھا جو ۱۸۳۶ء میں جاری ہوا لیکن زیادہ تر اخبار غیر ملکیوں کے لئے انگریزی میں شائع ہوئے تھے۔ برمی زبان میں ماہنامہ ریلیجس ہیرلڈ ۱۸۴۱ء میں مولمین سے عیسائی مشنری نے جاری کیا۔ ۱۸۷۱ء میں رنگون سے برما ہیرلڈ چھپنا شروع ہوا اور اسی سال برما گزٹ شائع ہوا۔

برما میں بیک وقت دو حکومتوں ـــــ انگریزوں کی حکومت الگ علاقے میں اور آزاد خود مختار برمی حکومت برمی علاقے میں ـــــ کی موجودگی کے باعث صحافت کا ارتقا ہندوستان کے مقابلے میں مختلف نہج پر ہوا۔ ہندوستان کا پہلا اخبار بنگال گزٹ یا کلکتہ گزٹ تھا جو ۱۷۸۵ء میں ایک انگریز جیمز ہکے James Hickey نے نکالا تھا۔ بنگال میں متعین انگریز افسروں کی اکثریت اخبار کے نکلنے پر خوش نہیں تھی اور ان کے خوف اسی وقت صحیح ثابت ہوئے جب کچھ عرصہ گزرتے پر ہکے کے گزٹ نے وارن ہیسٹنگز کی حکومت پر نکتہ چینی شروع کر دی۔ لگتا ہے کہ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہیسٹنگز نے ایک دوسرے اخبار انڈین گزٹ کے چھپنے کی اجازت دے دی تھی۔ یوں ہندوستان

قیام کو بھی قبول کر لیا۔ ایک انگریز افسر کا کہنا ہے:

"یہ عین ممکن ہے کہ ملک کے بہت سے اچھے اور بہترین لوگ ہمارے خلاف تھے اور میرے نزدیک سچ بات یہ ہے کہ برما میں باغیوں کے خلاف ہماری مہم میں جو برمی ہمارا ساتھ دے رہے تھے ہمارے ساتھ تھے۔ ان میں سے بہت کم صدق دل سے ایسا کر رہے تھے زیادہ تر ایسے تھے جنہیں اپنے ہی لوگوں سے کوئی بیر، کوئی دشمنی تھی جس کا وہ بدلہ لے رہے تھے یا کوئی ذاتی فائدہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔"

برما میں مقامی بادشاہ کے حق میں جذبہ حب الوطنی ہمہ گیر تھا۔ یہاں وہ صورت نہیں تھی جو ہندوستان میں تھی جہاں بے شمار ہندو کسی بھی صورت مغل بادشاہ سے وفاداری کے پابند نہیں تھے۔ جب بالائی برما میں ایک بار بغاوت کچل دی گئی تب لوگوں نے اپنی قدیمی روایت کے تحت حکومت سے دور دور رہ کر زندگی گزارنی شروع کر دی۔ پھر آہستہ آہستہ انہیں احساس ہوا کہ ایسے تو معاملہ نہیں چلے گا۔ انتظامیہ کے ہاتھ دور دور دیہات میں بھی پہنچ کر گہری تبدیلیاں لانے لگے اور عام آدمی کو بھی محسوس ہونے لگا کہ ان تبدیلیوں کے سبب اسے اپنے روائتی طور اطوار کو بدلنا پڑیں گے۔

یہ ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ برمی بادشاہت میں ترقی کے مواقع صرف دارالحکومت میں ہوتے تھے۔ زیریں برما پر انگریزوں کے قبضہ کے بعد رنگون برمی بادشاہت کے صدر مقام کا حریف تو بن گیا مگر برما کا مضبوط ثقافتی مرکز مانڈلے ہی رہا اور رنگون کو وہ حیثیت نہیں ملی لیکن شاہ تھیبا کی معزولی کے بعد علم و ادب اور فن کی قدر شناسی اور سرپرستی کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا تو ثقافتی توازن بھی رنگون کے حق میں ہونے لگا اور لائق اور اونچی اڑان کی خواہش رکھنے والے برمیوں نے رخ رنگون کی طرف کر لیا۔ ریلوے اور سڑکوں کے ساتھ ساتھ دریائی ٹرانسپورٹ کے باعث لوگ کارواں در کارواں جنوب کی طرف جانے لگے۔

انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی سب سے زیادہ سہولت رنگون میں تھی۔ مگر رنگون میں ہی دوسرے تارکین وطن بہت بری تعداد میں آباد تھے، رنگون برما کے مرکزی ثقافتی علاقوں سے دور تھا، اور انگریزوں نے برما کی روائتی تعلیم و تربیت کے نظام سے سرد مہری کا مظاہرہ کیا تھا اس لئے رنگون میں جدید تعلیم اور قدیم برمی تعلیم میں تال میل پیدا نہ ہو سکا۔

ملازمت یا کمرشل فرم میں نوکری کے لئے کم از کم ساتویں پاس ہونا ضروری تھا۔ لیکن لگتا ہے کہ ہیمنگ بھکشو تو نہ رہا مگر اس نے اس جدید تعلیم سے بھی کوئی مادی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس کی تحریروں میں اخباری مضامین، مقبول عام ڈرامے، تاریخ اور شاعری شامل ہے اور یہ سب روائتی اسلوب میں لکھے گئے۔ ان تحریروں کا مواد سے پتہ چلتا ہے کہ ہیمنگ کو ملک کی معاشی، سماجی اور سیاسی معاملات سے گہری واقفیت تھی خصوصاً اس کے مضامین میں "جو بوہ ڈگا" نام سے جانے جاتے ہیں اس نے اس زمانے کے ان مسائل پر بات کی ہے جس پر لوگوں نے سیاسی انداز میں سوچنا شروع کیا۔ بوہ ڈگا Boh Diga والے مضامین میں جو ۱۹۱۳ء میں لکھے گئے ہیمنگ نے بالائی برما کی تباہ ہوتی ہوئی معیشت اور معاشی وجوہ پر برمی عورتوں کے غیر برمیوں سے شادی کرنے کے روز افزوں رجحان پر تشویش کا اظہار کیا ہے ۱۹۱۷ء میں وائی ایم بی اے نے ان شادیوں کی مذمت کی قرار داد منظور کی۔ اسی اجلاس میں حکومت سے کہا گیا کہ غیر ملکیوں کے لئے برما میں زرعی زمین خریدنے کی ممانعت کر دی جائے کیونکہ اس طور مقامی باشندوں کے لئے معاشی مسائل پیدا ہوں گے۔ اس طرح ہیمنگ قدیمی طریق کا عالم تھا مگر اس نے نو آبادتی سوسائٹی کی برائیوں کا شعور جدید پڑھے لکھے لوگوں کے مقابلے میں پہلے حاصل کر لیا، اس تعلیم یافتہ کلاس میں سے بعد میں قوم پرست قیادت ابھری۔

مے اونگ نے اپنے لیکچر جدید برمن اس کی زندگی اور آرا (اس کا اقتباس پہلے آ چکا ہے) میں اشارہ کیا ہے کہ نئے برمی نے ان نئی آرا اور نظریات کو نہ تو ہضم کیا ہے نہ ہی ان کا اپنی زندگی پر اطلاق کیا اس نے صرف پرانے نظریوں اور آرا کے متبادل کے طور پر انہیں اپنا لیا ہے۔ پرانے اور نئے لوگوں میں جو خلیج حائل ہو گئی تھی اس کا پیش نظر مے اونگ اور با ہیپے B Hpe (وائی ایم بی اے قائم کرنے کا خیال اس شخص کو آیا تھا) اور دوسرے جدید تعلیم یافتہ لوگوں نے ہیمنگ جیسے لوگوں کے وجود اور تحریروں سے برما کے کلاسیکل شعر و ادب کو سمجھنے کی کوشش کی۔ وہ ہیمنگ کی بہت عزت کیا کرتا تھے۔ مگر روایتی اور جدید اور برمی اور مغربی کا صحیح امتزاج اس نسل سے بھی نہیں ہوا تھا اس لئے کہ نہ تو انہوں نے نئے خیالات کو برما کے روایتی قابل فہم انداز میں ڈھالا اور نہ ہی پرانے افکار کو عہد جدید کے حوالے سے چھانا پھٹکا۔

برماوالے ہیمنگ کا بہت بڑے قومی شاعر کی حیثیت سے مقابلہ ٹیگور کے ساتھ کرتے ہیں۔ لیکن اس قسم کا مقابلہ اسی وقت ہی جائز ہوتا ہے جب قوم پرستی کی تعریف صرف سادہ سے سیاسی سیاق و سباق میں نہیں بلکہ پورے وسیع ثقافتی پس منظر میں کی جائے۔ رابیندر ناتھ ٹیگور کے دادا دوار کا ناتھ ٹیگور بہت امیر کبیر اور وسیع المشرب آدمی تھے۔ اس کے بیٹے و دیبندر ناتھ نے جو رابیندر ناتھ کا باپ تھا برہمو سماج کی تحریک میں نئی تنظیم کے ذریعے جان ڈالی تھی، اس طور رابندر ناتھ ٹیگور کو ہندوستان میں نشاۃ الثانیہ برپا کرنے کی خواہش اور عمل ورثے میں ملا تھا، اس نشاۃ الثانیہ کا مقصد یہ تھا کہ ان روحانی اور سماجی اقدار کو مضبوط بنایا جائے جو ہندوستان کو جدید دنیا کے برابر لے آئے۔ وہ شروع سے ہی انگریزی ادب پڑھا ہوا تھا۔ اور ٹیگور کے فکر و دانش میں غیر ملکی خیالات اس قدر رچ بس گئے تھے کہ وہ ٹیگور کے عرصہ خیال کی وسعتوں کا اٹوٹ حصہ بن گئے تھے۔ اس کے روحانی نظریات پر اپنیشدوں اور بھگتی تحریک کے ادب کا بڑا اثر تھا. بھگتی ادب میں سب سے نمایاں وصف انسان اور خدا کے وصال کی خواہش تھی۔ مگر بنگال سے باہر ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے لوگوں کو ٹیگور کے خیالات سے واقفیت ۱۹۱۲ء کے بعد ہوئی کیونکہ اس وقت انگریزی میں ڈبلیو بی ژیٹس اور ایذرا پاؤنڈ جیسے لوگوں نے اسے انگریزی میں ترجمہ کر کے مقبول بنایا۔ ہندوستان والوں کی نظر میں ٹیگور کی جو شخصیت ابھرتی ہے وہ گیتانجلی کے ان معروف شعروں کے مطابق ہے۔

جہاں دل و دماغ میں کوئی خوف نہ ہو اور جہاں سر اٹھا کر چلنے کی آزادی ہو

جہاں علم، آزاد ہو

جہاں گھروں کی تنگ دیواروں سے دنیا کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے نہ بانٹا گیا ہو

جہاں لفظ گہری سچائیوں کے آئنہ دار ہوں

جہاں بہترین جدوجہد میں مصروف ہاتھ تکمیل چاہتا ہو

جہاں تعقل کی شفاف ندی مردہ خیالوں کے ریگستانوں کی خشک ریت میں گم نہ ہو گئی ہو

جہاں تمہاری راہنمائی میں ذہن ہر لحظہ کشادہ ہونے والے قول و فعل کی دنیا میں پہنچتا ہے۔

او، میرے باپ، میرے خوابیدہ ملک کو آزادی کی بہشت میں بیدار کر۔

ٹیگور نے ان چند سطروں میں ہندوستانی نشاۃ الثانیہ کے فکر اور ارادے کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔ نشاۃ الثانیہ کی اصل غرض و غایت یہ تھی کہ علم آزادی، آفاقیت، تعقل اور فکر کو ایک روحانی دائرہ کے اندر عمل سے جوڑ دے۔ ہر چند ٹیگور کو ایک قومی ادارہ تصور کیا ہے مگر اسے ہر معاملہ میں قوم پرست نہیں سمجھا جاتا۔ مہاتما گاندھی نے تھوک کے حساب سے مغربی تہذیب کی مذمت کی جس پر ٹیگور کا اختلاف ہوگیا۔ اس اختلاف کو بڑی ہوا دی گئی گاندھی عوام کے وطنی جذبات کی نمائندگی کرتا تھا جب کہ ٹیگور کے بین الاقوامی آدرش تھے۔ اب وہ ایک طرح سے عوام سے دور تھا۔ جب دونوں میں اختلاف ہوا اور تو اور بنگال میں بھی ٹیگور کی مقبولیت کم ہو گئی۔ نہرو دونوں کا مداح تھا چنانچہ دونوں کا برادرانہ تقابل کرتا ہے۔

ٹیگور بنیادی طور پر بندہ فکر و خیال تھا جب کہ گاندھی ہر وقت سرگرم کار۔ اپنے اپنے مختلف انداز میں دونوں کا دنیا کے بارے میں اپنا اپنا نظریہ تھا لیکن دونوں ہی بنیادی طور پر ہندوستانی تھے دونوں ہندوستان کے دو مختلف مگر ہم آہنگ پہلو پیش کرتے تھے یہ دونوں پہلو ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔

ہیمنگ بنیادی طور پر ٹیگور کے قریب تھا کیونکہ وہ بھی بندہ فکر و خیال تھا مگر سیاسی قوم پرستی میں گاندھی کے زیادہ قریب تھا۔ ہیمنگ کی زیادہ تر تحریریں اس کے عہد کے ایسے واقعات اور معاملات پر تھیں جن کا بر مائیں قوم پرستی کے فروغ سے کوئی بھی تعلق بنتا ہے۔ جب اے اونگ انگریزوں کی کسی سرکاری تقریب میں اپنا برمی لباس پہن کر جاتا ہے تو ہیمنگ اس کی بڑی تعریف کرتا ہے۔ جب وائی ایم بی اے کا ایک وفد برما کے حالات پر برطانوی حکومت سے مذاکرات کرنے کے لئے لندن جاتا ہے تو وہ اس بات پر بڑا خوش ہوتا ہے۔ دوسرے طرف وہ ایک ایسے ڈاکو کی وارداتوں کا بھی پرجوش انداز میں نوٹس لیتا ہے جو حکومت کی سرتوڑ کوششوں کے باوجود گرفتار نہیں ہوتا اور جسے لوگوں نے

اور غالباً مذہبی طور پر عیسائی تھا۔ یہ ناول دی کاؤنٹ آف مونٹے کرسٹو کے ابتدائی حصوں سے ماخوذ ہے اور اس میں بدھ مت کی رسومات اور اعتقادات کی جھلک نہیں ملتی۔ یہ ناول سیدھی سادی زبان میں لکھا گیا ہے اور مرصع کلاسیکل سٹائل سے پوری طرح اجتناب برتا گیا ہے۔ اس ناول کی کامیابی کے بعد تو گویا ناولوں کا سیلاب آ گیا اور ڈرامے کی جگہ ناول نے لے لی۔ تاہم بہت سے شروع کے ناول زبان اور ہیئت کے اعتبار سے جیمز ہلا گیا کے سادہ مگر پر تاثیر سٹائل کی بجائے پرانے ڈراموں کے زیادہ قریب تھے۔ مواد حقیقت کی بجائے رومان والا ہوتا۔

۱۹۲۰ء سے پہلے ایسے ناول کم ہی لکھے گئے جن میں آج کی بات کی عکاسی کی گئی ہو۔ صرف یولاٹ U Latt کے ناول جیمز ہلا گا کی طرح کے تھے۔ یولاٹ نے بھی جدید تعلیم حاصل کی تھی۔ لاٹ کی برمی کے کلاسیکل سٹائل والی تحریروں اور ہم عصر ڈرامہ سے برابر کی آگاہی تھی۔ وہ زیریں برما میں پیدا ہوا اور وہیں تعلیم حاصل کی لیکن اس کی تحریروں میں برمی بادشاہت کے زمانے کی بہت یادیں ہیں۔ تھوڑی سی ماضی پرستی کی نمائش۔ اس کا سب سے مقبول ناول شوی پائیسو Shwepyiso ہے جس کی ہیروئن شاہی خانوادے کے کسی مرد یا عورت کی بیٹی ہے اور جس کی پرورش دربار کے ملازموں نے کی ہے۔ اس کی ولدیت اس پر اس لئے آشکار نہیں کی جاتی تھی کہ کہیں وہ ایک جابر ملکہ کے غصہ کا شکار نہ ہو جائے لیکن آخر میں یہ انکشاف ہوتا ہے کہ یہ سارا معاملہ غلط فہمی پر بنی تھا۔ جس ملکہ کا سب سے زیادہ خوف تھا وہ اس بچی کے لئے سراپا شفقت بن گئی۔ یہ کہنا شاید مبالغہ ہو گا کہ لاٹ تھیبا کی ملکہ کے بارے میں مشہور کی گئی ظلم و ستم کی داستانوں کو غلط ثابت کر رہا تھا مگر اس سے اتنا اشارہ ضرور ملتا ہے کہ بادشاہوں کی زیادتیوں کو اگر بھلایا نہیں جا سکتا تھا تو کم از کم انہیں معاف کر دیا جانا چاہئے۔

ماضی پرستی ماضی کی بہت زیادہ یادیں دراصل اس بات کا اظہار تھا کہ لوگ غلامی کے سبب ناخوش ہیں اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ واقعتاً پرانے اداروں کی بحالی کے آرزومند ہیں۔ مستقبل کے بارے میں قابل عمل فلسفہ یا طرز فکر وضع کرنے کے لئے ماضی کا جائزہ لینے کی کوئی جامع کوشش نہیں کی گئی۔ بیسویں صدی کے شروع میں بہت سے برمیوں نے طے کر لیا کہ حب الوطنی کے تقاضے کے تحت انہیں تمام پرانے انداز طور

"برما کی حیثیت اس پگوڈے کی سی ہے جو بحالی کے کام کے دوران حال ہی میں زمین سے برآمد کیا گیا ہے۔ ہم اس برما کی تعمیر میں مدد دینا چاہتے ہیں۔ اس برما کی بحالی کا کام بڑی مجبوری کا کام ہے۔ اس لئے بے مزہ بھی ہو گا۔ جب پیگن میں کھدائی ہو رہی تھی تب میں کام کا جائزہ لینے وہاں گیا اور وہاں پٹلیک Petleik پگوڈا دیکھا۔ اس وقت میں نے ایک مزدور کو کام کرتے دیکھا اس نے مٹی میں سے ایک تختی نکالی اور مٹی صاف کرنے کے لئے ایک ہی ہلے میں مٹی اور پلاسٹر صاف کر دیئے یہ تختی نہ جانے کتنی صدیوں سے مٹی کے نیچے دفن تھی۔ تاہم جس انداز میں اس نے پلاسٹر بھی اڑا دیا۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا اسے یہ کام کرنے سے پہلے ساری مٹی گارا آرام سے اتارنا چاہئے تھا۔ تاکہ تحریر بچ جاتی ہمیں بنیاد بہت ہی احتیاط سے رکھنی چاہیئے ایک ایک کر کے سلیقے سے عمارت کی اینٹیں چننی چاہیں۔ تاہم جہاں تک میرا تعلق ہے میں کہوں گا کہ اگر برما کا مستقبل تابناک بنانا ہے تو اسے پرانی بنیادوں پر ہی تعمیر کرنا ہو گا۔"

اس قسم کی تقریروں اور الفاظ میں نشاۃ الثانیہ کے بیج نظر آ جاتے ہیں ماضی، حال اور مستقبل میں ایک مضبوط رشتہ قائم کرنے کی خواہش مٹی گارا اس طور ہٹانے کی آرزو کہ پرانی بنیادیں بھی اس قابل رہیں کہ ان پر ایک نئی مستحکم عمارت کھڑی کی جا سکے۔ لیکن یہی نشاۃ الثانیہ تھی جو پوری طرح پھل پھول نہ سکی۔

برما ریسرچ سوسائٹی نے ہیمنگ سمیت اس زمانے کے بہترین لکھنے والوں کی توجہ حاصل کی اور ان کی تحریریں پرچے میں چھپیں لیکن پرانی طرز کے عالموں اور نئی تعلیم حاصل کرنے والوں کے درمیان دیوار سی بدستور کھڑی رہی۔ ایک سسٹم یا نظام کے لوگ دوسری طرز کے طرز فکر اور اظہار پر قادر نہ ہو سکے۔ حسب معمول اس زمانے میں برما میں بڑے ذہین مرد و زن تھے مگر ان کی دونوں طریقوں کو اپنانے، اپنا حصہ بنانے میں ناکامی کو دماغی کمزوری کا مسئلہ تو نہیں کہا جا سکتا ہے، البتہ یہ نفسیاتی معاملہ ہو سکتا ہے۔ سب سے زیادہ حجاب برما کے ماضی کو معروضی انداز میں پرکھنے کے بارے میں تھا۔ برمی زبان میں ایک ضرب المثل ہے لوگوں کو خبردار کرو کہ پرانی چیزوں کو ترک نہ کریں۔ بلاشبہ یہ

عقلمندی کی بات ہے کہ تبدیلی صرف تبدیلی کی خاطر نہ کرو۔ اسی طرح قدامت کے ساتھ قدامت کی خاطر چمٹے رہنا بھی ویسی بے کار بات ہے۔ مے اونگ کو شکوہ تھا کہ نئے برمن نے بھی نئی باتوں کو نہ اپنایا ہے نہ ہضم کیا ہے۔ اس نے اس بات کا اشارہ نہیں کیا کہ پرانے طور طریقوں میں اصلاح اور کتربیونت کی جانی چاہیئے، انہیں اختیار کیا جانا چاہیئے اور جو ترک کرنے جوگا ہے اسے ترک کر دینا چاہیئے۔ شاید اور اسی جیسا تعلیمی پس منظر رکھنے والے اپنے آپ کو پرانی اقدار و روایات کی قدر و قیمت متعین کرنے کے نااہل سمجھتے تھے۔ باہپے Ba Hpe نے ۱۹۱۱ء میں تھوریا اخبار نکالا اور ایک موقع پر اس میں لکھا کہ برما والے ہر سال ایک کروڑ روپیہ مذہبی اداروں اور دوسرے مذہبی کاموں پر صرف کرتے ہیں جب کہ یہ روپیہ دوسرے شعبوں میں صرف کرنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ مضمون پر بڑا شور ہوا اور تھوریا پر مذہب کی بے حرمتی کرنے کے باعث حملہ بھی ہوا۔ اس صحافتی جنگ کے دوران دوسری طرف سے بڑے تجربہ کار لکھنے والوں نے باہپے پر کڑے حملے کیے۔ جن کا جواب دینے کے لئے اس نے ہیمنگ کی خدمات بھی حاصل کیں۔ برمی زبان اور ثقافتی پس منظر پر مکمل قدرت حاصل کیے بغیر کوئی شخص عوام کو متاثر کرنے والی تحریر نہیں لکھ سکتا۔ چنانچہ جدید تعلیم یافتہ پرانے زبان اور کلچر سے اپنی اس محرومی کے سبب لوگوں کو یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ پرانی اقدار پر کس طور نظر ثانی کرنی چاہیئے اور کیسے ان کی قدر وقیمت کا تعین کیا جانا چاہیئے۔ قدیم طریقہ کے عالم پرانے اداروں کے اس قدر قریب تھے کہ وہ ان کا معروضی جائزہ لے ہی نہیں سکتے تھے۔

فیلڈنگ ہال ان انگریزوں میں سے تھا جنہیں برما اور برما کے لوگوں سے عشق سا ہو گیا تھا ان کا رویہ رومانوی مگر بعض پہلوؤں سے بڑا سیدھا سادا تھا۔ تاہم برما کے معاشرے پر اس کے مشاہدات بڑے برجستہ ہوئے اس نے ان صورتوں کو بھی دیکھ لیا تھا جو برما میں نو آبادیاتی حکومت کے تحت نشاۃ الثانیہ کے شروع کرنے میں رکاوٹ بنی ہوئی تھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ برمی بادشاہت میں بادشاہ اور عام دیہاتیوں کے درمیان کوئی ایسا طبقہ نہ تھا جو نجیب بھی ہوتا اور جس کے پاس فالتو وقت بھی ہوتا۔ چنانچہ بادشاہ کو دیہاتیوں میں سے وزیر مقرر کرنے پڑتے۔ جن کی صلاحیتیں بھی محدود ہوتیں اور مشرب بہت محدود۔ انہیں دوسرے ملکوں کے بارے میں کچھ خبر ہوتی اور نہ انہیں دوسرے خیالات کا علم ہوتا، یہ آگاہی اور علم

ایک ایسے طبقے کو حاصل ہوتا ہے جس کے پاس دولت بھی ہوتی اور فالتو وقت بھی۔ انگریزوں کے زمانے میں بھی صورتحال کوئی زیادہ تبدیل نہیں ہوئی۔ برما میں کوئی رام موہن رائے، کوئی ٹیگور کوئی نہرو پیدا نہیں ہوا یہ پیسے اور خاصے وقت کے مالک لوگ تھے جو علم کی خاطر علم حاصل کرتے، یہ دیکھنے کے لئے سفر کرتے تھے کہ دوسری تہذیبیں کس طور اپنے ماحول میں آگے بڑھ رہی ہیں، یہ وہ لوگ تھے جو ثقافت کے سنوارنے اور علم و دانش میں اضافے کے نئے معیار اپناتے تھے۔ یہ صرف اتفاق ہی نہیں کہ ودیا ساگر، تلک اور گاندھی نسبتاً درمیانے درجے کے گھرانوں سے آئے، انہوں نے ہندوستان کے مسائل کے فکری حل کے لئے عالمی سطح پر سوچنے کی بجائے قابل عمل حل پر توجہ دی۔ ایک مغربی عالم نے گاندھی اور ٹیگور کے درمیان فرق پر بات کرتے ہوئے ان دونوں کے الگ الگ پس منظر کے حوالے بھی دیئے ہیں

> جین وشنو مذہب کے پروردہ قدامت پسند خاندان اور راجپورت سیاسی روایات سے وابستہ کاٹھیاواڑی بنیا کی نظر میں ہندوستان کا نقشہ بنگالی برہمن کے نقشے سے بہت مختلف تھا۔ بنگالی برہمن کا خاندان وسیع المشرب تھا جس نے مغرب کے تازہ افکار کو قبول کیا پھر ہندو مذہب اور فن روایات سے ان کا تال میل کرنے میں پہل کی۔ گاندھی کے نزدیک انگریز اور ہندوستان کا تصور ٹیگور سے مختلف تھا، اس میں گاندھی کا انگریزوں سے ذاتی مخاصمانہ رویہ جھلکتا تھا مغرب کے بڑے بڑے شہروں میں ادبی لحاظ سے ٹیگور کو بڑی پذیرائی حاصل ہوئی جب کہ گاندھی کے ساتھ ایک دور افتادہ نو آبادیاتی ملک جنوبی افریقہ میں متعصب سفید فام افراد کے ہاتھوں بُرا سلوک ہوا"

ہندوستان میں مردان عمل نشاۃ الثانیہ کے مقاصد میں سرمست تھے مگر بیسویں صدی میں آکر بعض ہمہ گیر طریقوں اور تصورات میں کشادگی کی جگہ تنگی نے لے لی۔ پریشانی اس وقت ہوتی ہے جب گاندھی جیسا آدمی انگریز عورتوں کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہ گلیوں بازاروں میں آوارہ پھرتی ہیں اور کارخانوں میں غلامی کرتی ہیں" اور مغرب کے طلبا کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ کسی قانون اور ضابطہ کے پابند نہیں اور من مرضی کرتے ہیں اور جن مقامی لوگوں نے انگریزی وسیلہ سے تعلیم حاصل کی ہے، ان کے بارے میں یہ رائے

انہوں نے اس بات کو ملحوظ رکھا کہ زبان سلیس، جملے مختصر اور پالی کے الفاظ اور تراکیب بہت ہی کم ہوں۔ برما کے کلچر اور ادب کے عالمانہ مطالعہ کے لئے برما ریسرچ سوسائٹی نے جو کام شروع کیا تھا اب وہ فروغ پانے لگا تھا۔ یونیورسٹی میں برمی زبان کو بھی اہم مقام حاصل ہو گیا اور برمی میں پہلی بار ۱۹۲۷ء میں طلبا نے آنرز کا امتحان پاس کیا۔

یوپی مونگ ٹن U Pe Maung Tin یونیورسٹی میں پہلا برمی پروفیسر تھا جو یونیورسٹی میں برما کے بارے میں تحقیق و مطالعہ کی حوصلہ افزائی کرتا تھا اس نے ان موضوعات کی متعارف بھی کرایا۔ اس کی راہنمائی اور دوسرے برمی عالموں کے تعاون کے سبب برمی کی تدریس کا معیار بہت اچھا ہو گیا۔ پھر پیو (برمی زبان کی ابتدائی اور قدیم شکل) مون اور پالی زبانیں بھی نصاب میں شامل کر لی گئیں۔ چنانچہ انگریزی زبان و ادب سے آراستہ طلبا نے یہ زبانیں سیکھ کر اپنا لسانی میدان وسیع کیا اور نقطہ نظر بھی عالمانہ ہوا۔ یہ بات بعید از قیاس نہیں تھی کہ جدید برمی عالموں کے گروہ میں سے نامور ادبی شخصیات ابھریں گی۔

۱۹۳۰ء کی دہائی میں کھٹان سٹوریز کے عنوان سے دو جلدیں اور کھٹان پوئمز کے عوان سے ایک کتاب چھپی۔ یہ ان طالب علموں کی تخلیقات تھیں جن کی تربیت میں پروفیسر پے مونگ ٹن کا حصہ تھا۔ کھٹان کا مطلب ہے عہد آزما۔ یہ مجموعے یہ دیکھنے کے لئے چھاپے گئے کہ لوگ جدید اسلوب کے بارے میں کیا ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ یہ تحریریں نمائندہ تھیں برما اور مغرب کی روایات کے مطالعہ تال میل کی جو مغربی نظام تعلیم میں برمی زبان کو متعارف کرانے کے بعد پیدا ہوا۔ بعض نے کھٹان تحریروں کی اشاعت کو اہم ادبی تحریک قرار دیا اور بعض نے انہیں کلاسیکی روایات کے خلاف گردانا اور معاملہ یہاں تک گیا کہ آج بھی اس بات پر مباحثہ ہوتا رہتا ہے کہ کھٹان ادیبوں کا برمی ادب کی ترقی میں کیا مقام ہے؟

کھٹان انداز کے تین اصل نمائندہ افراد تھے پان مونگ وا (مشہور کہانی نویس) اور دو شاعر زاگئی Zawgyi اور من تھوون Min Thu Wun تھے جو بعد میں بڑے مشہور ہوئے۔ ان تینوں کو نشاۃ الثانیہ سے وابستہ کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے علم و ادب کے بارے میں برما والوں کا پرانا احترام اور عمل میں جدید نوعیت کے اضافہ کرنے کے

جائے گی۔ وہ برمی جو برطانوی دور میں اعلیٰ قائدانہ پوزیشن حاصل کرنا چاہتے تھے، ان کا طریق حقیقت پسندانہ تھا اور وہ اسے باعث افتخار بھی سمجھتے تھے۔ یوں قابل قیادت نہیں ابھری اور اونگ سان اسی زمانے میں سمجھ گئے تھے جب وہ صدی کی تیسری دہائی میں ابھی طالب علم تھے۔ یہی اونگ سان بعد میں تحریک آزادی کے قائد کی حیثیت سے ابھرے۔ انہوں نے تعلیم پر اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ بزرگوں نے نوجوانوں کے لئے نہ کوئی مثال چھوڑی نہ ان میں کوئی روح پھونکی۔

> "ہم ان کی قیادت قبول کرنے کے لئے مکمل طور پر تیار ہیں جو اہل ہیں اور ایسے لیڈر بننے کے لئے تیار ہیں جیسے ہندوستان کے لیڈر مہاتما گاندھی، سی۔ آر۔ داس، موتی لال نہرو اور تلک۔ آئرلینڈ کے ڈی ویلیرا De Valera یا اٹلی کے گیریبالڈی Garibaldi اور مازینی Mazzini ہیں۔ کوئی جوان جیسا ہو، جوان لیڈروں جیسا بننے کا حوصلہ رکھتا ہو آئے "ہم منتظر ہیں"

اونگ سان طلبا کی اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جو قومی سکولوں کے حب الوطنی کے جذبوں میں پروان چڑھی۔ ان کو اپنے قوم پرستانہ احساسات کی فلسفیانہ راہنمائی کی تلاش میں سوشلسٹ آئیڈیالوجی اپنانا پڑی۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی بیداری کا عہد تھا۔ اس زمانے میں سیاسی اعتبار سے چند اہم واقعات بھی ہوئے لیکن ان کا آپس میں کوئی مربوط رشتہ نہیں بنا۔ اگلا عشرہ تبدیلی اور انقلاب کا تھا۔ اس زمانے میں آکر نوجوان نسل نے قوم پرستی کی بنیاد کو فکر سے مربوط کر کے وسیع کرنے کی کوشش کی۔

۱۹۳۰ء برما کے لئے بہت بار آور سال ثابت ہوا۔ اسی سال ڈوبابا ایسی ایوان Dohaba Asi-ayone کی تنظیم قائم ہوئی جس نے برما کی تحریک آزادی میں بہت بڑا کردار ادا کیا۔ اسی سال ہسایا سان Hsaya San کی قیادت میں کسانوں کی بغاوت ہوئی۔ ایک تحریک جو ترقی پسندانہ تھی اور مستقبل کے لئے مغربی انداز و افکار سے لیس ہو کر سرگرم ہوئی تھی، اس کے عزائم انقلابی تھے۔ دوسری (کسانوں کی بغاوت) ماضی کی نمائندہ تھی جو ایک زبردست لیڈر کی قیادت، نسلی تفاخر اور مسلم طریق سے متصف ہوئی۔ دونوں ہر چند ایک دوسرے سے زیادہ مختلف نہیں تھیں مگر تعلق بس واجبی سا تھا۔

کے لئے سب کچھ جھونک دیا جب فسادات کوچہ و بازار میں پھیل گئے تو برمیوں کے اتحاد کا نعرہ تھا ڈوبہاما Dhobama (ہم برمی ہیں) رنگون یونیورسٹی کے ایک استاد باتھونگ نے فسادات میں مارے جانے والے برمیوں کے بارے میں پمفلٹ لکھے جس میں اس نے ڈوبہاما ایسی ایون (تنظیم) قائم کرنے کا تصور دیا۔ اس کے نعرے تھے "نسل زبان اور مذہب"۔ بعد میں یہی تنظیم تھاکن پارٹی کے طور پر مشہور ہوئی۔ تھاکن کا مطلب ہے آقا یا مالک۔ اس زمانے میں انگریزوں کو لفظ تھاکن سے خطاب کیا جاتا تھا۔ باتھونگ اور اس کے ساتھیوں نے یہ جتانے کے لئے تھاکن کو اپنے نام کا حصہ بنالیا کہ برما کے لوگ بھی آقا ہیں غلام نہیں۔ بی تھونگ اور اس کے نوجوان ساتھیوں کا طریق جدید قسم کا تھا جس کے تحت انہوں نے حب وطن کے جذبات کو ابھارا اس طرح نوجوان کشاں کشاں اس تحریک میں آنے لگے۔ تھاکن صرف تنظیم کے قیام سے ہی مطمئن نہیں ہوئے انہوں نے قومی امنگوں کو ایک خاص رخ دینے کے لئے سوچ بچار شروع کی۔

۱۹۳۱ء کے ارد گرد برما میں بھی بائیں بازوں کا لٹریچر ملنے لگا تھا۔ جو کتابیں بیرون ملک جانے والے اور جو کتابیں جے ایسے فرنیوال کے برمابک کلب کے ذریعے پڑھی گئیں ان کی بنا پر سوشلسٹ اور مارکسٹ نظریات ملک میں فروغ پانے لگے اور لٹریچر لکھا جانے لگا۔ نوجوان برمی یہ لٹریچر ذوق و شوق سے پڑھتے کیونکہ دنیا بھر میں بعض سیاسی لہریں پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھیں۔ برما کے نوجوان بھی غیر شعوری طور پر انقلابی نظریات کی تلاش میں تھے۔ چنانچہ بغیر مناسب طریق سے ان نظریات کو ہضم کیے انہوں نے سارے سوشلسٹ نظریات اپنانے شروع کر دیئے۔

نوجوان برمیوں میں بائیں بازو کے نظریات کی مقبولیت کی معاشی اور سیاسی وجود بھی بتائی جاتی ہیں۔ دراصل برما کے معاشرے میں ایک تو بدھ کی تعلیمات کے سبب طبقاتی استحصال نہیں تھا. انتہا درجے کی غربت بھی نہیں تھی اس لئے اس میں مارکسی سوشلسٹ نظریات کی کوئی زیادہ گنجائش نہیں تھی مگر اس زمانے میں سوشلزم کو امپیریلزم کا دشمن سمجھا جاتا تھا اس پہلو سے سوشلزم نوجوان قوم پرستوں میں مقبول ہوا. برمی لوگ وقت کے اس گرداب میں آگئے تھے جس میں انہیں بائیں بازو کے نظریات سرمایہ. داری اور نوآبادتی نظام کے مقابلے میں متبادل ترقی پسندانہ نظام کے حامل نظر آتے تھے۔ اس کے علاوہ اب برما میں

علمی اور فکری پختگی بھی آچکی تھی اس لئے یہ فضا سوشلزم ایسے نظریات کے فروغ کے لئے بڑی مناسب تھی۔ نوجوان برمی ذہنی طور پر چست و چالاک ہو چکے تھے. اور ان کے اندر نئے نظریات، تصورات اور چیلنج کو سمجھنے پرکھنے اور مقابلہ کرنے کی شدید خواہش بھی پیدا ہو چکی تھی۔ ان کی اینگلو ورنیکلر تعلیم نے انہیں اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ نہ صرف خود یہ نظریات اپنائیں بلکہ اسے عوام میں بھی پھیلائیں۔ پرانے برمی سیاستدان تو تحریری برمی زبان کو بھی اچھی طرح نہیں جان یا پڑھ سکتے تھے۔ مگر یہ نوجوان لوگ یہ ۱۹۳۰ء کی نسل تو برمی زبان میں کتابیں، اخبار اور رسالے پڑھتے جوان ہوئی تھی۔ وہ بیمنگ کی زبان کے آہنگ سے بھی آشنا تھے اور کھ تان کی رواں زبان سے بھی واقف۔

جو نوجوان قوم پرست اپنے عمل کو جدید فکر سے آراستہ کرنا چاہتے تھے ان میں اونگ سان، سو، نو، تھان ٹن اور تھئن پی مائنٹ Thein Pe Myint شامل تھے۔ یہ سب کے سب سیاستدان بنے، سبھی نے بائیں بازوں کے نظریات کو اپنایا اور اپنے اندر رچا رکھا تھا، کچھ نے کم کچھ نے زیادہ، سبھی ایک طرح سے اہل قلم ہی تھے کچھ کم کچھ زیادہ۔ سو Soe نے بدھ مت کی اصطلاحات کے حوالے سے کمیونسٹ فلسفے کی تعبیریں کیں۔ نو نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ بدھ اور کمیونزم میں کوئی تضاد نہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ وہ اپنی کوششوں میں کس حد تک کامیاب ہوئے۔ انہوں نے یہ دکھا دیا کہ برما کے لوگ اب غیر ملکی نظریات کا اپنی زبان میں ترجمہ اور بیان چاہتے ہیں۔ اونگ سان، تھان ٹن اور تھئن ہپے مائنٹ Thein Hpe Myint نے بھی برمی قوم پرستی کے فروغ کے لئے نئے زاویئے تلاش کیے۔ یہ سب فکر و عمل میں بڑا مضبوط رابطہ چاہتے تھے خصوصاً آنگ سان جن کے نزدیک فکر و عمل کے درمیان ایک اٹوٹ زنجیر کا سا رشتہ تھا۔

تھئن ہپے غیر معمولی ادبی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس نے بے شمار ناول اور کہانیاں لکھیں جن کو اپنے سیاسی افکار کا ذریعہ بنایا اور فنی اعتبار سے بھی ان پر حرف نہیں آنے دیا۔ اپنے بہت سے سیاسی دوستوں کی طرح اس نے اپنی تحریروں میں وطن سے محبت کے جذبے اور دوسری ثقافتوں سے فیض یاب ہونے کی صلاحیت کو تازیانہ لگایا۔ ۱۹۳٦ء میں رنگون یونیورسٹی کے بائیکاٹ کے بارے میں اس نے "بائیکاٹ سٹوڈنٹ" کے عنوان سے ناول لکھا جس کا ہیرو ایک ساتھی لڑکی کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ سستی قسم کی برمی کہانیاں

برما کا ادب اور قوم پرستی

(یہ مضمون پہلی بار برمی ادب میں سماجی وسیاسی رجحانات...... ۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۴ء...... کے عنوان سے برما اور جاپان میں چھپا تھا غیر ملکی سٹڈیز کی ٹوکیو یونیورسٹی، ٹوکیو کے شعبہ برما ریسرچ گروپ کے زیر اہتمام رسالہ میں یہ ان کے اس سلسلہ کی کڑی تھی جسے مختلف ممالک کے ثقافتی اور سماجی ڈھانچے کے مطالعے سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اشاعت ۱۹۸۷ء)

۱۹۱۰ء سے لے کر ۱۹۴۰ء تک کے عرصہ میں برما کے لوگوں نے اپنی نسلی اور ثقافتی شناخت کو ابھارنے کے لئے بہت نمایاں کوششیں کیں، کیونکہ ان عناصر کو غیر ملکی دور میں بے اہمیت کر دیا گیا تھا۔ انیسویں صدی میں برما پر غیر ملکی راج تھوپ دیا گیا۔ اس کے باعث ملک میں سماجی اور سیاسی اعتبار سے جو حالات پیدا ہوئے انہی کے تابع یہ کوششیں ایک واضح شکل اختیار کرتی گئیں۔ بیسویں صدی کے طلوع ہوتے ہی غیر ملکی حکمرانی کے برما کے معاشرے اور سماج پر پڑنے والے اثرات زیادہ نمایاں ہونے لگے۔ مغرب کے اثرات و افکار کا اثر برمی زبان اور ادب پر بھی پڑا اور زبان و ادب میں کلاسیکل روایات سے ہٹ کر نئے اسلوب اور طرز اظہار کا آغاز ہوا۔

غیر ملکی حکمرانی کے عہد میں پیدا ہونے والے ادب کا موضوع بہت وسیع ہے۔ ان میں برمی ادب کی اصناف اور عہد حاضر میں ان کی متبادل اصناف کا تقابلی مطالعہ پرانی سماجی اور مذہبی اقدار پر نئے اداروں اور فلسفہ کے اثرات کا تجزیہ اور مغربی فکر و دانش کے مجموعی اثرات سے متعلق تحقیق و تفتیش بھی شامل ہیں مگر اس مقالے میں اس قدر وسیع مطالعہ مقصود

موثر تنظیم ۱۹۰۶ء میں بنائی گئی جو بعد میں قومی سطح پر ابھری۔ ینگ مینز کرسچن ایسوی ایشن
YMCR سے متاثر ہو کر رنگون کالج کے گریجوایٹس کے گروپ نے ینگ مینز بدھسٹ
ایسوسی این YMBA بنائی اسے بڑی جلدی بااثر اور پڑھے لکھے برمیوں کی حمایت بھی
حاصل ہو گئی۔ شروع میں اس تنظیم کی سرگرمیاں مذہبی اور ثقافتی نوعیت کی تھیں اور اس کے
ارکان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ دولت برطانیہ کے وفادار تھے۔ ۱۹۱۷ء میں
پائنمانا Pyinmana کی سالانہ کانفرنس میں پہلی بار اس نے ایک سیاسی نوعیت کی قرارداد
منظور کی جس کے ذریعے ریلوے کے یورپین کے لئے مخصوص ڈبوں کے سلسلے میں امتیاز کی
مذمت کی گئی تھی، پھر اس بات پر بھی شدید احتجاج کیا گیا کہ یورپی باشندے جوتے سمیت
پگوڈوں میں چلے جاتے ہیں جس سے بے حرمتی ہوتی ہے۔ حکومت سے مطالبہ کیا گیا تو وہ
مقامی اراضی کی غیر ملکیوں کے ہاتھ فروخت کو قانوناً روک دے اور ایک وفد ہندوستان بھی
بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جو برمی عوام کا معاملہ مانٹیگو مشن Montigue Mission کے
سامنے پیش کرے گا جو ہندوستان میں مجوزہ دستوری اصلاحات کے نفاذ کے بارے میں
لوگوں کی رائے کا اندازہ لگانے آیا تھا۔

۱۹۱۸ء میں یو اوتاما U Ottama کی آمد کے ساتھ ہی قوم پرستی کی سرسراہٹ
طبل جنگ کے سے شور میں منتقل ہو گئی، اوتاما بدھ عالم تھا جس نے دنیا دیکھی تھی اور حال ہی
میں ہندوستان سے واپس آیا تھا۔ اوتاما ایک غیر معمولی بدھ عالم تھا اور اس کی ماہیت قلب
جاپان کی طاقت اور ترقی نے تبدیلی کی تھی۔ جس کا وہ بہت معترف تھا وہ جاپان میں کچھ
عرصہ رہا بھی تھا، اسے ۱۹۱۷ء میں ہندوستان میں مہاتما گاندھی کی پہلی ستیہ۔ گرہ بھی بہت
پسند تھی۔ یو اوتاما ان برمیوں کی نمائندگی کر رہا تھا جو جاپان کی ترقی سے بھی بڑے خوش تھے
مگر سیاسی افکار و عمل کے لئے ہندوستان کی طرف دیکھتے تھے۔

۱۹۲۰ء میں وائی ایم بی اے اور دوسری چھوٹی تنظیموں نے مل کر جنرل کونسل آف
بدھسٹ ایسوسی ایشنز GCBA بنائی۔ ۱۹۲۱ء میں انگریز حکومت نے فیصلہ کیا کہ
مانٹیگو مشن نے جس قسم کی طرز حکومت کی سفارش کی ہے اسے برما میں بھی نافذ کر دیا
جائے۔ اس طرز حکومت میں قانون ساز اسمبلیوں کے لئے الیکشن بھی کرائے جاتے تھے۔
اس سوال پر کہ کیا بدھسٹ جنرل کونسل کے ارکان کو انتخاب میں حصہ لینا چاہئے یا نہیں حصہ

لینا چاہئے. کونسل میں پھوٹ پڑ گئی۔ اگلے دس سالوں میں ایک گروپ ڈائی آرچی اور دوسرا ہوم رول کے حق میں رہا اور یوں برما والے بھی منقسم رہے۔ جنرل کونسل کے ارکان میں مجوزہ آئینی اصلاحات کے بارے میں بڑے اختلافات تھے۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں یہ کونسل ٹکڑیوں میں بٹ گئی جو پھر یکجا نہیں ہو سکیں۔

۱۹۲۰ء میں جنرل کونسل آف بدھسٹ ایسوسی ایشنز وجود میں آئی اور اسی سال رنگون یونیورسٹی ایکٹ کے مسئلہ پر بائیکاٹ ہوا۔ ایکٹ کا مطالبہ یہ تھا کہ رنگون یونیورسٹی کو بھی کیمرج اور آکسفورڈ کی طرح رہائشی یونیورسٹی بنا دیا جائے مگر برما کے لوگوں نے یہ تاثر لیا کہ اس طرح اعلیٰ تعلیم کو دراصل مراعات یافتہ طبقوں تک محدود کرنا مقصود ہے۔ طلباء نے اس پر احتجاجاً ہڑتال کر دی. جی سی بی اے نے بھی ہڑتال کی حمایت کر دی اور برمیوں کے عوامی حلقوں نے بھی طلبا کی تائید کر دی. یکجہتی کے اس اظہار نے حکومت کو مجبور کر دیا کہ وہ متنازعہ ایکٹ واپس لے لے جس کی وجہ سے اسے اتنی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس ہڑتال کا ایک اہم نتیجہ یہ بھی بر آمد ہوا کہ سرکاری تعلیمی اداروں کے مقابلے میں ملک بھر میں نیشنل سکول اور رنگون میں نیشنل کالج قائم کرنے کی تحریک چل پڑی۔ لوگوں کے پہلے جذباتی ابھار کے ختم ہونے کے بعد اکثر سکول بند ہو گئے اور رنگون والا کالج بھی ۱۹۲۳ء میں بند ہو گیا۔ تاہم ان اداروں کا قیام برما کی قومی سیاسی زندگی میں اہم واقعہ ثابت ہوا اور اس کے ذریعے عوامی سطح پر بھی ایک ایسے نظام تعلیم کے قیام کی ضرورت محسوس کی جانے لگی جو قومی اغراض و مقاصد اور آدرش پورے کرے۔

بیسویں صدی کی دوسری دہائی کو بجاطور پر عہد ونتھانو Wanthanu کہا جا سکتا ہے۔ ونتھانو کا مطلب ہے سلسلہ حسب ونسب کو محفوظ رکھنا اور اس زمانے میں اس نقطہ کے استعمال سے مقصود یہ تھا کہ مقامی روایات کو ترجیح دی جائے اور غیر ملکی اشیاء سے پرہیز اور گریز کیا جائے۔ اس مرحلہ پر ہندوستان کی سودیشی تحریک کا برما پر واضح اثر نظر آتا ہے۔

تیسری دہائی بے چینی اور عدم اطمینان کا عشرہ ہے. دہائی کے وسط میں ہندوستانیوں اور برمیوں کے درمیان سخت فسادات ہوئے اور اسی سال کے آخر میں ہسایاسان کی قیادت میں کسانوں نے بغاوت کر دی اس بغاوت کو مختلف معنی دیئے گئے ہیں مثلاً بعض کا خیال ہے کہ زرعی شعبہ میں خرابی حالات کے باعث یہ بغاوت ہوئی. انگریزوں کا خیال ہے

کہ ایک جنونی اپنے آپ کو بادشاہ بنانا چاہتا تھا۔ بعض کہتے تھے کہ یہ بغاوت قومی امنگوں کی مظہر تھی۔ بغاوت کچل دی گئی اور ہسایاسان کو ایک سال کے اندر گرفتار کیا. اس پر مقدمہ چلا اور پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ ہرچند اس بغاوت کو زیادہ وسیع پیمانے پر حمایت حاصل نہیں ہوئی لیکن اسے ان محبّ وطن برمیوں کی ہمدردی ضرور حاصل ہوئی جو سمجھتے تھے کہ برطانوی حکومت نے بڑی سنگدلی کا مظاہرہ کیا ہے۔

۱۹۳۰ء میں دوبہاما ایسی ایون بنی جو بعد میں تھاکن پارٹی کے نام سے معروف ہوئی۔ تھاکن کا مطلب ہے آقا یا مالک۔ اس زمانے میں انگریزوں کو اسی لقب سے خطاب کیا جاتا تھا اور انگریز بھی برمیوں سے اپنے بارے میں یہی لفظ استعمال کرنے کی توقع کرتے تھے۔ اس زمانے کے نوجوان قوم پرستوں نے یہ لقب اپنے نام کا حصہ بنا کر یہ بتانے کی جارحانہ کوشش کی کہ اپنا آپ مالک ہونا برمیوں کا پیدائشی حق ہے. انہی نوجوانوں میں سے بہت سے تحریک آزادی میں بلند پایہ مقام پر پہنچے۔ اسی زمانے میں برما میں بائیں بازوں کا لٹریچر پہنچا اور ممتاز تھاکنوں نے خود کو برطانوی سامراج سے آزاد کرانے کے لئے مارکس کے افکار سے راہنمائی حاصل کرنے کا آغاز کیا۔ تیسری دہائی نے یہ بھی دیکھا کہ سیاستدانوں کی پرانی نسل کی جگہ نوجوان انقلابی لے رہے ہیں جو نہ ڈائی آرکی کو مانتے ہیں نہ ڈومینین سٹیٹس پر قانع۔ ان کا مطالبہ مکمل آزادی ہے. ان نوجوانوں کا سیاسی کیریئر طالب علموں کی حیثیت سے رنگون یونیورسٹی سے شروع ہوا ۱۹۳۶ء میں انہوں نے ہڑتال کی جس کا اثر ۱۹۲۰ء کی ہڑتال سے بھی زیادہ ہوا اور یونیورسٹی کے طلباء نے پورے ملک میں نام پایا۔

تیسری دہائی کے نصف آخر میں سیاسی احتجاج کی گرما گرمی بڑھتی رہی اور پھر ۱۹۳۸ء میں اوپر تلے وہ واقعات ہوئے جنہیں انقلاب تیرہ سو کہا جاتا ہے (تیرہ سو برما کے اپنے کیلنڈر کا سال ہے جو انگریزی مہینے اپریل ۱۹۳۸ء سے شروع ہوا اور اپریل ۱۹۳۹ء میں ختم ہوا۔ ہند برمی فسادات ہوئے. بہتر معاوضوں اور حالات کار کے لئے ژیننانگ ژوانگ سے تیل کے مزدوروں کا مارچ ہوا, رنگوں میں طلبا کے احتجاجی مظاہرے .ن میں ایک نوجوان پولیس لاٹھی چارج سے جاں بحق ہوا. تیل کے مزدوروں کے مطالبات کے حق میں کسانوں کا مارچ اور مانڈلے میں مظاہرے جن میں پولیس نے گولی چلا کر سترہ مظاہرین کو ہلاک کر دیا۔

سوچی اپنے ماں باپ اور بھائیوں کے ساتھ
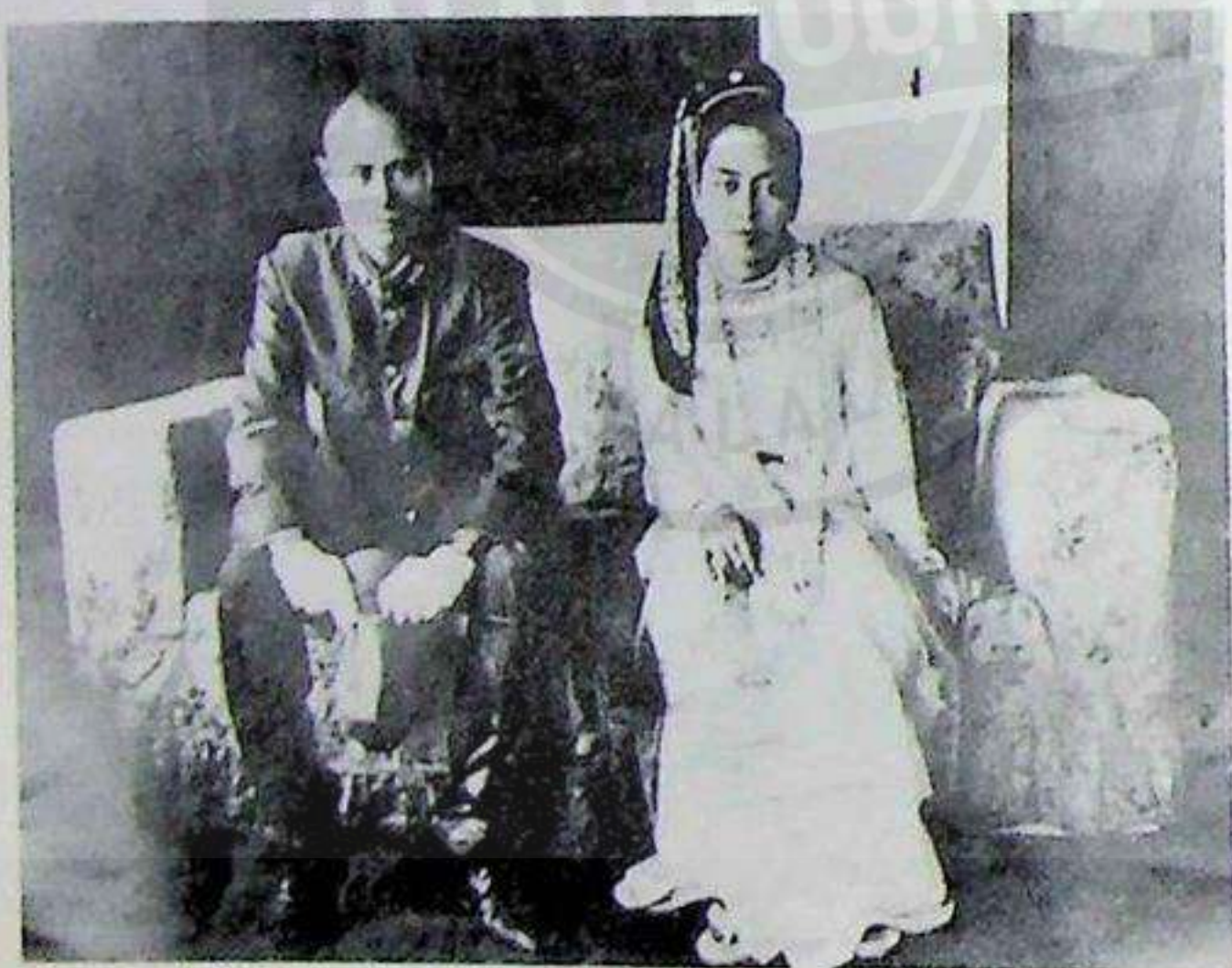
سوچی کے والد آنگ سانگ اور والدہ ڈاکھن چی کی تصویر ان کی شادی کے موقع پر 1942

سوچی اپریل 1989 میں اپنے حامیوں کے ساتھ

سوچی 1989 میں اپنی انتخابی مہم کے دوران

1988-89 میں ایک جلسے سے خطاب

سوچی اپنے بڑے بیٹے الیگزینڈر کے ساتھ نیپال میں 1973

سوچی کا لڑکا کم 1990 میں اپنی والدہ کی طرف سے
سخارف انعام برائے آزادی حاصل کر رہا ہے۔

گزرنے کے ساتھ ساتھ مغربی اثرات زیادہ واضح اور مستحکم ہوتے گئے اور نئے ادبی اسلوب بھی سامنے آنے لگے۔ یہاں صرف ان محدود چند ادبی تحریروں پر بحث کی جائے گی جن میں غلامی کے دونوں کی سیاسی اور سماجی میلانات کی عکاسی ہوتی ہے، اس ضمن میں انتخاب ایک تو اس اعتبار سے کیا گیا ہے کہ کن تحریروں نے جدید برمی ادب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا اور دوسرے مقبول ناولوں کے سلسلے میں ذاتی پسند کو دخل ہے۔

یولٹ U Latt

یولٹ ۱۸۶۶ء میں رنگون میں پیدا ہوا اس وقت وہاں انگریزوں کا راج تھا اس نے شہر میں قائم نئے نئے مشنری سکول میں تعلیم حاصل کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی انگریزی زبان و ادب سے اچھی آشنائی اور اس نے انگریزی میں بہت سا ادب پڑھا تھا۔ تاہم اس نے جو ناول لکھے ہیں ان پر برمی ڈرامے کی ہیئت کی چھاپ ہے اور وہ خود بھی برما کے سٹیج ڈرامے کا دلدادہ تھا۔ اس پہلی کتاب زابیبن Zabebin (۱۹۱۲) کے ایک کردار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ مصنف کا اپنا کردار ہے۔ یولٹ خود سول افسر تھا (کئی برس برما پولیس میں رہا) اس کا تعلق زیریں برما سے تھا اس نے خود کو پرانے ادب و آداب اور اقدار سے وابستہ رکھا اور کلاسیکل ادب کے بارے میں بھی وہ بڑا باذوق تھا۔ یولٹ کے زمانے میں ہی یہ بات عام ہو گئی تھی کہ زیریں برما والے جہاں سب سے پہلے انگریز حکومت قائم ہو گئی تھی اپنے کلچر کو بڑی حد تک چھوڑ چکے ہیں۔ اس زمانے میں برما والوں کو یہ خوف بھی لاحق ہو گیا تھا کہ بڑی تعداد میں غیر ملکی تارکین وطن بھی چلے آ رہے ہیں چنانچہ ونتھانو (حسب نسب کا تحفظ) کا جذبہ بیدار ہو رہا تھا۔ یولٹ نے دوسرے ناول شوی پائیسو Shwepyiso (۱۹۱۴) میں ونتھانو کی اصطلاح پر بحث بھی کی ہے اور اس کے تحت (لوگوں پر) جو فرائض عائد ہوتے ہیں ان کا بھی خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

زابیبن Zabebin اور شوی پائیسو رومانی ناول ہیں جن میں درباری عادات و اطوار کو باوقار انداز میں نمایاں کیا گیا ہے ان تحریروں میں ماضی کی کسک بھی ہے۔ تاہم زیر تحریر مضمون میں مقصد اس کے دلکش رومان سے نہیں بلکہ اس کے ان ضمنی پلاٹوں سے ہے، جو صدی کے آخر کے رنگون کی سوسائٹی پر بھرپور روشنی ڈالتے ہیں۔

ناول شوی پائیسو کے ایک معروف ضمنی پلاٹ میں مغربی رنگ میں رنگے ایک برمی کے کردار کا تعارف کرایا گیا نام اس کا مونگ مونگ Maung Maung ہپیے Hpe ہے۔ جو ابھی ابھی انگلینڈ سے بیرسٹری کر کے لوٹا ہے۔ وہ اپنے والد سے انگریزوں کی طرح ہاتھ ملاتا ہے، اس کی آمد پر خاص طور پر نئی خوبصورت چٹائیاں خرید کر گھر میں بچھائی گئی ہیں مگر وہ ان پر بیٹھنے سے انکار کر دیتا ہے کرسی پر بیٹھتا ہے کیونکہ اس کے مغربی لباس کے لئے کرسی آرام دہ ہے وہ انگریزی انداز میں مخلوط زبان میں باپ سے بات کرتا ہے اور اپنے پریشاں حال باپ کو متاثر بھی اور پریشان بھی کر دیتا ہے۔ وہ ایسی برمی زبان میں بات کرتا ہے جو کبھی غیر ملکی مشنری بولا کرتے تھے جو بائیبل کے ترجمے چھاپنے کے لئے تو استعمال ہو سکتی تھی مگر عام بول چال میں بالکل استعمال نہیں ہوتی مونگ مونگ ہپیے کے باپ نے اس کی انگلستان میں تعلیم کے اخراجات پورے کرنے کے لئے ہندوستانی بنئے سے قرضہ حاصل کیا تھا مگر نوجوان نے اس کا پاس بھی نہ کیا نہ والد کا شکر گزار ہوا۔ اپنے پیشے میں کامیاب ہونے کے بعد وہ ملاقات کیلئے وقت دیئے بغیر باپ سے بھی نہیں ملتا تھا اور اس نے اپنے بوڑھے والد کو بنئے کے شکنجے سے رہائی دلانے کے لئے بھی کچھ نہیں کیا۔ آخر کار اس کے والد نے دوسری برمی لوگوں کی طرح مذہب میں پناہ حاصل کی یہ روایت آج بھی جائز سمجھی جاتی ہے۔ وہ بھکشو بن گیا۔ دوسری طرف پڑھنے والے کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ مونگ مونگ کا انجام عبرتناک ہونا چاہئے مگر ناول میں ایسا نہیں ہوتا۔ غالباً وہ اس زمانے کے بیرسٹروں کی طرح خوشحال زندگی بسر کرتا ہے کیونکہ بیرسٹری پاس کرنا دنیاوی کامیابی کی بہت بڑی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔ پڑھنے والے کو حیرت ہوتی ہے کہ اخلاق و آداب کے اس رومانوی ناول میں یک لخت اس حقیقت پسندی سے کہیں یہ صورت تو دکھانا مقصود نہیں کہ حسب نسب کے تحفظ "انھونا" کے جذبہ کے مقابلے میں جدید تعلیم و تربیت کے ذریعے حاصل ہونے والے فوائد زیادہ پر کشش ہیں۔ یہ مخمصہ برما سمیت ایشیا کے دوسرے غلام ملک کے لوگوں کو بھی درپیش رہا ہے کہ کیا محفوظ کیا جائے کیا چھوڑ دیا جائے کیا قبول کیا جائے اور کیا رد کر دیا جائے۔

یولٹ کے پہلے ناول زابیین میں وتھونا کا کوئی مخصوص حوالہ نہیں دیا گیا (البتہ اس نوجوان افسر کی روایتی اقدار سے وابستگی کو ان معنوں میں لیا جا سکتا ہے) مگر ناول میں یہ

اشارے دیئے گئے ہیں کہ باہر سے آنے والوں نے برمی معاشرے میں زیادہ کردار ادا کرنا شروع کر دیا ہے اور برما کے لوگوں کو اس کا احساس ہے۔ چھوٹے چھوٹے کرداروں میں سے ایک کردار ایک چینی باشندے کا ہے وہ عیار بدکار ہے۔ مضحکہ خیز ہے ایک عملی مذاق کا نشانہ بھی بنا لیا جاتا ہے جس میں ایک ہندوستانی پولیس والا بھی ملوث کر لیا جاتا ہے جو برمی زبان نہیں جانتا۔ مصنف نے تو باہر سے آنے والوں کو نسبتاً نرم سے مزاحیہ انداز میں بیان کیا ہے مگر یہ دراصل اس بات کا آغاز تھا کہ اگلی دو دہائیوں میں غیر ملکیوں کے خلاف کس قدر نفرت کا لاوہ ابل پڑے گا۔

اس زمانے کا ایک بہت بڑا موضوع تھا بدھ راہبوں کی اخلاقی حالت چنانچہ زابیبن کے ایک ضمنی پلاٹ میں اس موضوع کو لیا گیا ہے۔ ایک معروف بدھ سنگھ کا سربراہ بھکشو یا بدھ عالم اور ایک نن ایک ہی خانقاہ کے حصے میں ایک ساتھ رہتے ہیں۔ نن پالی کی مذہبی کتابوں کی بڑی عالم ہے اور اس کی بڑی عزت بھی کی جاتی ہے۔ ان دونوں کے تعلقات کے بارے میں سوال اٹھایا گیا۔ اگرچہ یولٹ نے آج کے لکھنے والوں کی طرح بے تکلفی سے بھکشو اور نن کے تعلقات کا ذکر نہیں کیا مگر جو کچھ لکھا اس کے بعد ان دونوں کے باہمی تعلقات کی نوعیت چھپی نہیں رہتی۔ ناول میں نہ تو بالواسطہ طور پر اس واقعہ کی مذمت کی گئی نہ ہی اس پر سخت تنقید کی گئی ہے یہ دوسری بات ہے کہ یہ واقعہ سچا ہے اور ایک معروف بدھ عالم اور نن کے بارے میں ہے جنھوں نے دینی زندگی چھوڑ کر ۱۹۱۰ء میں شادی کر لی تھی۔

ان دونوں ناولوں کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ان میں کہیں بھی انگریز یا اس کی موجودگی کو نہیں دکھایا گیا صرف ایک انگریز کردار زابیبن میں ہے جو خواب میں ایک عورت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے جو ناول کی ہیروئن کی مدد کے لئے آتا ہے۔ یہ رحم دل انگریز کا تصور ہے جو غالباً اس زمانے کا ہے جب انگریز یہاں مقبول تھے اور ابھی غیر ملکی حکومت کے ناگوار اثرات محسوس نہیں کئے جانے لگے تھے۔

یولٹ کے ناولوں میں پند و نصائح بھی بہت ہیں جن کا تعلق برما کی بدھ روایات اور ونتھانو (آگے ذکر ہو چکا ہے) سے ہے لیکن ناولوں میں سیاسی شعور کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ یہ شعور ۱۹۲۰ء کے بعد نمایاں ہونے لگا تھا۔

تھاکن کوڈا ہمینگ Thakin Kodaw Himaing

یولٹ اور اس کے بعد آنے والے ادیب (ہمینگ) کی تحریروں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ کئی ناموں سے مشہور ہے۔ ہسایالن Hsaya Lun، مسٹر مونگ ہیمنگ، یا تھاکن کوڈا ہمینگ۔ یولٹ کی پیدائش کے نو سال بعد پیدا ہوا اس نے روایتی خانقاہی تعلیم حاصل کی نوجوانی کا زیادہ عرصہ بالائی برما میں رہا۔ جن دنوں وہ مانڈلے میں نوعمری میں بھکشو بننے والی رسم ادا کر رہا تھا ان دنوں اس نے وہ منظر بھی دیکھا کہ برطانوی سپاہی شاہ تھیبا اور اس کی ملکہ کو ہندوستان میں جلاوطنی کی خاطر محل سے باہر لے جارہے تھے۔ شاہ تھیبا اور اس کی ملکہ کی لوگوں میں جانی پہچانی زیادتیوں، مظالم اور گناہوں کے باوجود برما والوں کے لئے یہ بہت ہی الم ناک سانحہ تھا کیونکہ ان کے نسلی تفاخر پر ہاتھ ڈال دیا گیا تھا۔ نوعمر ہیمنگ کی بادشاہت والی روایات سے گہری وابستگی بھی تھی چنانچہ اس کے لئے یہ واقعہ بہت بڑی ٹریجڈی تھا۔

ہیمنگ، موکمین میں نوجوان بھکشو تھا جب وہ صحافت کے میدان میں داخل ہوا اور بڑی جلدی ہی زور نویس ادیب بن گیا۔ اس کے ادبی اور سیاسی پس منظر کا مطالعہ کرنا آسان کام نہیں ہے۔ لیکن یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس کی مضامین ٹکاس کی اشاعت کے بعد وہ ایک غیر معمولی ادیب اور محب وطن کے طور پر مشہور ہوا۔ ان مضامین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان میں برما کی قوم پرست تحریک کے سنگ میل بننے والے واقعات کا ریکارڈ بھی ہے۔

کتاب پوہ ٹکا (یوریپئنوں کے بارے میں) ۱۹۱۳ء میں لکھی گئی اس میں برطانوی راج کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل کے ساتھ برمیوں کے اپنے اصل کے بچاؤ ونقصانو کا ذکر کیا گیا ہے اس کا ایک انتہائی مقبول اور یادوں بھرا حصہ بالائی برما میں شادی کی تقریب پر کہے گئے اشعار ہیں۔ ان میں مزے لے لے کر بتایا گیا ہے کہ نئے جوڑے کو زمین، مویشی، اناج اور گھرداری کا بڑا سامان دیا گیا۔ یہ دیہات میں کھاتے پیتے گھرانے کی شادی کی اچھی تصویر ہے۔ مگر اس ابتدائی خوشحالی کے باوجود جوڑا مقروض ہو جاتا ہے۔ فضول خرچی یا کوتاہ اندیشی کی وجہ سے نہیں بلکہ کساد بازاری اور مہنگائی کی وجہ سے۔ اور بیلوں کا بہت ہی

پیارا جوڑا اور زمین کا ٹکڑا فروخت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ انہوں نے قرضہ کسی ہندوستانی سے نہیں بلکہ ایک برمی سے لیا ہے۔ قصے میں یہ دکھایا گیا ہے کہ قرضہ اور زمینوں کا قرضے کی بنا پر غیر کاشتکاروں کے ہاتھ میں جانا یہ دو باتیں دیہی زندگی کی خوشیوں کو تباہ کر رہی ہیں۔

پوہ ئکا میں دوسرا بڑا موضوع ان برمی عورتوں کے بارے میں ہے جو غیر ملکیوں سے شادی کر لیتی ہیں۔ یہاں بھی ہیمنگ اسے معاشی ضرورتوں کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اس تشویش میں عام برمی لوگ بھی شامل تھے چنانچہ کتاب کی اشاعت کے تین سال بعد وائی ایم بی اے نے اپنی ایک کانفرنس میں برمی لڑکیوں کی غیر ملکیوں سے شادی کی مخالفت کی تھی۔

۱۹۲۰ء میں جو ئکا (مضامین) چھپے ہیں ان میں سے ہیمنگ کی قوم پرستوں کی سرگرمیوں کی گہری دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔ ہیمنگ ایسے واقعات پر خوشی کا اظہار کرتا ہے جیسے وائی ایم بی اے والے وفد کا انگلستان جانا، کریڈک سکیم کے خلاف آل برما کانفرنس کا احتجاج، رنگون یونیورسٹی ایکٹ کے خلاف بائیکاٹ اور ہسایامان کی بغاوت کے پیچھے جذبہ حب الوطنی کا مظاہرہ۔ دوسری طرف وہ ایسے واقعات پر بڑا دکھی ہوتا ہے اور غصے کا اظہار کرتا ہے جیسے یو اوٹاما کی گرفتاری جنرل کونسل آف بدھسٹ ایسوسی ایشن کے ارکان میں جھگڑا جس کے باعث کونسل ہی ختم ہو گئی۔ پرانے سیاستدانوں سے ہیمنگ آہستہ آہستہ مایوس ہوتا گیا اور پھر اس نے تھاکن ئکا (۱۹۳۵ء) میں فیصلہ دیا کہ اب وہ ڈوہباما ایسی ایون کے نوجوان قوم پرستوں کے ساتھ ہوں اس نے فرداً فرداً ان کے نوجوان کے نام بھی لکھے۔

ہیمنگ کی زبان بڑی زوردار مگر کھردری ہے۔ اس کی تحریروں سے اس کی ایسی شخصیت جھلکتی ہے جو بنیادی طور پر ایک روایتی سی ہے مگر وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں بھی قبول کرتی جاتی ہے۔ ہیمنگ نے ان گنت مسائل پر لکھا ہے اور اس کی کلیات پڑھنے سے دوسری جنگ عظیم سے پہلے ادب اور سیاست کے ارتقا کی جامع تصویر سامنے آجاتی ہے اس کی کلیات میں ڈرامے، ناول، صحافتی مضامین، انشائے اور شاعری بھی شامل ہیں۔ سیالن کی کسی تحریر پر حکومت کو تکلیف نہیں ہوئی لیکن یہ حقیقت ہے کہ

ہمینگ کی تحریریں علامتی طور پر ملک میں ترقی پسندانہ خیالات کے پھیلانے میں ان کتابوں سے زیادہ کارگر اور مفید ثابت ہوئیں جن کے مصنفین پر حکومت نے مقدمے چلائے اور سزائیں دیں۔

بات متضاد لگتی ہے مگر بھیمنگ کی صفت یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو برما کی قدیم ادبی روایات کے تابع رکھا مگر نوجوان قوم پرستوں کے ان نظریوں سے ہمدردی بھی رکھی جو انہیں جدید تعلیم اور مغربی افکار سے حاصل ہوئے تھے زندگی کے آخری دنوں میں وہ پکا بدھ رہتے ہوئے بائیں بازو کی سیاست کا حامی بن گیا یہ دوسرا سوال ہے کہ اپنے نوجوان پیروکاروں کے مقابلے میں خود بھیمنگ نے کہاں تک سوشلسٹ نظریوں کو اپنے فکر و خیال کا حصہ بنایا تھا۔

کھتسان

برما کے ادب کی تاریخ میں ایک بڑا اہم سنگ میل دو مجموعوں کی اشاعت ہے مختلف مصنفین کی کہانیوں کا مجموعہ کھتسان کہانیاں کے عنوان سے ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا جبکہ نظموں کا مجموعہ بھی کھتسان نظموں کے نام سے ۱۹۳۴ء میں شائع ہوا۔ ان دو مجموعوں میں ان نوجوان طالب علموں کی تحریریں تھیں جو رنگون یونیورسٹی میں برمی زبان و ادب کے پہلے پروفیسر یوپی مونگ ٹن U. Pe Maung Tin کے شاگرد تھے۔ پروفیسر نظام تعلیم کے اندر برمی زبان و ادب کو بہتر مقام دلانے میں کوشاں رہا۔

اس مجموعے میں جن طلبا کی تحریریں شامل تھیں ان میں سے کئی ایک نے نہ صرف کلاسیکل برمی ادب اور انگریزی ادب پڑھ رکھا تھا (جن میں بیگن کے زمانے کا ادب بھی تھا جو برمی تحریری ادب کے پہلے نمونے ہیں) بلکہ پائی یو، اور مون ادب بھی پڑھا ہوا تھا۔ کھتسان نامی تحریروں کے بارے میں کہا گیا ہے۔

> "چوتھی دہائی کی اس ادبی تحریک نے بیگن سے لے کر تھاکن کوڈا
> بھیمنگ تک اپنی بہترین ادبی روایات کو بھی ساتھ رکھا اور غیر ملکی
> اثرات کے ذریعے برمی ادب میں اظہار کی صورتوں کو جدید تر بنانے میں بھی
> کامیاب ہوئی چنانچہ جو ترقی تیزی سے سماج میں ہو رہی تھی اسی انداز اور رفتار

سے ادب میں بھی ارتقا کا سبب بنی .... کھتسان کی تحریروں کا چوتھی دہائی کی انقلابی سیاسی بیداری سے رشتہ جوڑا گیا اور اس اختلاط نے قوم پرستانہ اور انسانیت پسند ادب کی بنیاد فراہم کی۔ "

کھتسان کے مصنفین نے پالی ازم سے آزاد قابل فہم جملے لکھے جن کو جدید سمجھ کر سواگت کیا گیا. بعض لوگوں نے ان تحریروں کو وقت کی ضرورت قرار دیا جبکہ بعض لوگوں نے انہیں بچکانہ اور کلاسیکل ادب کے خلاف قرار دیا۔ برمی زبان کو سادہ آسان اور جدید بنانے کی تحریک ۱۹۲۰ء سے جاری تھی تب بہترین یو ہپو کیا U Hpo Kya اور پی مونن P. Monin کی تحریروں کو کھتسان تحریروں کا ہراول کہا جا سکتا ہے۔ ان تحریروں میں سے تازہ اسلوب کی بہترین مثالیں تھئی پان مونگ وا Theippan Moung Wa کی کہانیاں تھیں. تھئی پان کو کھتسان گروپ کے ان تین ادیبوں میں شامل کیا جاتا ہے جو کھتسان کے پس پردہ کار فرما جذبہ کے صحیح ترجمان ہیں۔

تھئی پان مونگ وا کی کہانیاں اس کے اپنے تجربے پر مبنی ہیں، جو سول افسر کی حیثیت سے اسے برما کے دیہی علاقوں میں حاصل ہوا۔ یہ کہانیاں دیہی زندگی کی خوبصورت تصویریں ہیں جن میں ہنسی مذاق کا رنگ نمایاں ہے. اسی بنیاد پر بعض نقاد اس پر الزام لگاتے ہیں کہ اصل میں اسے کسانوں سے نفرت تھی۔ ایسی الزام تراشی مصنف کے ساتھ انصاف نہیں ہے کیونکہ مصنف کے دل میں کسانوں سے ہمدردی کا جذبہ کم نہیں تھا مگر اس کی حس مزاح سے تو وہ خود بھی نہیں بچ پاتا ظاہر ہے دوسروں کو بھی وہ اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ مزید تنقید یہ کی جاتی ہے کہ اس کی تحریروں میں قومی جذبہ نہیں ہے. اس کا جواب دینا زیادہ مشکل ہے کیونکہ اس نے ادب اس زمانے میں تحریر کیا جب حکومت کی پالیسیوں پر عملدرآمد کرنے والے لازمی طور پر قوم پرستوں کا مقاصد سے لگا نہیں کھاتے تھے۔ تھئی پان مونگ وا امن وامان برقرار رکھنے کا سختی سے قائل تھا۔ لیکن یہی بات ایک آزاد قوم میں ہو تو قومی سرمایہ بن جاتی ہے مگر غلامی میں قابل اعتراض صفت کہلاتی ہے کیونکہ یہ لوگوں کی تمناؤں کے الٹ ہوتی ہے۔ تھئی پان مونگ وا کی بعض کہانیوں سے پتہ چلتا ہے کہ سرکاری افسر کی حیثیت سے اس کے فرائض اس کے مزاج سے لگا نہیں کھاتے تھے۔ اور برما کی تاریخ، زبان اور ادب کے بارے میں اس کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ اسے اپنی روایتی ثقافتی

اقتدار سے کتنی گہری محبت تھی۔ وہ ان نوجوان ہڑتال کرنے والوں میں سے تھا جس نے ۱۹۲۰ء کے بائیکاٹ کے بعد نیشنل سکول میں پڑھانا شروع کر دیا تھا اور جب وہ اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لئے دوبارہ یونیورسٹی میں گیا تو وہ پہلا طالب علم تھا جس نے برمی زبان و ادب میں آنرز کی ڈگری حاصل کی۔

کھتان تحریروں والے رجحانات اور جذبات سے دو اور ادب بھی گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ یہ ہیں زاگئی Zawgyi اور من تھوون Min Thuwun جنہیں آج کل برما کے سب سے بڑے شاعر کہا جاتا ہے، زگئی نے ۱۹۲۸ء میں پڈاک کے پھول پر جو نظم لکھی تھی اسے کھتان تحریک کا پہلا نمونہ قرار دیا جاتا ہے، اس میں موضوع کلاسیکل ہے مگر اسے دیکھنے کا ڈھنگ بالکل مختلف ہے اس کی شاعری کے موضوعات میں بلیوں اور بطخوں سے لے کر قدرت کے مناظر تک شامل ہیں ان میں غیر معمولی پیچیدگی بھی ہے تاہم یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ تازگی اور جدیدیت ہیئت اور شکل سے نہیں خیالات سے آتی ہے اور اس کی مماثلت انگریزی ادب سے ہے۔ زاگئی کھتان تحریک کے ان شاعروں میں سے ہے جہاں اس کا انقلابی قومی جذبہ ان نظموں میں عیاں ہوتا ہے جہاں وہ برما کی آزادی کے لئے دعا مانگتا ہے اور لوگوں کو تلقین کرتا ہے کہ وہ اپنے ملک کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔

من تھون نسبتاً دھیمے سروں کا شاعر ہے برما کی روائتی دیہی زندگی کا بیان تو بڑا سحر انگیز ہوتا ہے۔ اس کے لفظوں کا انتخاب بڑا نفیس، خوبصورت ہوتا ہے کہ فوری طور پر فہم میں آکر دل و دماغ میں سما جاتا ہے۔ من تھوون کی شاعری میں دیہی زندگی کی تمثیلیں بھری پڑی ہیں، زور زیادہ تر برما کی معاشرت پر ہوتا ہے اور ان غیر ملکی عناصر کا ذکر نہیں ہوتا جو برمی زندگی میں خلفشار پیدا کرتے رہتے ہیں۔ وہ شعروں میں دیہی زندگی کی ہلکے خوبصورت رنگوں سے تصویر بناتا ہے جو تھئی پان مونگ وا کے قلم کی مفلس لوگوں کی کھینچی تصویروں کے بے ہنگم رنگوں کے مخالف ہوتی ہے۔ من تھوون نے بچوں کے لئے جو نظمیں لکھی ہیں وہ بڑی مقبول بھی ہیں اور ان میں تیزی سے معدوم ہونے والی روایات کی یاد کو تازہ رکھنے کا جذبہ ہوتا ہے۔ اس نے عاشقانہ شاعری بھی لکھی خصوصاً چوتھی دہائی میں بڑی نظمیں لکھیں، ان نظموں میں بڑی دلسوزی سے انسانی جذبوں کو زبان دی گئی ہے اور یوں ان کی اپیل بے مثال ہو گئی ہے۔

تھے۔ ان ادیبوں کا مسلک انسانیت پسندی ہے اور ان کے فن میں، حقیقت پسندی رومان پسندی اور نادر خیالی سبھی صفات رچ بس گئی ہیں۔ ان کی قوم پرستی کے جذبے کا اظہار سیاست کے بارے میں ان کی تحریروں سے نہیں بلکہ ان کی ان کوششوں میں ہوا جو انہوں نے جدید صورتوں سے عہدہ بر آ ہونے کے لئے زبان اور ادب میں تقویت پیدا کرنے کے لئے کیں۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ان ادیبوں نے پرانے ونتھانو (اپنی شناخت کو قائم رکھنے) کے جذبہ اور ان نوجوان انقلابیوں کے درمیان پل کا کام کیا جو مغربی فکری روایات کے مطابق اپنی سرگرمیوں کو نظریاتی فریم ورک میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔

تاریخ فہمی

انہوں نے برما کے کٹے پھٹے حال کو جوڑنے اور ان میں اکائی پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ ماضی سے بھی حال کی تشکیل یا ایکتائی پیدا کرنے کی بنیاد مانگیں۔ ماضی کے بارے میں تاریخ دانوں اور آثار قدیمہ والوں نے بیسویں صدی کے شروع سے ہی سرگرمیاں شروع کر دی تھیں ماضی اور حال کے درمیان رشتے مستحکم کرنے کے کام میں استحکام پیدا ہوا۔ پیگن یونن، ہمابی ہسایا تھتن، اور تھاکن کوڈا ہیمنگ پرانی طرز کے برمی عالم اور محقق تھے جو تاریخی ریکارڈ، روزنامچے اور حالات و واقعات کے بارے میں پرانی تحریریں چھاپتے رہتے تھے جس سے قارئین میں اپنی تاریخ کے بارے میں بھی دلچسپی پیدا ہونے لگی۔ تیسری دہائی میں تاریخ پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں ان میں بچوں کو بھی تاریخ سے آشنا کرانے کے لئے مغربی تعلیمی نظام کے تربیت یافتگان نے کتابیں لکھیں۔ ان دنوں میں تاریخ کی اکثر کتابیں سائینٹفک جذبہ تحقیق کی بجائے اس خیال سے لکھی گئیں کہ برمیوں میں اپنی نسل اور کلچر پر تفاخر کا جذبہ مضبوط ہو یہ بات تاریخی ناول میں اور بھی نمایاں ہے۔

پہلا تاریخی ناول ۱۹۱۹ء میں لڈی پینڈیٹا یو مونگ گئی Ledi-pendita U Maung Gyi نے لکھا جس نے کتاب کے دیباچے میں لکھا کہ اس نے یہ کتاب مغربی مصنفین سے متاثر ہو کر لکھی ہے تاکہ اس کے ذریعے برمی بچوں میں اپنی تاریخ جاننے کا شوق پیدا ہو۔ ناول کا نام ہیرو کے نام پر نٹ شی لونگ ہے۔ یہ تانگو کا باشاہ تھا اور شاعر بھی

تھا، سولھویں صدی میں گزرا ہے۔ کہانی کی بنیاد یہ ہے کہ نٹ شی لونگ کو شہزادی واتوکلیا سے محبت ہو گئی جو اس سے عمر میں اٹھارہ سال بڑی ہے۔ یعنی ایک طرح سے اس کی خالہ کی عمر کی اور پھر یہ کہ وہ اس کے کزن سے بیاہی بھی گئی تھی۔ بہرطور نٹ شی لونگ تمام مشکلات پر قابو پا لیتا ہے اور خاتون کا دل بھی جیت لیتا ہے مگر وہ شادی کے کچھ عرصہ بعد مر جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس ناول میں نٹ شی لونگ کی بے مثال محبت اور اس کی شاعری دونوں کی مدد سے اس کے روشن رخ پر ناول لکھا گیا ہے جبکہ اس کی بعد کی زندگی کو نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ اس نے سائریام کے پرتگالی گورنر سے مل کر آوا کے برمی بادشاہ سے جنگ کی، شکست کھائی اور موت کی سزا پائی۔ بہرطور یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ یوموننگ گئی نٹ شی لونگ کی زندگی کے تاریک دور پر بھی ایک ناول لکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے بجائے اس نے تیسری دہائی میں کئی جلدوں میں ناول تابن شویٹی Tahinshwehti لکھا یہ اس کا دوسرا تاریخی ناول تھا جس میں اس نے بتایا کہ یورپی مہم جو لوگ سے مل کر کس طرح ایک عظیم بادشاہ اپنے آپ کو تباہ کر لیتا ہے۔

چوتھی دہائی میں دو اور تاریخی ناول لکھے گئے جن میں نٹ شی لونگ کو برما کا غدار دکھایا گیا۔ ناہکان ڈا Nahkan-daw ۱۹۳۲ء میں یوسومائنٹ U So Myint نے لکھا اور تھابن گئی Thabon Gyi کے عنوان سے ناول ۱۹۳۶ء میں مہا سوے Maha Hswe نے لکھا۔ دونوں ناولوں میں آوا کے بادشاہ اور سیرئم کے پرتگالی گورنر کے درمیان کشاکش دکھائی گئی ہے۔ تھابن گئی میں سیرئم میں پرتگالیوں اور برما میں انگریزوں کی حکومتوں کے درمیان متوازی واقعات بیان کئے گئے ہیں اور تقابل بھی کیا گیا ہے مثلاً غیر مذہب والے غیر ملکیوں کی موجودگی میں بدھ مت کو خطرہ لاحق ہونا، غیر ملکیوں سے مل جانے والے ملکیوں کی سازشیں، حب الوطنی رکھنے والوں کی طرف سے لوگوں کو قیادت سونپنا، اور نوجوان قوم پرستوں کے ایک گروپ کی سودیشی ٹائپ کی سرگرمیوں کا مسلح بغاوت پر منتج ہونا۔ مہا سوے نے اپنے ناول ستھنوٹ تھوا (۱۹۳۹) میں غیر ملکیوں کے خلاف برمیوں کی جدوجہد کو پیش کیا۔ کہانی معروف شاعر نوادئی اوں کی زندگی پر مبنی ہے۔ اس میں برمیوں پر ان مظالم کا ذکر کیا گیا ہے جو بدھ مت کے دشمن شان بادشاہ تھوہانبوا Thohanbwa کے عہد میں ان پر ٹوٹے۔ اس ناول

میں قاری فوراً جان جاتا ہے کہ تمثیل کے پردے میں آج کے برما کا حال لکھا گیا ہے ناول میں برما کے لوگوں کی طرف سے برمی سپاہیوں کے لئے تفاخر، محبت اور اعتماد کے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ برما کی قومی فوج تھی ہی نہیں یوں غلامی کے عہد میں ایک دوسری طرح سے غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ تھابن گئی اور ستھطوٹ دونوں ناولوں میں وطن سے پیار کرنے والوں سے کہا گیا ہے کہ وہ وطن کی آزادی کی خاطر خود بھی قربان ہوجائیں اور اپنے پیاروں کو بھی قربان کر دیں، یہ دراصل اس انقلابی جذبے کی جھلک تھی جو تیسری دہائی میں کارفرما تھا جس کے تحت آزادی کے حصول کے لئے موثر مسلح اقدامات کرنے سے بہتر نتائج حاصل ہوئے تھے۔

بہت سے تاریخی ناولوں میں ایک اور سوال بھی بار بار آیا ہے اور اس نے برما کی تحریک آزادی میں روز افزوں اہمیت حاصل کر لی تھی۔ سوال تھا برما کی مختلف نسلوں کے درمیان تعلقات کے بارے میں، سب سے پہلے تاریخی ناول نٹ شی لونگ ۔کے مصنف نے یہ بتا دیا تھا کہ سنتھ، وادی سلطنت کے زوال کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بادشاہ زیریں برما کے مون لوگوں پر بڑے ستم توڑتا تھا۔ ناول تھابن گئی میں برما میں مختلف نسلوں کے اتحاد پر اور بھی زیادہ زور دیا گیا ہے جہاں غیر ملکی حاکم برمیوں، مون اور کیرن میں پھوٹ ڈال کر حکومت کرنے کی پالیسی پر کاربند تھے، چنانچہ ناول میں ان سب لوگوں کو متحد ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس کے برعکس ستھطوٹ تھومیں برمیوں اور شان کے درمیان مخاصمت دکھائی گئی البتہ یہ تخصیص کر دی گئی ہے کہ صرف بدھ مت کے خلاف شان لوگوں کو دشمن سمجھا جانا چاہئے۔

زیا Zeya نے ۱۹۲۱ء میں ناول ماشٹیش ویڈابوہ اور یوتھسن مونگ نے ۱۹۳۱ء میں لکھے ناول ژی میانما Ye Myanma میں مون اور برمیوں کی جنگیں دکھائی ہیں ان ناولوں کا پس منظر بھی یہی ہے لیکن اب ان ناولوں کو ملکی اتحاد اور نسلی یک جہتی کے حوالے سے ناپسند کیا جاتا ہے۔ برما میں نیشنلزم برما کی مذہبی اور ثقافتی اقدار کو زندہ رکھنے کے لئے چلائی جانے والی تحریک کا نتیجہ تھا جوں جوں یہ تحریک بڑھنے لگی سیاستدانوں کو احساس ہوا کہ قوم توان مختلف نسلوں سے مل کر بنتی ہے اس لئے ان مختلف النسل لوگوں میں اتحاد پیدا کیا جانا چاہئے۔ ایک طرف یہ طریق تھا کہ ماضی کی عظمت رفتہ کو یاد کر کے اپنے اندر جوش پیدا

کرواب اس طریق کی جگہ ماضی کو دیکھنے کے لئے نئی طرز اور نئے زاویے تلاش کئے جانے لگے۔ یہ انداز چوتھی دہائی میں بائیں بازو کے خیالات کے ساتھ ساتھ زیادہ واضح ہونے لگا۔

ڈیگن کھن کھن لی Dagon Khin Khin Le نے ۱۹۳۳ء میں شوی سن نیو Shwe Sun Nyo کے عنوان سے تاریخی ناول لکھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ یہ نئے زمانے کی روح کی نمائندگی کرتا ہے جس میں ماضی کی بجائے مستقبل کی فکر کرنے پر زور دیا گیا تھا۔ یہ ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جو ڈاکوؤں کے ایک گروہ کا سربراہ بن گیا ہے۔ اس سے پہلے یہ نوجوان ایک شاہی خاندان کا غلام تھا جسے شاہ تھیبا نے برباد کر دیا تھا۔ ہیروئن ایسی لڑکی ہے جسے بادشاہ کے حرم میں پیش کیا جانا ہے مگر وہ اس صورت حال سے بچنے کے لئے مانڈلے سے بھاگ نکلتی ہے۔ ملکہ کے ظلم و ستم اور خود بادشاہ کی خامیوں اور نااہلیوں کو خاصی تفصیلی اور وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ ہیرو شاہ تھیبا سے انتقام لینے کا مصمم ارادہ رکھتا ہے لیکن جب انگریز بالائی برما پر قبضہ کر لیتے ہیں اور شاہ اور ملکہ کو قید کر کے ہندوستان میں جلاوطن کر دیتے ہیں تب یہ ڈاکو فیصلہ کرتا ہے کہ وہ اس وقت تک غیر ملکی حملہ آوروں سے لڑتا رہے گا جب تک ایک برمی شہزادے کو تخت پر نہیں بٹھایا جاتا۔ ہیرو شوی سن نیو کی موت کے بعد اس کا بیٹا یہ جنگ جاری رکھتا ہے مگر پوتے تک آتے آتے بہت سی تبدیلیاں ہو جاتی ہیں یہ نوجوان برما اور چین کے سرحدی علاقے میں رہتا ہے جہاں اس کی ملاقات ایک بوڑھے روسی سے ہو جاتی ہے جو اسے سوشلسٹ نظریہ سے آگاہ کرتا ہے۔ ہیرو شوی سن نیو کا پوتا اپنے ڈاکوؤں کے سربراہ کی بیٹی کی بجائے بوڑھے روسی کی بیٹی سے شادی کر لیتا ہے. ڈاکوؤں کا یہ سربراہ اب بھی برمی شہزادے کی تخت نشینی کے خواب دیکھتا رہتا تھا۔ جبکہ نوجوان یہ تجویز رد کر دیتا ہے کہ وہ بیک وقت اپنے ساتھی کی بیٹی اور روسی کی بیٹی دونوں سے شادی کر لے بالواسطہ مفہوم یہ نکلتا ہے کہ یہ نوجوان بادشاہت کی بحالی سے متعلق موقف تبدیل کر لیتا ہے اور چاہتا ہے کہ مستقبل کی تعمیر بائیں بازو کے جدید نظریات پر ہو۔

تو پوری دینی پڑے گی۔ جو سماجی اور سیاسی زیادتیوں کے مجرم ہیں انہیں سزا سے بچ کر نہیں جانے دینا چاہئے۔ اور ادب کا یہ فرض ہے کہ ان خرابیوں کی نشان دہی کرے جو معاشرے کو برباد کر رہی ہیں اور ممکن حل بھی تجویز کرے۔ تھیں پی مائنٹ اپنے زمانے کے ان متعدد قوم پرستوں کی نمائندگی کرتا ہے جن کا یقین تھا کہ ان خرابیوں کا حل بائیں بازو کے سیاسی نظریات کے مطابق ہی ہو سکتا ہے۔ اس کی تحریروں سے واضح ہوتا ہے کہ جب چوتھی دہائی میں قوم پرستوں کی سرگرمیاں زور پکڑ رہی تھیں اسی رفتار سے ادب میں تلقین اور پند و نصائح کا عنصر بھی زیادہ ہوتا جاتا تھا۔

برمی ادب اور قوم پرست تحریک

ادب اور معاشرے میں دوہرا رشتہ ہوتا ہے ایک طرف ادب عہد حاضر کے خیالات و اقدار کی عکاسی کرتا ہے خصوصاً جس قسم کے حالات عہد غلامی میں برما میں تھے جہاں ادیب عوام سے دور دراز دانش وروں کے مخصوص حلقوں تک خود کو محدود نہیں کرتے دوسری طرف ادیب نئے خیالات پھیلا کر سماجی اور سیاسی آرا کو ایک معقول شکل بھی دے سکتے ہیں۔ بلکہ زیادہ اہم یہ کہ وہ عام پڑھنے والوں کے ذہنوں میں پیدا ہونے والے خیالات واحساسات اور آرزوؤں کو بھی زبان دے سکتے ہیں۔

برما میں ادب اور قومی جذبہ کا قریبی رشتہ اس وقت سے قائم ہے جب پورے برما میں انگریز حکومت قائم ہو گئی تھی۔ مانڈلے کی شکست کے فوراً بعد ہی تھیبا کی جلاوطنی پر نوحہ نما نظمیں لکھی جانے لگی تھیں۔ یہ برمی ادب میں نئی صنف سخن تھی جسے پاڈا ہمو Pa-daw-hmu کہا جاتا تھا جس کا مطلب شاہی جوڑے کو لے جانا تھا۔۔۔۔۔۔ ہر چند ماضی کوئی زیادہ بے عیب نہیں تھا مگر یہ تھا تو برما والوں کا یوں جذباتی سطح پر ماضی پرستی بھی ہوئی مگر اپنی نظموں سے برما والوں کے دلوں میں ایسے مستقبل کی خواہشیں بھی پیدا ہوئی جب ملک کی تقدیر پھر ان کے اپنے قبضے میں ہو گی۔ ان خواہشات کے نتیجے میں ہی برما میں بے شمار بغاوتیں ہوئیں (ہر چند ان میں سے بعض، حب الوطنی کے مصفا جذبات کی بجائے ذاتی خواہشات کا نتیجہ بھی ہوں گی) تاہم انگریزوں نے برما کو پر سکون بنانے والے نام نہاد عمل کے دوران کئی سالوں میں ان بغاوتوں کو کچل دیا، پھر ان خواہشات کا اظہار ان نظموں میں ہونے لگا جنہیں

دوسرا حصہ

جدو جہد
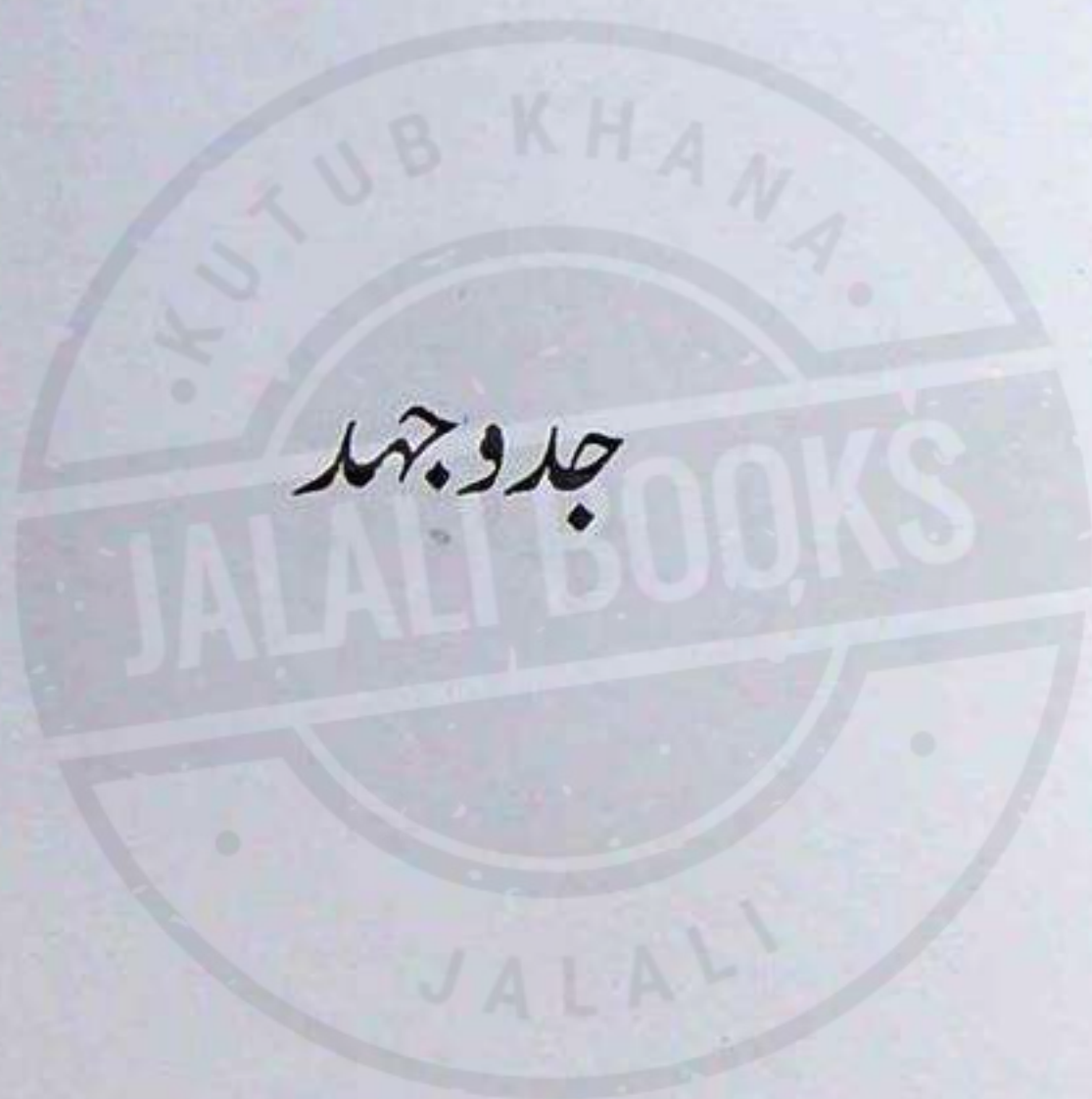
جمہوریت کی تلاش

مصنفہ نے یہ مضمون اور اس کے بعد کے دو مضامین ایک خاص منصوبہ کے تحت لکھے تھے مگر ۲۰ جولائی ۱۸۸۹ء کو نظر بندی کے باعث وہ یہ کام مکمل نہیں کر سکی۔ منصوبہ یہ تھا کہ جمہوریت اور انسانی حقوق کے حوالے سے مضامین کا ایک سلسلہ تیار کیا جائے اور پھر انہیں اپنے باپ کے نام سے معنون کر کے ـــــ بوگیوک اونگ سان کی یاد میں مضامین ـــــ کے عنوان سے کتاب شائع کر دی جائے۔

I

برما میں جمہوریت کے مخالفوں نے اس کی اہمیت کم کرنے کے لئے دو دلیلیں دی ہیں پہلی یہ کہ جمہوریت کے بنیادی اصول ہی برما کے مزاج کے مطابق نہیں دوسرے انہوں نے برما کے لوگوں کو برے بھلے کی تمیز کرنے کے شعور سے ہی بے بہرہ قرار دیا ہے۔ تیسری دنیا کے ممالک میں آمرانہ قسم کی حکومتوں نے اپنے اقتدار کو طول دینے کے لئے ہمیشہ یہی کہا ہے کہ جمہوری اصول اور ضابطے ان کے عوام کے لئے سراسر غیر ہیں۔ اس طرح بالواسطہ طور پر وہ یہ فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل کر لیتے ہیں کہ مقامی کلچر کے مطابق کون سی بات صحیح ہے اور کون سی غلط۔ یہ روائتی قسم کا پروپیگنڈہ ہے جس کا مقصد صرف سرکار کو مضبوط کرنا ہے اس پروپیگنڈہ کا تجزیہ اور مطالعہ سیاسی سائنس دانوں، قانون دانوں اور معاشرتی علوم کے ماہرین نے کیا ہے اور اسے مسترد کر دیا ہے۔ برما کئی عشروں سے دنیا میں ہونے والی سیاسی اور فکری تبدیلیوں سے الگ کاٹ کر رکھ دیا گیا ہے چنانچہ لوگوں کو اپنے طور پر یہ کام کرنا

یہ ہے کہ وہ اس میں ناکام کیوں ہوا؟ عالمی ماہرین اور دانشوروں نے ان سوالوں کا جواب بڑی تفصیل سے دیا ہے اور اپنے جواب کے حق میں تاریخی، ثقافتی، سیاسی اور معاشی عوامل کا بالتفصیل تجزیہ بھی فراہم کیا ہے۔ برما کے لوگوں کی جدید عہد کی تحقیق اور مواد تک تو رسائی نہیں ہے مگر وہ معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کے لئے مہاتما بدھ کی تعلیمات کی طرف رجوع کرتے ہیں، جن میں زوال اور بوسیدگی کی چار وجوہ دی گئی ہیں۔ (اسی حوالے سے برمی اندر کی بات کا پتہ چلا لیتے ہیں) (۱) جو کھو گیا ہے اسے دوبارہ حاصل کرنے میں ناکامی (۲) جو نقصان ہوا ہے اسے پورا نہ کرنا یا اس کی تلافی نہ کرنا (۳) معقول نظام معیشت قائم کرنے سے گریز اور (۴) بد اخلاق اور ان پڑھ لوگوں کو قائد بنا لینا۔ ان نکات کو آج کی زبان میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ جب بنیادی حقوق فوجی آمریت نے چھین لئے تو انہیں واپس حاصل کرنے کے لئے پوری پوری کوششیں نہیں کی گئی۔ صورت حال کو مزید خرابی سے بچانے کے لئے اخلاقی اور سیاسی زوال کو روکا نہیں گیا۔ معیشت کا کباڑہ ہوتا گیا اور ملک پر وہ لوگ حکمران رہے جو نہ دیانتدار ہیں نہ صاحبان فہم و فراست۔ ۱۹۶۲ء سے لے کر اب تک برما کے زوال کے بڑے بڑے اسباب جس خوبصورتی اور صفائی سے بدھ کی تعلیمات کے حوالے سے بتائے گئے ہیں کوئی جدید ساز و سامان اور فکر و نظر سے آراستہ ماہر بھی اس صفائی سے شاید ہی ان عوامل کی نشاندہی کر سکتا۔

ہمہ مقتدر سوشلزم کے تحت ایسی پالیسیوں پر عمل کیا گیا جن کی برما کو ضرورت ہی نہیں تھی جس کے نتیجے میں برما معاشی اور انتظامی گڑھے میں جا گرا ہے۔ چنانچہ حکومت نے روزمرہ زندگی کو چالو رکھنے کے لئے معاشرے کو رشوت اور بدعنوانیوں پر لگا دیا اور قواعد و ضوابط کی سرعام بے حرمتی ہونے دی۔ سالہا سال کی اخلاقی گراوٹ اور مادی زوال کے باوجود لوگوں کے دلوں میں ایک ایسے معاشرے کی تصویر زندہ ہے جس میں لوگ اور ان کے راہ نما اصول و ضوابط پر چل کر خوشحال اور تحفظ کما سکتے ہیں۔ اور ۱۹۸۸ء کی تحریک جمہوریت نے اس تصویر کو زندہ روپ میں دیکھنے کی امید کو پھر روشن کر دیا۔ بنیادی طور پر جمہوری حکومت کے قیام کا مفہوم یہ ہے کہ آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کے ذریعے منتخب ہونے والے نمائندوں کو آئینی طور پر مخصوص مدت تک کے لئے حکومت سونپ دی جائے گی۔ برما کے لوگوں کو امید ہے کہ اپنے ووٹ کو پوری ذمہ داری سے استعمال کر کے جو

نمائندے چنیں گے وہ برما کے زوال کے عمل کو روک کر ترقی کی راہ پر ڈال دیں گے۔ انہوں نے پروپیگنڈہ بازوں کے اس پروپیگنڈہ کو مسترد کر دیا ہے کہ جمہوریت برما کے لئے اجنبی اور نامانوس طرز حکومت ہے برمیوں نے یہ فیصلہ حکومت کے بارے میں اپنے قدیم نظریوں کی چھان پھٹک کے بعد کیا ہے۔

بدھ مت کا دنیا کی تاریخ کے بارے میں جو زاویہ نگاہ ہے کہ ایک بار جب معاشرہ اپنے اصل اخلاقی اور مطاہر مقام سے گر کر سماجی اور اخلاقی انتشار کا شکار ہوا تو پھر امن اور انصاف کی بحالی کے لئے ایک بادشاہ کا انتخاب کیا گیا۔ یہ حکمران تین ناموں یا القابات سے مشہور ہوا۔ مہاسماتا Mahasammata یہ نام اس لئے کہ عوام کی مکمل مرضی سے اسے حکمران بنایا گیا۔ کھاتیا Khattiya کیونکہ اسے زرعی زمینوں کا اختیار بھی حاصل ہے یا زمین اس کی جاگیریں ہیں اور راجہ Raja کیونکہ وہ دھما (نیکی، انصاف اور قانون) پر عمل کر کے لوگوں کا خلوص و محبت جیت لیتا ہے۔ اور پھر لوگوں کا پہلا منتخب حاکم ان پر صالحانہ انداز میں حکومت کرنے کے عوض صرف چاول کی پیداوار کا ایک حصہ لینے کا مجاز قرار پاتا ہے۔ بدھ مت میں عمرانی معاہدہ کے تحت قائم حکومت کا تصور یہی ہے۔ مہاسماتا جنوب مشرقی ایشیا میں انڈک انداز کی بادشاہت کے طریق پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ جدید ریاست کے تصور کے برعکس ہے یہ ایک ذاتی قسم کی بادشاہت ہی ہے جس میں وہ ہمہ گیر تسلسل نہیں جو آج کی مغربی بادشاہتوں میں پایا جاتا ہے۔ بہر طور مہاسماتا لوگوں کی اکثریتی رائے سے منتخب ہوا اور عدل و انصاف سے حکومت کرتا رہا اس اعتبار سے برما کے لوگوں کے لئے منتخب حکومت کا تصور اجنبی اور غیر ملکی نہیں ہے۔

بدھ مت میں بادشاہ کا جو تصور ہے اس کے تحت اسے یہ آسمانی حق حاصل نہیں ہو جاتا کہ وہ جس طرح چاہے حکومت کرے۔ اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ بادشاہوں کے دس فرائض، زوال کو روکنے کے لئے سات احتیاطیں اور عوام کے لئے چار امدادی نکات، بھی پورے کرے گا اور ان کے علاوہ متعدد دوسرے ضوابط کی بھی پابندی کرے گا جن میں حاکم کے بارہ کام، راہ نما کی چھ صفات، بادشاہوں کی آٹھ خوبیاں اور مصائب پر قابو پانے کے لئے چار طریقوں پر عمل پیرا ہو گا۔ اس قدیم نظام میں ایک اپنی منطق ہے مثلاً پانچ دشمنوں یا مصائب میں بادشاہ کو بھی شامل کیا گیا ہے اور اسی نظام میں برسر اقتدار لوگوں

کی اخلاقی اصلاح اور بہتری کے لئے کئی ایک اخلاقی ہدایت نامے بھی ہیں۔ برما کے لوگوں کو آمروں اور غاصبوں کی حکومت کا بہت تجربہ ہو چکا ہے اور وہ جانتے ہیں کہ ایک حکومت کے قول و فعل میں تضاد کے سبب لوگوں کو کیسے کیسے عذاب سہنے پڑتے ہیں۔

بادشاہوں کے لئے بدھ کی تعلیمات میں جو دس فرائض رکھے گئے ہیں ان سے پورے برما والے اچھی طرح آشنا ہیں اور وہ اسی کسوٹی پر دنیا کے پہلے بادشاہ اور آج کی موجودہ حکومت کی کارکردگی کو پرکھتے ہیں۔ فرائض یہ ہیں: سخاوت، اخلاق، قربانی کا جذبہ، دیانتداری، مہربانی، سادگی، کفایت شعاری، شادی، بے غصہ، عدم تشدد، صبر و تحمل، اور عدم مخالفت (یعنی عوام کی مخالفت نہیں کرنا)

پہلا فریضہ سخاوت ہے (دان Dana) حکمران سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ عوام کی فلاح و بہبود پر زیادہ توجہ دے اور دل میں یہ رکھے کہ حکومت شہریوں کی معاشی ضرورتیں پورا کرنے کی اہل ہے۔ جدید سیاسی سیاق و سباق میں اس کا یہ مطلب ہے کہ ذمہ دار حکومت کا اہم ترین فریضہ ہے کہ وہ ملک کے معاشی تحفظ کو یقینی بنائے۔

اخلاق (سیلا Sila) کا بدھ مت میں اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ پانچ اصولوں پر عمل کیا جائے یعنی (۱) زندگی یا زندہ اشیا کو ختم کرنے سے اجتناب (۲) چوری (۳) یاری یعنی ناجائز جنسی تعلق (۴) جھوٹ اور (۵) نشہ آور اشیا سے پرہیز۔ حکمران کا اخلاق بہت بلند ہونا چاہئے تاکہ وہ لوگوں سے احترام اور اعتماد حاصل کر سکے۔ ان کی خوشحالی اور مسرت کا اہتمام کر سکے اور ان کے سامنے خود ایک مثال بن کر زندہ رہے۔ جب بادشاہ خود دھما Dhauma پر عمل نہیں کرتا تو پھر سرکاری اہل کار رشوت خور اور بدعنوان ہو جاتے ہیں اور عوام کو بہت مصیبت اٹھانا پڑتی ہے۔ یہ بھی اعتقاد ہے کہ ایک بدکار یا غیر صالح حاکم ملک پر آسمانی عذاب لانے کا سبب بنتا ہے۔ ایک قوم کی ناکامیوں کی وجوہ میں سب سے بڑی وجہ حکومت کی اخلاقی طور پر ناکامی قرار پاتی ہے۔

تیسرا فرض پیریکاگا (Paricagga) کا مفہوم کبھی سخاوت کے طور پر لیا جاتا ہے اور کبھی ذاتی قربانی دینے کے جذبہ سے اگر مطلب سخاوت لیا جائے تو اس کا ذکر پہلی صفت دان (Dana) کے طور پر آچکا ہے اس لئے ذاتی قربانی کا مفہوم زیادہ مناسب ہے یعنی عوام کی خاطر ذاتی قربانی دینا گویا سخاوت کی انتہا ہے۔ عوام کی بے غرض خدمت یا حکومت

والے روبوٹوں میں سے نہیں ہوں، ہر فرد ہاں ہاں ہر فرد کو انسانی حقوق ملنے چاہیں ہم جنگلوں کے وحشی جانور نہیں ہیں، ہم عقل و فہم والے انسان ہیں، ابھی وقت ہے ہتھیاروں کے زور پر ہمیں ڈرانا چھوڑ دو اگر اختلاف کرنے والوں سے معاملہ توپوں کے ذریعہ طے کیا گیا تو پھر برما میں کوئی انسان نہیں بچے گا۔"

جیسے ہی انسانی فنون کا معاملہ جمہوری تحریک کا ایک لازمی حصہ بن گیا، اسی وقت یقین ہو گیا تھا کہ سرکاری ذرائع ابلاغ ان کا تمسخر اڑائنے. انسانی حقوق کے پورے تصور کی مذمت اور اسے برما کی ثقافت کے خلاف غیر ملکی بناوٹی رشتے قرار دینے کا عمل شروع کر دیں گے۔ ستم ظریفی ہے کہ بدھ مت برما کے قدیم کلچر کی بنیاد ہے. اور بدھ مت ہی انسان کو ایسی اشرف المخلوقات چیز سمجھتا ہے جو بدھ کے مقام تک پہنچ سکتا ہے۔ ہر انسان کے اندر اتنی صلاحیت اور قوت ہے کہ وہ سچائی کو نہ صرف خود پا سکتا ہے بلکہ اس کے حصول میں دوسروں کی مدد بھی کر سکتا ہے اس طرح بلامبالغہ انسانی زندگی سب سے زیادہ قیمتی شے ہے۔ برہما کے آسمانوں سے زمین پر گری سوئی کے لئے آسان ہے کہ زمین میں گڑی سوئی کو پالے مگر ایک انسان کا پیدا ہونا بہت مشکل ہے۔"

جابر حکومتیں اپنی ریاست میں آباد قیمتی انسانوں کو انسان شمار نہیں کرتیں۔ شہریوں کو بے چہرہ، بے دماغ اور مجبور محض سمجھتی ہیں کہ جب چاہا انہیں استعمال کر لیا گویا خلق خدا حادثے کے طور پر ملک میں آگئی ہے وہ اس ملک کی رگوں میں دوڑنے والا خون نہیں۔ لوگوں کی حب الوطنی اپنی سرزمین سے پناہ محبت اور خیال ایسی شفاف شے کو آمر حاکموں کی سیاہ کاریوں پر پردہ ڈالنے کے لئے استعمال کر کے داغدار کر دیا گیا ہے۔ یہ حاکم اپنے بہت ہی محدود مفادات کو ملکی مفادات قرار دے رہے ہیں۔ توقع کی جاتی ہے کہ سرکاری طور پر جو کچھ کیا جا رہا ہے اس کو چون و چراں کے بغیر قبول کر لیا جائے جیسے ایک زمانے میں مغرب میں بائبل احکامات کو اندھا دھند قبول کرنے کی روایت رائخ ہو گئی تھی حالانکہ برما میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کیونکہ بدھ مت کا رویہ زیادہ آزادانہ اور فراخ ہے۔

"جو بار بار سننے کے بعد یا گوش بگوش سننے کے بعد حاصل ہوں اس پر بھروسہ نہ کرو. مناسب یہ ہے کہ اس پر شبہ ظاہر کرو. اسے غیر یقینی سمجھو. نہ روایات اور نہ ہی افواہوں پر یقین کرو جب تمہیں علم ہو کہ کچھ چیزیں غلیظ

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود وہ بیمار دانش کا شکار ہو کر عوام پر بھی اسی کو تھوپتے چلے جاتے ہیں۔
پروپیگنڈہ اور ڈرانا دھمکانا دراصل جبر کا دوگانا ہے جو ان لوگوں کو سنایا جاتا ہے جو بے اعتمادی اور خوف کی فضا میں زندگی بسر کر رہے ہیں الگ الگ ہوتے ہیں اور خاموش رہنا سیکھ گئے ہوتے ہیں۔ لیکن عوام کے دلوں میں ہر وقت یہ امید موجود رہتی ہے کہ کوئی ایسا نظام ہو جو انہیں چاول کھانے والے روبوٹ کی سطح سے اٹھا کر انسانوں کو مرتبہ دے دے جو آزادی سے سوچ اور بول سکتے ہیں اور اپنے حقوق کے سائے میں اپنے سر کو بلند رکھ سکتے ہیں۔

برما میں جمہوریت کی جدوجہد شروع سے ہی خطروں میں گھری چلی آ رہی ہے۔ جمہوری تحریک اقتدار کی مساوی اور منصفانہ تقسیم چاہتی ہے لیکن امتیازی حق اقتدار ایک طویل عرصہ سے اشراف یا طبقہ بالا کے چھوٹے سے گروہ کے ہاتھ میں ہے جو ہر قیمت پر اس اختیار اور مراعات کو اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے، چنانچہ ان کے خلاف جمہوری تحریک غالباً لمبی اور مشکل ہوگی۔ امید اور رجاء تو خیر دبائی نہیں جا سکتیں مگر آثار سے گمان یہی ہوتا ہے کہ لوگوں کی تبدیلی کی خواہش کو حکمران کمینگی کی حد تک سختی سے دبائیں گے۔ اکثر اوقات حیرت سے یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ کیا اتنی جابر حکومت واقعی ہمیں جمہوریت دے دے گی اور اس کا جواب ہوتا ہے، آزادی، انصاف اور دوسرے سماجی اور سیاسی حقوق کوئی دیتا نہیں، جرات، عزم وارادہ اور قربانی دے کر خریدے جاتے ہیں۔ جمہوریت کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔

جب معاشرے میں ضروری تبدیلیوں کو سرکاری پالیسیوں یا معاشرے کی بے حسی کے باعث وقوع پذیر نہیں ہونے دیا جاتا تب انقلاب آتا ہے۔ لیکن جمہوری ادارے اور جمہوری روایت ایسے حالات پیدا کرتی ہے کہ جن میں رہ کر تشدد اور فساد سے ہٹ کر پرامن طور پر یہ تبدیلیاں لائی جا سکتی ہیں۔ مگر مطلق الحکم حاکم تبدیلی کو ایک لعنت جانتے ہیں یہ آمریت اپنی سخت پالیسیوں میں کسی طور تبدیلی برداشت نہیں کرتی۔ جمہوریت ایک دوسرے سے اختلاف کرنے کا حق دیتی ہے دوسری طرف اس اختلاف کو پرامن طریق سے رفع کرانے کا فریضہ اپنے سر لیتی ہے۔ آمرانہ حکومتیں اپنے قول وفعل پر تنقید کو اپنے لئے عسکری چیلنج سمجھتی ہیں۔ حزب اختلاف یا مخالفت کو پر تشدد ٹکراؤ کے برابر جانتی ہیں ایک

سازی کو ظلم بلکہ گناہ سمجھا جاتا ہے۔ بدھ مت میں قانون کے تصور کی بنیاد دھما Dhamma یعنی صالحیت اور نیکی پر ہے نہ کہ طاقت اور زور پر۔ جس کے ذریعے بے سہارا لوگوں پر سخت اور لچک سے عاری قوانین مسلط کر دیئے جاتے ہیں۔ کسی ملک یا معاشرے میں نظام انصاف کے پرکھنے کا یہ معیار ہوتا ہے کہ وہاں سب سے کمزور افراد کو کہاں تک تحفظ حاصل ہے۔

جب کسی معاشرے میں انصاف نہیں ہوتا تب اس معاشرے میں امن قائم نہیں رہتا۔ انسانی حقوق کے عالمی منشور میں تسلیم کیا گیا ہے آدمی کو اس قدر مجبور نہ کر دیا جائے کہ ظلم وستم کے خلاف لڑنے کا کوئی راستہ ہی نہ رہے اور وہ آخری طریقہ یعنی بغاوت پر اتر آئے اور انسانی حقوق کو قانونی تحفظ دیا جانا چاہئے ایسے **منصفانہ** قوانین جو انسانی حقوق کی پاسداری کرتے ہیں معاشرے میں امن اور تحفظ قائم کرتے ہیں مگر وہی بد دماغ ایسے قوانین کے انکاری ہوں گے جو امن کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ تمام مخالف خاموش ہو جائیں تحفظ سے یہ مطلب نکالتے ہیں کہ ان کا اپنا اقتدار محفوظ رہے۔ برما والے امن اور تحفظ کو سائے کی ٹھنڈک کے برابر مانتے ہیں۔

درخت کا سایہ بلاشبہ ٹھنڈا ہے
والدین کا سایہ زیادہ ٹھنڈا ہے
استادوں کا سایہ اور بھی ٹھنڈا ہے
اس سے بھی زیادہ ٹھنڈا سایہ حاکم کا ہے
مگر ان سب سے زیادہ ٹھنڈا سایہ بدھ کی تعلیمات کا ہے

لوگوں کو امن اور تحفظ کا سایہ فراہم کرنے کے لئے حاکم کو ہر صورت بدھ کی تعلیمات سے فیض حاصل کرنا چاہئے۔ ان تعلیمات میں مرکزی حیثیت سچائی، صالحیت اور شفقت کے تصورات کو حاصل ہے۔ برما کے لوگ جس حکومت کے قیام کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں وہ انہی صفات کی حامل ہو گی۔

ایک انقلابی تحریک میں یہ خطرہ پوشیدہ ہوتا ہے کہ کہیں فوری ضرورتوں یا مصلحتوں کے باعث تحریک کے روحانی مقاصد پس پشت نہ جا پڑیں یا بالکل ہی ان کی نفی نہ ہو جائے۔ ان مقاصد کی اہمیت اور اولیت محض آدرش (آئیڈیلزم) ہی نہیں بلکہ ضروری تھی تاکہ

خوف سے رہائی

Freedom from Fear

۱۹۹۰ء میں آنگ سان سو چی کو یورپی پارلیمینٹ کی طرف سے انعام دینے کا اعلان ہوا انعام دینے کی تقریب مصنفہ کی غیر موجودگی میں جولائی ۱۹۹۱ء میں سٹراسٹرگ میں ہوئی۔ یہ مضمون اس موقع پر کتاب کے مرتب نے جاری کیا اور اسی ہفتے یہ جزوی یا کلی طور پر مندرجہ ذیل رسائل و جرائد میں شائع ہوا۔ ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ، نیویارک ٹائمز، فار ایسٹ اکنامک ریولو، بنکاک پوسٹ، ٹائمز آف انڈیا اور اس کے علاوہ جرمنی ناروے اور آئس لینڈ کے اخبارات میں بھی۔

اقتدار نہیں خوف بدعنوانی کو جنم دیتا ہے۔ جن کے پاس اقتدار ہے وہ اقتدار سے محروم ہو جانے کے خوف سے بدعنوان ہو جاتے ہیں اور جو اقتدار کے تابع ہیں انہیں طاقت کے تازیانہ کا خوف بدعنوان بنا دیتا ہے۔ برما والے بدعنوانی کی چار اقسام گتی سے واقف ہیں۔ چنداگتی خواہش کی تکمیل کے لئے بدعنوان ہونا...... رشوت کے لئے یا اپنے عزیزوں کے لئے راہ راست سے بھٹک جانا۔ داس گتی جن سے عناد ہے انہیں نقصان پہنچانے کے لئے راہ راست چھوڑ دینا اور موگا گتی وہ انحراف ہے جو بے خبری یا جہالت کی وجہ سے ہوتا ہے مگر ان چاروں میں سے بدترین گتی کہلاتی ہے بھے (بھو) ڈر تو آہستہ آہستہ اچھائی اور برائی کے احساس کو ہی ختم کر کے رکھ دیتا ہے اور اکثر باقی تین قسم کے فساد یا خرابیوں کا سبب بھی یہی خوف ہوتا ہے۔

چنداگتی ہوس کا نتیجہ نہ ہو تو کچھ پانے کے خوف یا اپنے پیاروں سے تعلق ٹوٹ

شیشے کے ٹکڑے ہوتے
ہاتھوں کی مٹھیوں میں
شیشے کے چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑے میں اپنے آپ کو ان ہاتھوں سے بچانے کی خوبی ہوتی ہے جو اسے ریزہ ریزہ کرنا چاہتے ہیں۔ اسے دبا کر رکھنا چاہتے ہیں، شیشے کا یہ علامتی مفہوم لوگوں کو وہ حوصلہ اور ہمت عطا کرتا ہے جو اپنے آپ کو جبر کے حصار سے آزاد کرانے کے لئے لازم و ملزوم ہے۔ بوگیوک اونگ سان خود کو انقلابی سمجھا کرتے تھے اور برما پر آزمائش کے دنوں میں، جو مشکلات ٹوٹیں ان کا حل تلاش کرنے میں گم رہتے تھے۔ انہوں نے لوگوں کو ایک ہی تلقین کی خود اپنے آپ میں حوصلہ پیدا کرو، "دوسروں کے ہمت و حوصلہ پر تکیہ مت کرو۔ آپ میں سے ہر ایک کو شیر دلیر مجاہد بننے کے لئے قربانیاں دینا ہوں گی اور سچی آزادی تبھی حاصل ہو گی۔

جس معاشرے میں خوف زندہ رہنے کے لئے بھی ایک اٹل ضرورت بن گیا ہو وہاں آدمی کو سچا اور کھرا رہنے کے لئے جس قدر حوصلے، ہمت اور پامردی کی ضرورت ہے اس کا اندازہ ان خوش قسمت لوگوں کو نہیں ہو سکتا جو قانون کی پاسداری کرنے والے ملکوں میں رہتے ہیں۔ منصفانہ قانون صرف بدعنوان اور رشوت خور افراد کو کڑی سزا دے کر رشوت اور بدعنوانی کو ہی نہیں روکتا وہ ایسا معاشرہ بنانے میں بھی مددگار ہوتا ہے جہاں لوگ، بدعنوانی میں ملوث ہوئے بغیر عزت اور وقار کے ساتھ زندہ رہنے کا سامان کر سکتے ہیں۔ جہاں اس قسم کا قانون نہیں انصاف کے اصول اور شرافت کو سربلند رکھنے کے فرض کا بوجھ عام لوگوں کے کندھوں پر آن پڑتا ہے۔ عوام اپنے ایسے ہی جانکاہ اور طویل صبر آزما اجتماعی عمل کے نتیجے میں اپنے اس معاشرے کو تبدیل کر دیں گے، جہاں فکر و فہم اور ضمیر پر خوف کے پہرے ہیں اور اسے ایک ایسے معاشرے میں ڈھال دیں گے جہاں انسان کی فطرت میں موجود تخریبی رجحانات کو دبانے والا نظام قانون ہو گا جو انسان کی معاشرہ میں عدل اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی خواہش کو تقویت فراہم کرے گا۔

آج کے عہد میں ٹیکنالوجی نے بہت ترقی کر لی ہے جس نے ایسے تباہ کن ہتھیار بنا لئے ہیں جو کمزور اور بے سہارا اقوام پر غلبہ پانے کے لئے بے اصول مگر طاقتور ملک استعمال کر سکتے ہیں بلکہ استعمال کیے جا رہے ہیں۔ ایسی صورتحال میں یہ ضرورت اور بھی شدید ہو جاتی

ہے کہ سیاست کو فوجی اور بین الاقوامی سطح پر اخلاقیات کا پابند کیا جائے۔ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے عالمی منشور میں کہا گیا ہے۔ "مذہب، نسل اور قومیت کے امتیاز کے بغیر ہر انسان بنیادی انسانی حقوق کا حقدار ہے اور اس لئے ہر فرد اور معاشرے کے سبھی شعبوں کا فرض ہے وہ ان حقوق اور آزادیوں کے حصول کے لئے جہد آزما ہو۔ مگر جب تک ایسی حکومتیں قائم ہیں جن کا وجود لوگوں کے اجتماعی فیصلے کی بجائے جبر و استبداد کا مرہون منت ہے اور مخصوص مفادات والے گروہ موجود ہیں جنہیں دیرپا امن اور خوشحالی کے قیام کی بجائے اپنے فوری مفادات عزیز ہوں اس وقت تک انسانی حقوق کے تحفظ اور فروغ کی جدوجہد آدھی ہی رہے گی۔ ظلم و ستم کے میدان لگے رہیں گے جہاں جبر کے ماروں کو انسانی کنبہ کے حصہ کی حیثیت سے محض اپنے وسائل اور اپنی طاقت پر بھروسہ کر کے اپنے پیدائشی حقوق کا تحفظ کرنا ہو گا۔

انقلاب کا اصل جوہروہ جذبہ ہوتا ہے جو قوم کی ترقی کی راہ متعین کرنے والی فکری اور نظری اقدار سے پیدا ہوتا ہے۔ جس انقلاب کا مقصد صرف سرکاری پالیسیوں اور اداروں کے ظاہر باہر کو ہی تبدیل کرنا ہو اسے سچی کامیابی شاید ہی نصیب ہو۔ اگر انقلاب باطن میں تبدیلی نہیں لاتا تو جن طاقتوں یا عوامل نے ماضی کے نظام میں خرابیاں پیدا کی ہوتی ہیں۔ وہ اپنا کام کرتی رہتی ہیں اور احیا و اصلاح کے عمل کے لئے مستقل خطرہ بنی رہتی ہیں۔ صرف آزادی، جمہوریت اور انسانی حقوق کا مطالبہ کرنا ہی کافی نہیں، لازم ہے کہ اس جدوجہد کے دوران پورے اجتماعی عزم و ارادے کے ساتھ سچ کی خاطر قربانیاں دی جائیں اور ہوس، کدورت، بے خبری اور خوف کے خانماں خراب کرنے والے اثرات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے۔

کہا جاتا ہے کہ ولی گنہگار ہوتے ہیں مگر وہ ہمہ وقت گناہوں کے خلاف بر سرپیکار رہتے ہیں۔ اسی طرح آزاد لوگ بھی ایک طرح سے زیر بار ہوتے ہیں آزادی کو برقرار اور تابناک رکھنے کے لئے انہیں مسلسل جدوجہد کرنا ہوتی ہے تاکہ وہ یہ ذمہ داریاں نبھا سکیں اور ہر وقت اپنے آپ کو اس معاشرہ کے سنوارنے کا اہل ثابت کرتے رہیں۔ انسان سب سے زیادہ اس بات کی تمنا رکھتا ہے کہ اس کی زندگی بھرپور اور پر سکون ہو۔ اگر کوئی قوم اپنے اندر ایسے مضبوط جمہوری ادارے قائم کرنا چاہتی ہے جو ریاست کی طاقت کی زبردستی

کے خلاف عوام کے لئے پکی ضمانت ثابت ہوں تو اسے سب سے پہلے اپنے دل و دماغ کو خوف اور بے حسی سے آزاد کرانا ہو گا۔

اونگ سان جو کہتے تھے سب سے پہلے خود اس پر عمل کیا کرتے تھے۔ انہوں نے مسلسل جرات کا مظاہرہ کیا اور یہ جرات صرف جسمانی نہیں تھی بلکہ ایسی جرات جس کے بل پر وہ سچ بول جاتے تھے۔ اپنی بات کا پہرہ دیتے تھے۔ تنقید برداشت کرتے تھے، اپنی غلطیوں کو تسلیم کرتے تھے، مخالف سے مکالمہ کرتے تھے اور پھر عوام کو موقع دیتے تھے کہ وہ ان کی قائدانہ صلاحیتوں کے بارے میں اندازہ اور فیصلہ کر سکیں۔ یہی اخلاقی جرات تھی جس کی بنا پر انہیں ہمیشہ برما میں عزت و وقار اور عوام کی محبت حاصل رہے گی۔ اس لئے نہیں کہ وہ ایک جنگ آزما ہیرو تھے، بلکہ اس لئے کہ وہ قوم کا جذبہ متحرکہ اور ضمیر تھے۔

پنڈت نہرو نے جو الفاظ مہاتما گاندھی کے لئے استعمال کیے تھے وہی اونگ سان کے بارے میں دہرائے جاسکتے ہیں "اس کی نظر میں ہمیشہ عوام کی بہبود کو اولین حیثیت حاصل رہی اور اس کے حصول کے لئے ان کی تعلیمات کا حاصل یہ تھا کہ ہر کام بے خوف ہو کر اور پوری سچائی کے ساتھ کرو۔"

گاندھی عدم تشدد کا پیامبر تھا جب کہ ایک قومی فوج کے بانی اونگ سان اس سے بہت مختلف قسم کی شخصیت تھے، مگر چونکہ آمریت جہاں کہیں ہو اور جس زمانے میں بھی ہو اس کے چیلنج ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اس لئے جو اس آمریت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ان کے کردار میں ایک سی صفات بھی شامل ہوتی ہیں۔ نہرو کا خیال ہے کہ گاندھی نے ہندوستان کے عوام میں حوصلہ اور جرات کا جذبہ پیدا کر کے بڑا کارنامہ کیا تھا۔ نہرو خود جدید قسم کا سیاسی راہنما تھا مگر جب اس نے بیسویں صدی میں آزادی کے حصول کے لئے بنیادی ضرورتوں پر غور کیا تو قدیم ہندوستان کے فلسفہ سے مدد لینے پر مجبور ہو گیا۔ "دنیا میں کسی قوم یا فرد کے لئے اگر سب سے بڑی کوئی ودیعت ہے تو وہ ہے ابھے، بے خوفی نہ صرف جسمانی حوصلہ اور توانائی بلکہ دل و دماغ کی خوف سے مکمل طور پر آزادی۔"

بے خوفی واقعی ایک تحفہ ہو سکتی ہے مگر اس سے بھی بڑی بات ہے وہ حوصلہ جو تجربے سے حاصل کیا گیا ہو، وہ حوصلہ جو خوف کی حکمرانی سے انکار کرنے کی عادت سے پیدا ہوتا ہے وہ حوصلہ جو بدترین حالات کے باوقار طریقے سے مقابلہ کرنے سے پیدا ہوتا اور وہ

وقار اور سربلندی جو شدید اور مسلسل دباؤ کے ہوتے ہوئے قائم رکھی جاتی ہے۔

جو نظام بنیادی انسانی حقوق کو تسلیم ہی نہ کرتا ہو اس میں خوف ہی کی حکمرانی ہوتی ہے۔ قید و بند کا خوف، تشدد کا خوف موت کا خوف، دوستوں عزیزواقارب بال بچوں، جائداد اور رزق کے کھو جانے کا خوف، غربت کا خوف، تنہائی کا خوف اور ناکامیوں کا ڈر۔ خوف کی ایک غیر محسوس مگر بدترین صورت یہ ہوتی ہے کہ عیار عقل سوبھیس بدل لیتی ہے اور جو انسان اپنی روزمرہ کی زندگی میں اپنی عزت نفس اور انسانی وقار کی خاطر حوصلے اور جرات کا مظاہرہ کرتا ہے اسے بھی احمقانہ، سرکشانہ، یا بے معنی قرار دینے لگتی ہے۔ جن لوگوں نے لاٹھی اور بھینس کے فلسفے والی حکومت کے ڈنڈے کے خوف تلے زندگی گزاری ہو ان کے لئے خوف کے اترتے ہوئے بخار سے خود کو آزاد کرانا بھی بڑا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن بعض اوقات ریاستی مشینری کی تباہ کن طاقت کے سامنے جرات، حوصلہ اور بہادری بار بار مقابلہ کرتی ہے اس لئے کہ خوف ایک مہذب انسان کی فطرت کا حصہ نہیں ہوتا۔

بدترین طاقت کے مقابلے میں حوصلے اور برداشت کا سرچشمہ یہ ایمان ہوتا ہے کہ انسان کو تاریخ اور اخلاق کے مشترکہ احساس سے لیس ہو کر روحانی مادی ترقی کی راہ میں ہر بلا کا مقابلہ کرنا ہے اور ان پر فتح پانا ہی انسان کا مقدر ہے۔ ہر دم اپنی بہتری، نجات اور شفاعت کے لئے سرگرم کار رہنا ہی انسان کو اشرف المخلوق کی حیثیت سے ممتاز بناتا ہے۔ انسان کے اندر جو ازلی جذبہ ہے اور تکمیل یا کامل ہونے کے حصول کا جذبہ ہے۔اس میں منزل کو پانے کے لئے ذہانت سے راستہ بنانے کی آس ہے، اس راستے پر چلنے کی قوت ارادی ہے اور منزل پانے یا نہ پانے کا نہیں بلکہ اس بات پر انحصار کہ انسان دور کے فاصلے اور کتنے مختصر کر چلا ہے۔ انسان کا خواب ایک ایسی دنیا بنانا ہے جو فکر و نظر اور انسانیت کے معیاروں پر پوری اترے جو اسے قوموں اور معاشروں کو خوف اور احتیاج سے آزاد کرانے کی جرات بھی دے اور اس راہ میں صعوبتوں کو برداشت کرنے کا حوصلہ بھی۔ سچ، عدل اور مہربانی کے تصورات محض بوسیدہ باتیں نہیں صرف اور صرف یہی صفات ہیں جو بہیمانہ طاقت کے سامنے سینہ سپر ہوتی ہیں۔

سے جوڑ دیا جاتا ہے تو یہ بالا کار ابن جاتا ہے جس کا مطلب ہے، تشدد، فساد۔ دوسرے لفظوں میں جب زور اور طاقت کو مقررہ حدود سے باہر استعمال کیا جائے تو وہ تباہ کن ہو جاتی ہے۔ اور جس زمانے میں بے شمار سماجی اور سیاسی تبدیلیاں کی جا رہی ہوں ان دنوں اگر طاقت اصولوں سے ہٹ کر استعمال ہونے لگے تو حالات بہت نازک ہو جاتے ہیں ایسا ہی وقت تھا جب آنگ سان برما کی تحریک آزادی کے عروج پر تھے۔ وہ بدھ خانقاہی سکول کی پیداوار تھے، لازماً طاقت کو ذہنی اور روحانی طاقت سمجھتے ہوئے یہ بھی جانتے تھے کہ انہیں پانچ بالا (اندریانی یا کنٹرول کرنے والی صلاحیتیں) کے ذریعے کنٹرول کیا جاتا ہے اور وہ ہیں اعتماد، توانائی، توجہ، ذہنی نظم وضبط اور دانائی۔ دنیاوی نقطۂ نظر سے جو پانچ صلاحیتیں یا طاقتیں تھیں ان میں چال چلن، جسم، دولت، علم اور دوستی شامل تھیں۔ جو پہلے کے مقابلے میں نسبتاً کم تر سمجھی جاتی ہیں۔ یہ باعزت طریقے سے اسی وقت بار آور ثابت ہو سکتی ہیں۔ جب روح اور ذہن کی تربیت ایک خاص ڈھب پر کی جائے۔ آنگ سان نے طاقت کے منفی اور مثبت استعمال کی عقلی تفہیم تک ہی خود کو محدود نہیں رکھا تھا۔ ایک نو آموز فوج کے سربراہ کی حیثیت سے جسے ابھی ایک منظم فوجی تنظیم میں ڈھالا جانا تھا اور ایک ایسی قومی تحریک کے راہ نما کی حیثیت سے جس میں متلون مزاج عناصر شامل تھے آنگ سان نے بے مہار طاقت کے عملی خطرات سے بخوبی آگاہی حاصل کر لی تھی۔

آنگ سان نے جس فوج کی بنیاد رکھی تھی اس کے بارے میں ان کا تصور یہ تھا کہ وہ اخلاق کی سخت پابند اور ایسے باعزت ادارے کے طور پر ابھرے گی جس میں قربانی کا جذبہ اور اجتماعی نظم وضبط، بے پناہ ہو گا، اسے کسی صورت بدعنوانی کی ہوا نہیں لگ سکے گی اور اس کی ساری طاقت کسی بھی ذاتی مفاد کی بجائے قوم کے لئے وقف ہو گی۔ وہ اپنے سپاہیوں کو تلقین کرتے تھے کہ ایسی کوئی صورت اختیار نہ کریں جس میں ان کے اسلحے کو جبر کا ہتھیار سمجھا جانے لگے۔ انہوں نے اس انسانی کمزوری کا حوالہ دیا کہ طاقتور غریب کو نشانہ بنانے اور بے عزت کرنے کے لئے طاقت کا استعمال کرتا ہے، اور کہا کہ وہ غیر اخلاقی طاقت کا ڈٹ کر مقابلہ کریں اور کمزوروں اور غریبوں سے عدل اور انصاف کریں۔ انہوں نے کہا کہ اگر لوگوں کے دل میں اس فوج کے لئے بھی نفرت پیدا ہو گئی تو اس کا یہ مطلب ہو گا کہ جس مقصد کے لئے اسے قائم کیا گیا تھا لوگوں کی نظر میں وہ بھی ناپاک ہو گیا۔ "......اس فوج کو

نہیں پہنچا سکتا اس لئے انہوں نے عوام سے کہا کہ وہ ان کی پشت پر پورے عزم وارادہ سے کھڑے رہیں۔ وہ جانتے تھے کہ سچی حمایت زبردستی حاصل نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی وہ لوگوں کی خوشامد کر کے ان سے جھوٹے وعدے کر کے ان کی حمایت حاصل کریں گے۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اگر برما کو ایک جنگ زدہ ملک سے ایک آزاد اور خود مختار ملک بنانا ہے تو پھر عوام اور ان کے درمیان اعتماد اور احترام صرف اور صرف دیانتداری پر استوار رہ سکتا ہے۔ سیاسی مکروفریب اور دھوکہ بازی سے عوام کی بے حرمتی ہوگی اور خود ان کی عزت نفس پر داغ لگے گا۔

آنگ سان نے ساری عمر صرف اس مفروضے پر کام کیا کہ برما کے لوگ سمجھدار ہیں، وہ سچ اور جھوٹ میں امتیاز کر لیتے ہیں اور جھوٹ پر سچائی کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ مفروضہ غلط ثابت نہیں ہوا۔ لوگوں نے ان پر بھرپور اعتماد کیا، ان کی کوششوں کی پوری حمایت کی اور اپریل ۱۹۴۷ء کے انتخابات میں ان کی پارٹی انٹی فاشسٹ پیپلز فریڈم لیگ کے امیدواروں کو بھاری اکثریت سے کامیاب کرایا۔

آنگ سان نے سرکاری اختیارات حاصل کر کے بھی اسے اپنے لئے زیادہ باعث فخر نہیں سمجھا انہیں سب سے زیادہ مان اس بات پر تھا کہ لوگوں نے انہیں اپنا راہ نما بنا رکھا ہے۔ انہوں نے لوگوں کی قیادت کو بہت بڑی ذمہ داری جانا اسے ایک عوام کی طرف تفویض کردہ مقدس فرض جانا کہ وہ دیانتداری سے وہ کچھ کر جائیں جس کی بنا پر لوگوں نے انہیں قائد بنایا ہے اور اس کام میں نہ تہمت وافترا سے گھبرائیں اور نہ موت سے۔ اور اگر وہ ان فرائض سے عہدہ برا نہیں ہوتے تو پھر انہیں قیادت کے مقام سے بھی محروم کر دیا جائے گا۔ جس روز انہوں نے یہ کہا کہ اگر لوگوں کے دلوں میں ان کی اور ان کی حکومت کی عزت نہ رہی وہ مستعفی ہو جائیں گے تو لوگوں کو علم تھا کہ یہ شخص صرف زبانی کلامی دعوے نہیں کر رہا بلکہ اپنے قول کا پکا ہے یہ وعدہ ہے جسے وہ پورا کرے گا۔ اس سپاہی اور مدبر کے لئے ایسی حکومت میں کوئی کشش نہیں رہ جاتی جس کے نزدیک طاقت کا صرف ایک ہی استعمال ہے اور وہ استعمال عدل وانصاف کے نصب العین کے حصول کے لئے ہو۔

کسی قوم کے ہیرو دراصل اس کی امنگوں اور تمناؤں کی علامت ہوتے ہیں جبکہ اس کے اصل لیڈر اس بات کا مظہر ہوتے ہیں کہ وہ کہاں تک ان تمناؤں کو عمل کے روپ میں

جمہوریہ برما بننے کے پورے گیارہ مہینے پہلے کیے گئے تھے۔

جب آزادی ان کے وطن میں آئی وہ زندہ نہیں تھے۔ وہ اپنے لوگوں کو ذہین، سمجھدار اور خیرسگالی کے جذبے سے معمور جانتے تھے اسی اعتماد کے باعث وہ دشمنوں کے لئے آسان نشانہ بن گئے، جنہیں اصولوں کا نہیں اقتدار کا لپکا تھا کہا جاتا ہے کہ وہ جس قدر توجہ اپنے خوابوں کو عملی صورت میں ڈھالنے پر دیتے تھے اتنی توجہ اپنے ذاتی تحفظ پر بھی دیتے تو قاتلوں کی گولیوں کا شکار نہ ہوتے۔ مگر اس صورت میں تو اونگ سان نہ ہوتے جسے برما والے بوگیوک کہتے تھے ...... عظیم بوہ جس نے اس لیڈر کی مثال زندہ کر دکھائی جو قوم کی قوت و عظمت کا مظہر ہوتا ہے۔
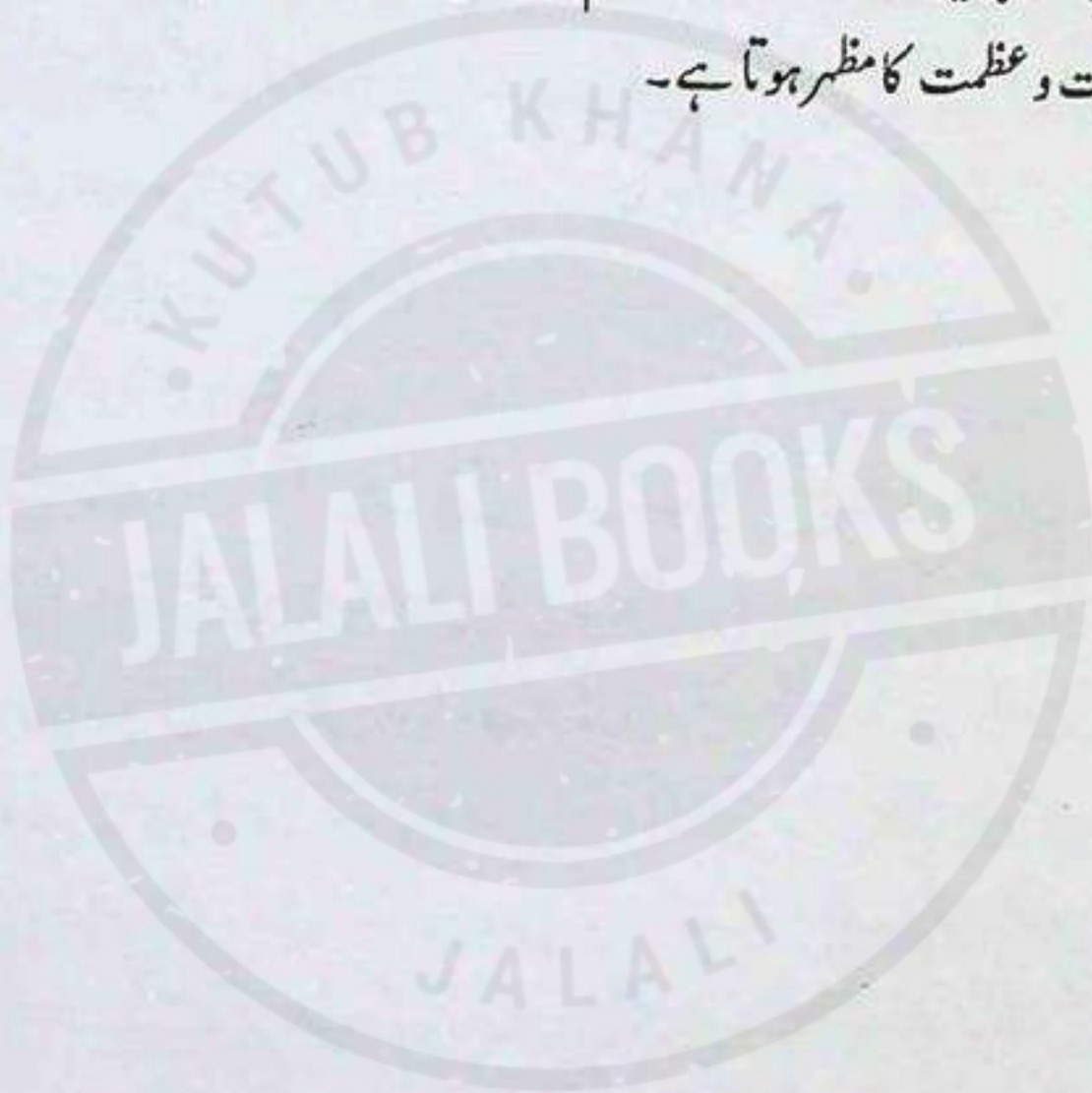
پہلے پہل

"عوامی مشاورتی کمیٹی کی تشکیل" کے عنوان سے یہ کھلا خط، برما کی کونسل آف سٹیٹ کے سیکرٹری تھورا یو کیئہ ہٹن Thura U Kyaw Htin کے نام بھیجا گیا تھا، اس پر آنگ سان سوچی اور ہوئی مائنٹ نے دستخط کئے تھے اور برما کی بعض سیاسی شخصیتوں نے اس کی حمایت اور تصدیق کی تھی۔ حکام نے اس پر بات چیت کرنے سے انکار کر دیا تھا مگر خیال کیا جاتا ہے کہ انہوں نے لوگوں کی آرزوؤں کا جائزہ لینے کے لئے جو کمیشن بنایا تھا اس کا تصور اسی خط سے لیا گیا تھا، یہ خط آنگ سان سوچی کا سیاست میں پہلا قدم تھا، اس نے انگریزی ترجمہ خود کیا تھا۔

۱۵ر اگست ۱۹۸۸ء

۱۔ ۱۰ر اگست ۱۹۸۸ء کو سنگھا مہانیکا کا کمیٹی کے قابل احترام سیداوس (بودھ ایبٹ) نے مندرجہ ذیل اپیل کی تھی:

"سنگھا اور عوام قانون کے دائرے کے اندر پرامن رہیں، پرامن طریقے سے حکومت کو اپنے مطالبات سے آگاہ کریں...... حکومت سے خاص طور پر درخواست کی گئی ہے کہ وہ لوگوں کے جائز مطالبات جس قدر بھی ممکن ہو پورے کرے۔"

ہم متذکرہ بالا ہدایت کے مطابق قدم اٹھا رہے ہیں اس کے علاوہ وزیراعظم تھورا یوٹن ٹن Thura U Tun Tin نے بھی کہا تھا:

"قابل حد احترام سیداوس نے حکومت سے جو خاص اپیل کی ہے اس

ہے اور ڈر ہے کہ کہیں یہ صورت زیادہ شدت نہ پکڑ لے۔

۵۔ ہم ملک میں امن اور خوشحالی کے لئے مقدور بھر یہ کوششیں کرنے کے خواہش مند ہیں کہ، قتل و غارت اور بغاوت کی سی صورت سے ملک کو بچایا جائے، پر امن ذرائع سے ملک میں امن کی بحالی اور تعمیر نو کا کام، سیاسی استحکام، ممکن حد تک عوامی مطالبات کی تکمیل، سیاسی، سول اور بنیادی انسانی حقوق کی بحالی، عوام اور ٹٹما ڈوا کے درمیان کسی ایسی تقسیم سے بچنا جس سے ملک کی تاریخ تک داغدار ہو جائے۔ موجودہ صورت حال نظرانداز نہیں کی جا سکتی ہے اس لئے ہم یہ فرض ادا کرنے کے لئے تیار ہیں کہ ہم سب سنگھا اور عوام سے مل کر ملکی اور عوامی مفادات کے لئے سرگرم ہو جائیں۔

۶۔ متذکرہ بالا نکات کے حوالے سے ہم مندرجہ ذیل تجاویز پیش کر رہے ہیں جن کا مقصد ہے کہ اس وقت برما میں جو سیاسی معاشی اور سول اور فوجی مشکلات ہیں انہیں دور کیا جائے۔

۷۔ (i) ہم نہ اختیارات چاہتے ہیں نہ کسی بھی صورت میں مراعات کے طالب ہیں۔

(ii) نہ ہم لینزن پارٹی میں شامل ہونا چاہتے ہیں نہ ہی کسی مخلوط حکومت میں نہ ہی یک جماعتی نظام میں با ہنھیو لمنا پارلیمینٹ میں آنا چاہتے ہیں۔

(iii) ہم جماعتی حیثیت سے نہیں آزادانہ طور پر ملکی حالات کو بہتر کرنا چاہتے ہیں (لیکن اگر ضرورت پڑی تو پارٹی سے بھی مشورہ کر لیں گے)

(iv) ہم اس اصول کے تحت کام کریں گے کہ جہاں ایک ناکام ہوا ہے وہاں بہت سے دوسرے کامیاب ہو سکتے ہیں. ہم یک جماعتی سیاسی نظام کے قائل نہیں مگر ہم پھر بھی تعاون کے لئے تیار ہیں۔

(v) موجودہ حالات نے جو صورت اختیار کر لی ہے اس سے ملک میں بہت سے مسائل ہیں جنہیں یک جماعتی سیاسی نظام میں حل کرنا بڑا مشکل ہے۔

(vi) اب ضروری ہو گیا ہے کہ یک جماعتی نظام کی تنگ نائے سے نکل کر

مقاصد

آنگ سان سوچی کا یہ انٹرویو کرن تھاپر نے لیا تھا "جو عوامی ہیروئن اپنے مقاصد بیان کرتی ہے،" کے عنوان سے دی ٹائمز کے ۲۱ اگست ۱۹۸۸ء کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔

سوال: برما اور رنگون کی موجودہ صورتحال کے بارے میں خاصا الجھاؤ پایا جاتا ہے، اس فضا اور ملکی معاملات کے بارے میں آپ کیا کہیں گی؟

جواب: فضا بجا طور پر بڑی کشیدہ ہے۔ ملک کے اکثر حصوں میں سرکاری مشینری بالکل جامد ہو کر رہ گئی ہے۔ مگر لوگ بیدار ہو رہے ہیں، مظاہرے بڑے معقول انداز میں کیے جا رہے ہیں۔ اور امن و امان کے قیام کے لئے خود تحریک کی راہنمائی کر رہے ہیں۔

سوال: حال ہی میں آپ اس عوامی تحریک کی غالباً سب سے بڑی لیڈر بن کر ابھری ہیں، آپ کس لئے جدوجہد کر رہی ہیں؟ مقاصد کی وضاحت کریں گی؟

جواب: میں بھی برمی عوام کی اکثریت کا ایک حصہ ہوں، لوگ جمہوریت کی بحالی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ میرا ایک مدعا یہ ہے خون خرابہ کے بغیر لوگوں کو جمہوریت مل جائے۔

سوال: آپ نے پچھلے دنوں کہا ہے کہ یہ برما کی آزادی کے لئے دوسری جدوجہد ہے۔ اس سے آپ کا مطلب کیا ہے؟

جواب: جب کوئی نظام لوگوں کو ان کے تمام حقوق دینے سے انکاری ہو تو پھر لوگ مکمل آزادی کے لئے میدان میں نکلنے لگتے ہیں۔ اسی بنا پر میں کہتی ہوں کہ برما کے

کو اعتماد رکھنا چاہئے اور احترام کرنا چاہئے۔ میں اس بات پر پختہ ایمان رکھتی ہوں
فوج کو اپنی سالمیت بھی برقرار رکھنی چاہئے اور قوم کی بہتری کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے
فوج کو سیاست سے الگ تھلگ رہنا چاہئے۔

سوال: اگر حکومت گر جائے تو اس کی جگہ کون لے گا، کس قسم کے عبوری انتظامات کیے جائیں گے؟

جواب: ایک ایسی عبوری حکومت جس پر عوام کو اعتماد ہو، جو معاملات کو معمول پر لائے اور آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کے لئے فضا پیدا کرے۔

سوال: کیا اس عبوری نظام میں آپ بھی کوئی کردار ادا کرنا چاہیں گی، اگر کریں گی تو وہ کس قسم کا ہو گا؟

جواب: مجھے تو اپنے لئے کوئی خاص کردار نظر نہیں آتا، میں دیکھوں گی کہ امن کی بحالی میں کس طور مفید کام کر سکتی ہوں۔

سوال: آیئے مستقبل کے بارے میں بات کریں جو زیادہ دور نظر نہیں آتا۔ اگر کثیر الجماعتی نظام آجاتا ہے تو برما میں تو پارٹیاں ہیں ہی نہیں۔ آپ کس قسم کی پارٹیوں کی تشکیل چاہیں گی۔

جواب: مثالی طور پر تو خواہش یہ ہو گی کہ ایسی پارٹیاں قائم ہوں جن کے راہنما قابل اور دیانتدار ہوں جو ایک جمہوری نظام کے قیام اور بقا کے لئے خود کو وقف کر سکیں۔

سوال: آپ خود بھی پارٹی بنائیں گی؟

جواب: نہیں۔ لیکن اگر مجبوری ہوئی تو.........

سوال: آپ پوری زندگی سیاست میں گزارنا چاہتی ہیں؟ اگر ایسا ہے تو پھر سیاستدان کی حیثیت سے آپ اپنی صلاحیتوں کا اندازہ کس طور کریں گی؟

جواب: پوری زندگی کے لئے سیاست اختیار کر لوں، مجھے اس میں کشش نہیں نظر آتی، اس وقت میری دلچسپی کسی عہدے میں نہیں ہے لیکن اس وقت میں اپنے والد کے حوالے سے اتحاد پیدا کرنے والی طاقت کے طور پر کام کرنا چاہتی ہوں۔

سوال: تو پھر آپ آئندہ کے لئے کس لیڈر کی حمایت کریں گی، مطلب ہے عبوری دور

بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایسے لوگ بھی ہوں گے جو حکومت سے پورا انتقام لینا چاہتے ہیں مگر اکثریت صرف اتنا چاہتی ہے کہ حاکموں سے انصاف کیا جائے مگر رحم دلی کے ساتھ۔

برما میں فوج کا کردار بڑا اہم ہے۔ یہ میرے والد جنرل انگ سان نے بنائی تھی جنہوں نے بار بار فوج کو متنبہ کیا کہ وہ جبر و استبداد کی مکروہ طاقت نہ بنے۔ عوام کی اکثریت کا اس بات پر ایمان ہے کہ مٹھی بھر بے ایمان جنونی جن کی مراعات اور بد عنوانیاں اسی نظام کی دین ہیں اور اسی نظام میں ہی باقی رہ سکتی ہیں فوج کو اپنے ہاتھ میں رکھ کر اس کا سراسر غلط استعمال کر رہے ہیں۔ یہ بھی اظہر من الشمس ہے کہ بہت سے فوجی اس بات سے نالاں ہیں کہ ان سے بعض ایسے کام جبراً لئے جا رہے ہیں جن کی سبب ان کی عزت داغدار ہو رہی ہے۔ تمام راست فکر ڈر رہے ہیں کہ یہ صورت حال کہیں فوج کو ہی کئی حصوں میں تقسیم نہ کر دے جو پھر کبھی متحد نہیں ہو سکیں گے۔ وہ چاہتے ہیں کہ لوگ جو سیاسی نظام چاہتے ہیں اس پر پرامن طریقے سے جلد از جلد فیصلہ کر لیا جائے اور فوج عزت اور وقار کے ساتھ بیرکوں کو لوٹ جائے۔

بہت سے لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں اس ہمہ گیر قومی تحریک میں کس طور آ گئی ہوں۔ میں اس باپ کی بیٹی ہوں جسے بابائے برما بھی کہا جاتا ہے اس حیثیت میں لازم ہے کہ میں برما کے سیاسی حالات سے پوری طرح باخبر رہوں۔ مجھے بچپن سے ہی برما کی تحریک آزادی کی تاریخ اور اس کی سیاسی اور سماجی ترقی سے گہری دلچسپی رہی ہے۔ جب میرے والد کا انتقال ہوا اس وقت میری عمر دو سال تھی اس لئے سچی بات ہے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ میں ان کو جانتی تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ بڑے مشفق اور پیار کرنے والے باپ تھے۔ انسان کی حیثیت سے بہت عزت دار اور صاف کردار انسان تھے۔ جنہوں نے ذاتی مفادات پر ہمیشہ ملکی مفادات کو مقدم رکھا۔ جب میں بڑی ہوئی میں نے ان کی زندگی اور کارناموں کے بارے میں مواد جمع کر کے پڑھنا شروع کیا تب مجھے معلوم ہونے لگا کہ وہ کس قسم کے انسان تھے اور بتیس برس کی عمر میں انہوں نے کیا کچھ کر دکھایا تھا۔ پھر بطور ایک محب الوطن اور مدبر کے نہ صرف میرے دل میں ان کے لئے تعریف کا جذبہ پیدا ہونے لگا

مجھے یہ احساس بھی شدت کے ساتھ ہوا کہ ہمارے رویئے کس قدر ایک جیسے ہیں۔ غالباً ان کے اور میرے درمیان یہی مضبوط تعلق ہے کہ میں نے اپنے ملک کی ترقی اور بہبود کے بارے میں ذمہ داری محسوس کرنا شروع کر دی۔

موجودہ حکومت ۱۹۶۲ء میں برسر اقتدار آئی، میں اس وقت ہندوستان میں پڑھ رہی تھی میری ماں وہاں پر برما کی سفیر تھیں۔ اس وقت سے حکومت سے میرے تعلقات کچھ اچھے نہیں تھے۔ حکومت کے کئی وزیر امیر اپنی انفرادی حیثیت میں میرے والد کے بڑے معترف بھی تھے اور وفادار بھی، اور ان کے خاندان کی عزت بھی کرتے تھے اور گرم جوشی کا اظہار بھی۔ دوسری طرف ایسے لوگ بھی تھے جو صرف ذاتی مقاصد کے لئے میرے والد کا نام استعمال کرتے تھے مگر ملکی مفاد کے لئے ان اصولوں پر کبھی نہیں چلے جو میرے والد نے بنائے تھے۔ انہی لوگوں میں سے ایسے بھی تھے جنہیں ہمارے خاندان سے شدید حسد تھا اور اسے اپنے لئے ایک خطرہ سمجھتے تھے۔ ایک بار میں ۱۹۷۴ء میں گھر آئی تو حکومت یہ جاننے کے لئے بے تاب تھی کہ کیا میں حکومت کے خلاف سیاست میں حصہ لینے کا ارادہ رکھتی ہوں، یہ سوال غیر رسمی طور پر مجھ سے کیا گیا میرا جواب تھا کہ میں ملک سے باہر رہتے ہوئے ایسا کوئی کام نہیں کروں گی۔ اگر میں کسی سیاسی تحریک میں شامل بھی ہوئی تو برما میں رہتے ہوئے ہی ایسا ہو گا۔

بیرون ملک رہ کر مجھے برما کے مسائل کا عالمی پس منظر بھی سمجھنے کا موقع ملا جبکہ میں بار بار یہاں آئی جس وجہ سے ملک کے حالات سے میں پوری طرح باخبر رہی۔ یہ جاننا قطعی مشکل نہیں تھا کہ بی ایس ایس پارٹی کے عہد حکومت میں برما کے حالات بہت دگرگوں ہو رہے ہیں۔ لیکن مجھے حکومت کے خلاف کسی بڑے تحریک کے آثار نظر نہیں آئے اب پچھلے اپریل میں آکر یہ صورت نظر آئی۔ تب میں نے دیکھا کہ لوگوں کا مزاج بدل گیا ہے اور کچھ ہی عرصہ میں حکومت کے خلاف ہمہ گیر تحریک شروع ہونے والی ہے۔ گزشتہ اگست کے مہینے میں احتجاجی مظاہرین کا جس طور قتل عام کیا گیا اس سے معاملات میں اور شدت پیدا ہو گی جو مجھے عوام کے مطالبات کی حمایت میں سر میدان لے آئی۔ اس فیصلے میں ایک عنصر یہ بھی تھا کہ اپنے والد کی بیٹی کی حیثیت سے مجھ پر بھی ملک کی طرف سے کچھ ذمہ داریاں عائد

صورت رد نہیں کرتے لیکن وہ اس بات کی ضمانت چاہتے ہیں کہ نظم (قانون) صرف حاکم طبقہ کی مرضی کا نام ہے اور نسق (آرڈر) سے محض یہ مراد نہیں کہ یہ خوفزدگی کی بازگشت ہے۔ برمی عوام کی اکثریت چاہتی ہے کہ ایسے حالات پیدا ہوں جن میں دھما اور ایھپے ...... (مطابقت اور خوف سے آزادی) پر عمل ہوسکے۔

۴۔ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ انسانی حقوق بھی اسی حد تک دیئے جاتے ہیں جس حد تک قانون سے متصادم نہ ہوں۔ لیکن یہ دعویٰ بھی اسی صورت میں جائز ہو سکتا ہے جب قانون یہ دیکھے کہ انصاف ہو رہا ہے اور انصاف نظر بھی آرہا ہے۔ جو لوگ اقوام متحدہ کے بنائے انسانی حقوق کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف مزاحمت کرتے ہیں انہیں دبانے کے لئے جاری کئے گئے فرمانوں کو قانون کا درجہ دینے کا کوئی قانونی اور اخلاقی جواز نہیں ہے۔

۵۔ این ایل ڈی کی ہمیشہ یہ پالیسی رہی ہے کہ اس نے جائز قانون کو مانا بھی ہے اور اسے سربلند بھی رکھا ہے اس کے ساتھ ساتھ برما کے عوام کی اکثریت کی ہم خیال ہے کہ جو لوگ قوم کو مضبوط اور پرامن دیکھنا چاہتے ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ ایسے تمام اقدامات کی مخالفت کریں جو سچائی اور انسانی وقار کے منافی ہیں۔

۶۔ برما میں ان دنوں گرفتار سیاسی قیدیوں کے خلاف اس بنا پر فوجداری کے مقدمات بنائے گئے ہیں کہ انہوں نے انسانی حقوق کے منشور کی شق ۱۹ - ۲۰ اور ۲۱ کو سربلند رکھنے کی کوشش کی ان کے ساتھ جو سلوک گیا وہ حقوق کی شق 5، 6، 7، 8، 9، 10، 11 اور ۱۲ کے منافی ہے۔

۷۔ فقط این ایل ڈی ہی نہیں اس کی حمایت کرنے والے لوگ کوئی ایسا ٹکراؤ یا کشمکش چاہتے ہیں جس کی وجہ سے پہلے ہی معاشی اور سیاسی بدحالی کی شکار آبادی کے مصائب میں مزید اضافہ ہو۔ این ایل ڈی اپنے قیام (۱۹۸۸) سے اس بات پر ایمان رکھتی ہے کہ جمہوری روایت یہی ہے کہ مفاہمت اور مسائل کے حل لئے مذاکرات کیے جائیں۔

۸۔ جو لوگ چاہتے ہیں کہ برما میں جلد از جلد ایک جمہوری حکومت قائم ہو جائے وہ اس مقولے کو مانتے ہیں کہ "انسانی حقوق سے انکار کا مطلب ہے سیاسی اور سماجی

بے چینی پیدا کرنا" ۔ ۔ ۔ چنانچہ ان کی کوشش یہ ہے کہ ایسی فضا پیدا کی جائے جو سیاسی اور سماجی بے چینی سے پاک ہو۔ مگر حکومت نے عوام کی اکثریت کی مرضی کو نہ مان کر ان لوگوں کی کوششوں میں رکاوٹ ڈالی ہے۔

۹۔ امید کی جاتی ہے کہ اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا کمیشن ایسی صورت حال پیدا کر سکے گا جس میں انسانی حقوق کے فروغ کے لئے سرگرم برمی لوگ (خصوصاً سیاسی قیدی) اپنے خیالات کا بے باکانہ اظہار کر سکیں اور انہیں یہ خوف نہ ہو کہ انہیں، ان کے خاندانوں یا ان کے ساتھیوں کو انتقام کا نشانہ بنایا جائے گا۔

۱۰۔ برما کے لوگوں کو یہ احساس ہے کہ ان کے انسانی حقوق کے ضامن سیاسی نظام کے حصول کی جدوجہد خود ان کے عزم، حوصلے اور مصائب کے سامنے ڈٹ جانے کے جذبے کے سبب کامیاب ہو گی لیکن برما کے لوگ اقوام متحدہ کے کمیشن سے یہ توقع ضرور کرتے ہیں کہ وہ ان کے اعلیٰ مقصد کی حمایت کرے گا۔

تیسرا حصہ

حرف سپاس
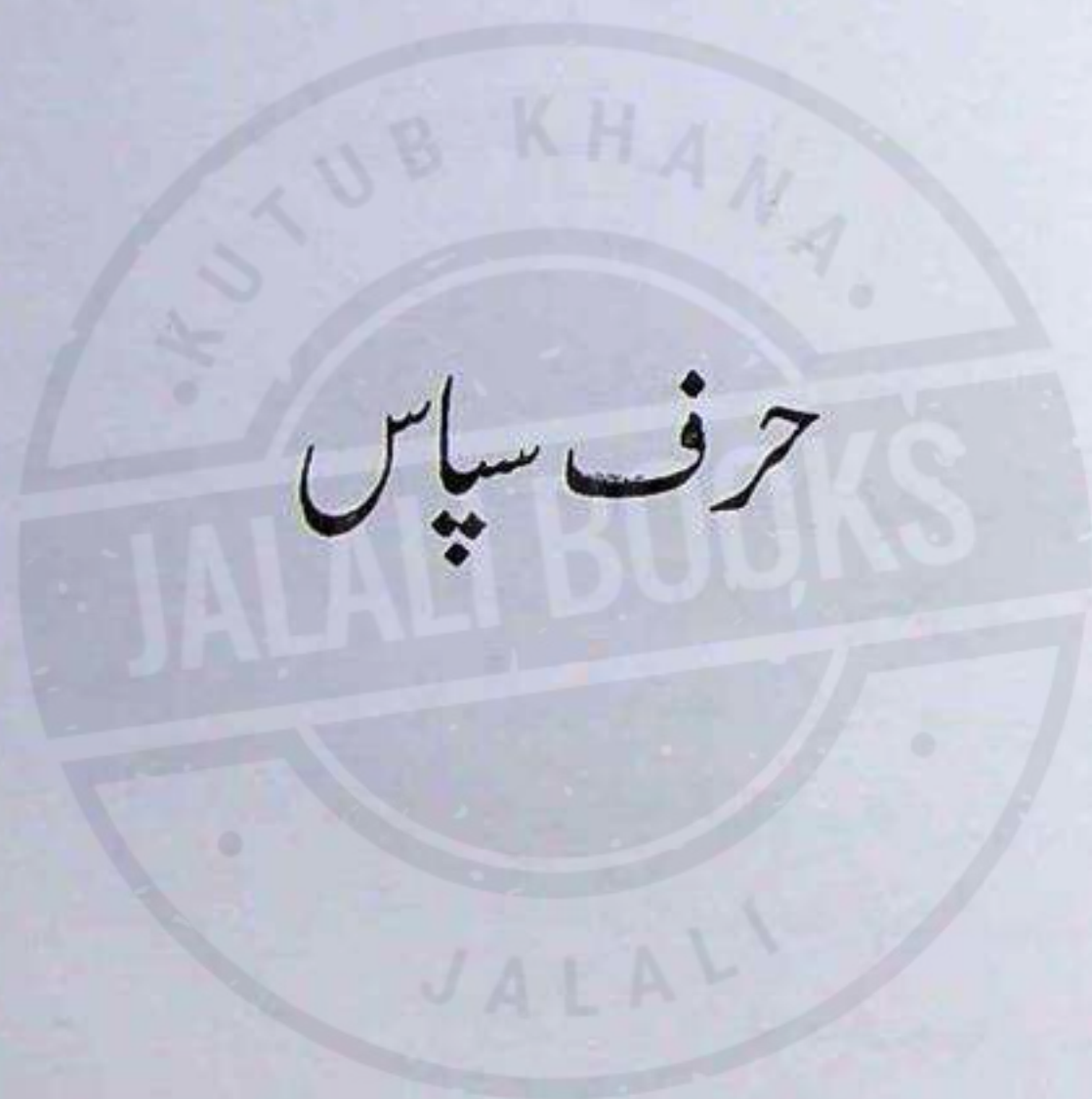
ہوگی کہ یہ کب تک چلے گی؟ اور اب تک اس نے برما کے سیاسی میدان میں جو کچھ حاصل کیا تھا فوجی حکومت بالارادہ اس کی اہمیت کم کرنے کے لئے کوشاں تھی، سو اس بارے میں کیا خیال کرتی ہے؟ سو ۱۹۸۸ء میں پارٹی قائم کر کے اس میدان میں اتری تھی۔ اور دس ماہ کی گرفتاری کے باوجود اسی کی پارٹی نے ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں بھاری اکثریت حاصل کی تھی۔

میرے خیال میں سو کے اندر جو ناقابل تسخیر جذبہ ہے اور جیسی اس کی غیر معمولی شخصیت ہے وہ دین ہے اپنے والد جنرل آنگ سان کی اور ماں اور عظیم عورت ڈاکھن جیئ کی تربیت کی۔ جنرل آنگ سان کی زندگی کی کہانی برما کی تاریخ کا حصہ ہے۔ بہت معروف بھی ہے اور اس کے بارے میں بہت کچھ لکھا بھی گیا ہے۔ حال ہی میں اس کی اپنی بیٹی نے بھی لکھا ہے۔ افسانوی تھرٹی کامریڈز کے راہ نما کی حیثیت سے جاپان میں اس کی فوجی تربیت. یہی فوج جاپانیوں کے ساتھ مل کر برطانوی برما میں آئی تھی، جاپانیوں کی موجودگی میں جعلی قسم کی آزادی کے بعد اس کا اتحادی فوجوں کی برما میں پھر حمایت اور پھر امن کی بحالی کے بعد برما کی آزادی کے لئے شب و روز محنت اور برطانیہ کا آزادی دینے پر رضامند ہو جانا۔ بہت سے لکھنے والوں نے آنگ سان کی زندگی کے ان پہلوؤں پر تفصیل سے لکھا ہے۔ البتہ ان کی بیوی اور سو کی والدہ ڈاکھن جیئ کے بارے میں اتنا کچھ نہیں لکھا گیا۔

جنرل آنگ سان کے بارے میں میری یادوں میں کچھ پرانے وقتوں سے جذباتی وابستگی کا عنصر زیادہ ہے۔ جنوری ۱۹۴۷ء میں انگلستان انتہائی سخت سردی کی لپیٹ میں تھا کہ آنگ سان برما کی آزادی کے بارے میں اٹیلی کی حکومت سے مذاکرات کرنے کے لئے اپنے وفد کے ساتھ لندن آیا۔ وفد کو ڈورچیسٹر ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا جو لندن کے عین وسط میں تھا اور برف باری کی وجہ سے اس تک پہنچنے کا رستہ بھی تقریباً بند تھا۔ مابعد جنگ کی بچت اور کفایت شعاری کی مہم جاری تھی اور لندن والوں کے ساتھ ساتھ برما والوں کو بھی روزانہ چار چار گھنٹے بجلی سے محروم رہنا پڑتا۔ ہوٹل کے کمروں میں آتش دان نہیں جلتے تھے صرف بجلی کے چھوٹے چھوٹے ہیٹر تھے۔ بہت تکلیف دہ وقت تھا مگر یہی وقت تو امیدوں اور جذبوں کا وقت تھا۔

جنرل نے یہ طے کر لیا کہ وہ لندن میں مقیم تمام برمی لوگوں سے ملے گا ان میں

لندن میں رہنے والے اور پارٹ ٹائم کام کرنے والے طالب علم تھے۔ مجھ جیسے بہت دیر کے آئے برمی اور وہ برمی جو گھڑی کی گھڑی کے لئے شہر آتے اور گزر جاتے۔ ہم نے سوہو کے ایک برمی ریستوران میں اسے استقبالیہ دیا جس میں بہت لوگ آئے اس نے ان سے خطاب کیا اور پھر فرداً فرداً سبھی سے ملا۔ برما میں کہا جاتا ہے اس کے نام کی خوشبو بہت پہلے پہنچ چکی تھی۔ اس کی شہرت، بے مثال دیانتداری، مخالفوں اور دشمنوں سے مستعدی سے نمٹنے کے واقعات، اپنے ساتھیوں اور برتر حکام کی نظر میں اس نے جو عزت حاصل کی جن میں برما پر قابض جاپانی اور جنگ کے آخری دنوں میں برما پر دوبارہ قبضہ کرنے والے انگریز شامل تھے اور پھر جنگ کے بعد اس کی وہ تگ و دو جو آج برما والوں کو آزادی کے بارے میں مذاکرات تک لے آئی تھی۔ یہ سارے واقعات ہر کسی کو معلوم تھی۔ ہم تو پہلے ہی اسے قومی ہیرو سمجھتے تھے اور بے حد عزت اور احترام کرتے تھے مگر اس کی بے تکلفی اور دوستانہ انداز نے تو ہمارے دل جیت لئے تھے۔

جب جنرل کی شام کی کوئی مصروفیت نہ ہوتی تو وہ ایسے شاموں پر مجھے وفد کے ساتھ کھانے پر بلالیتا۔ کھانے کے بعد نیم جان ہیٹر کے سامنے ہم سبھی بہت قریب آجاتے اور ماقبل جنگ کے واقعات بتاتے۔ ان دنوں کی باتیں جب انہوں نے جاپان میں فوجی تربیت حاصل کی اور آج کے دن جب امیدیں پھلنے پھولنے والی ہیں۔ برما میں جنگ کے دنوں، یا بعد میں جنرل کے برطانیہ کے ساتھ مذاکرات اور اپنی تجاویز منوانے وغیرہ کے بارے میں باتیں کم ہوتی تھیں۔ دراصل سبھی لیڈر جو آئے تھے ان کے لئے یہ آرام کرنے کے دن تھے۔ جنگ کے دنوں میں میں دلی میں آل انڈیا ریڈیو میں کام کرتی تھی۔ بہت سی زبانوں میں پروگرام نشر کئے جاتے تھے ایشیا کے ان علاقوں کے لئے جو جاپانیوں کے قبضے میں تھے۔ بعد میں اسی کام کے لئے سان فرانسسکو میں یو ایس آفس آف وار انفریشن میں چلی گئی اب اسی کا نام وائس آف امریکہ ہے۔ میں ان دوستوں سے بہت عرصہ سے نہیں ملی تھی اور اتنا وقت نہیں تھا کہ ہم ایک دوسرے کو تفصیل سے بتاتے کہ گزرے زمانے میں ہم نے کیا کیا دیکھا سنا اور کیا۔

تو ہیٹر کی دھند کی سی روشنی کے آس پاس جنرل اس کے ساتھی وفد کے متعدد ارکان بی بی سی میں کام کرنے والے برمی اور بعض اوقات مجھ ایسے ملاقاتی اکٹھے ہوتے۔ بوسیٹ

کیا Bo Set Kya جو جاپان میں تربیت حاصل کرنے والے تھرٹی کامریڈز میں شامل تھا
اور پھر جاپان کے زیر قبضہ نام نہاد طور پر آزاد برما کے فوجی اتاشی کے طور پر ٹوکیو میں رہا۔
جب گفتگو میں وقفہ آجاتا تو بو جاپان میں سیکھے گئے پیار کے گیت گانے شروع کرتا اور ہم
اپنے برمی گیت گانے لگتے۔ جنرل اپنے گھر والوں کے بارے میں باتیں کرتا، بیوی تین
بچوں جن میں سو سب سے چھوٹی بچی تھی کے بارے میں باتیں۔ اور پھر کہتا کہ انہیں تحفے
دینے ہیں۔ سو چھ کچھ خرید کر لے آؤ؟ سو یہ صورت حال تھی جب ان کے وفد کا کام مکمل
ہو گیا۔ وہ لندن سے چلا گیا اور میں جنرل کے گھر کے ہر فرد کے لئے جو تحفے خرید لائی تھی،
جنرل وہ اپنے ساتھ لے گیا۔ سو کے لئے ایک بڑی گڑیا خریدی تھی کئی سالوں بعد جب میں
اسے ملی یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ گڑیا اب بھی اس کے پاس ہے اور اس نے اسے بہت
سنبھال کر رکھا ہے۔

واپس جانے سے چند دن پہلے جنرل نے بی بی سی سروس میں نشر کرنے کے لئے
تقریر تیار کی جس میں اس نے کہا کہ وفد کا مشن مکمل ہو گیا ہے، ہماری اس کے اور اس کے
ساتھیوں کے ساتھ بی بی سی کے ریستوران میں لنچ پر ملاقات تھی۔ چاروں طرف چپ تھی،
جنرل کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔ بی بی سی کی برمی سروس کا انچارج انگریز تھا اس نے جنرل
کی برمی تقریر کے انگریزی ترجمے میں قطع و برید اور تبدیلی کر دی اور اصرار کیا کہ برمی تقریر کو
انگریزی والے متن کے مطابق ڈھالا جائے۔ اس نے کہا کہ سیاسی تقریروں کے بارے میں
بی بی سی والوں کے اپنے ضوابط ہیں اور انہیں بہر طور ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ جنرل کے سامنے
دو راستے تھے یا تو وہ ترمیم والی تقریر کرتا یا پھر اپنی ہی اصل تقریر کرتا۔ مجھے جنرل نے
تحائف خریدنے کے لئے کہا تھا، میں نے وہ خریدے اس لئے زیادہ دیر سے پہنچی تھی، اس
کے بعد آہستہ آہستہ گمبھیرتا اور کشیدگی کم ہونے لگی اور لنچ شروع ہوا۔ جنرل نے برمی
لوگوں سے کہا کہ اسے تقریر کے بارے میں طور طریقے سے پہلے مطلع نہیں کیا گیا تھا لیکن
مجھے اس کے کاٹے پیٹے جانے پر بہت غصہ ہے تو جنرل کا یہ دوسرا رخ تھا۔

وفد کا کام ختم ہو گیا تھا اور جلد ہی اسے واپس جانا تھا۔ جنرل نے خود اپنے انگریز
میزبانوں کے اعزاز میں استقبالیہ دیا جس میں بہت لوگ آئے ان میں جنرل کے ساتھ کام
کرنے والے بھی تھے اور وہ بھی جن کے ساتھ جنرل نے کام کیا تھا۔ دونوں پارٹیوں کے

بچوں کو بڑی اچھی طرح جانتے تھے۔ نئی دہلی میں دوستی کی تجدید ہوئی اسی زمانے سو کو اعلیٰ تعلیم کے لئے آکسفورڈ جانا تھا برطانوی ہائی کمشنر اور اس کی بیوی نے بچی کی نگہداشت اور خبر گیری کا کام ایسے نبھایا جیسے والدین سرانجام دیتے ہیں۔ سو اس خاندان کا حصہ بن گئی ان کے دو بھائیوں اور دو بہنوں کی ایک اور بہن۔ ان کے گھر میں رہتے ہوئے سو کی ملاقات ان کے کئی اور دوستوں سے ہوئی۔ اس کے علاوہ ان سیاستدانوں اور سرکاری افسروں سے بھی جو اس گھر میں آتے جاتے تھے۔ یہ بڑی بڑی عمر کے لوگ اور ان کی دنیا جس میں اب وہ بھی خود داخل ہونے والی تھی وہ ان لوگوں کی شکل وصورت، رکھ رکھاؤ، گفتگو اور بوالعجبیوں میں بڑی دلچسپی لیتی۔

سو عموماً گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنی ماں کے پاس دلی چلی جایا کرتی مگر ایک بار وہ الجزائر میں میرے پاس آگئی مجھے اقوام متحدہ کے دلی والے دفتر اطلاعات سے تبدیل کر کے الجزائر میں ایسا ہی دفتر قائم کرنے کا کہا گیا۔ الجزائر ابھی ابھی آزاد ہوا تھا۔ ۱۹۶۲ء میں چارلس ڈی گال سے ایویان کے معاہدہ کے بعد سب الجزائر والوں نے فرانس سے آزادی حاصل کرنے کے لئے آٹھ سال تک جدوجہد کی تھی اور اب الجزائر بہت ہی آہستہ آہستہ سنبھل رہا تھا۔ اسی لئے شہر میں مکانیت کی بڑی قلت تھی، بہت سے علاقے برباد پڑے تھے، چند ایک ہوٹل اچھی حالت میں تھے مگر سروس کم تھی۔ نئے نئے کھلنے والے سفارت خانوں، اقوام متحدہ کے دفاتر اور باہر سے آنے والی تجارتی اداروں کو بھی مکانوں کی ضرورت تھی اور خود الجزائر والوں کو بھی۔ پرانے آباد کار فرانسیسی بڑی تعداد میں چلے گئے تھے لیکن اور آتے جا رہے تھے۔ نوجوان فوج چھوڑ کر دوسری اسامیوں پر، غیر ملکی امداد کے تحت کارکن، استاد اور استانیاں اور سیاح چلے آ رہے تھے۔

الجزائر میں کسی خونریزی کے بغیر حوری بومدین نے بن بیلا کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اس کے تھوڑی مدت بعد سو الجزائر پہنچی۔ سو کو بہت سی پارٹیوں میں مدعو کیا جاتا مگر اس کی دلچسپی زیادہ سے زیادہ الجزائری لوگوں سے ملنے میں تھی وہ پڑھنے کے لئے کتابوں سے بھرا سوٹ کیس بھی لے کر آئی تھی۔ ہم نے الجزائر کی متعدد ایسی تنظیموں سے رابطہ کیا جو آزادی کی لڑائی کے دوران متاثر ہونے والے لوگوں کی بحالی کے لئے مصروف کار تھیں۔ ایک نوجوان اپنے بحالی کے منصوبے کے بارے میں تفصیل بتانے آیا۔ اس نے کہا کہ جنگ

آزادی میں شہید ہونے والوں کی بیواؤں کے لئے گھر بنا رہے ہیں ان تعمیرات میں ہم ہر قوم کے افراد کی شرکت کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ چنانچہ سو اس تنظیم کے بہت بڑے کیمپ میں کئی ہفتے تک رہی اور منصوبے پر کام کرتی رہی۔ انسٹرکٹر روسی تھے سو کے ساتھ کام کرنے والے دوسرے کارکن الجزائر، فرانس، لبنان، ہالینڈ اور جرمنی کے نوجوان تھے۔ انہیں کھانے اور راشن کی سہولت دی جاتی تھی، تنخواہ کوئی نہیں تھی۔ سو کے الجزائری دوست اور سہیلیاں اسے ایک شادی کی تقریب دکھانے کے لئے کابیل پہاڑ پر لے گئیں۔ ہم لمبی سیر کے لئے صحارا کے کنارے تک جا پہنچے مگر اس سے آگے بہت گرمی تھی۔ ایک اور سفر ہم نے رومن شہر کے کھنڈروں کو دیکھنے کے لئے کیا یہاں اوپن ایئر تھیٹر میں بڑے بڑے پتھروں پر بن بیلا کے بارے میں نعرے لکھے تھے۔ سو کو مراکش بھی دکھایا گیا وہ سپین کے جنوبی ساحلوں تک گئی پھر وہ واپس آکر پڑھنے میں جٹ گئی یہاں اپنے قیام پر وہ بڑی خوش تھی اور پھر وہ واپس آکسفورڈ چلی گئی۔

سو نے ڈگری حاصل کی اس کے بعد کچھ عرصہ پڑھاتی رہی مورخ ہیو ٹنکر کی نگرانی میں تحقیق کا کام کیا اور اس کے بعد میرے پاس نیویارک آ گئی۔ الجزائر میں چار سال تک خدمات انجام دینے کے بعد میں یو این ہیڈ کوارٹرز میں چلی آئی تھی۔ سو نیویارک یونیورسٹی میں پوسٹ گریجوایٹ کرنا چاہتی تھی جہاں انٹرنیشنل افیئرز کا پروفیسر فرینک ٹریکر سو کے خاندان کا دوست تھا۔ پروفیسر نے برما میں امریکی امداد کے پروگرام کے سلسلے میں کئی سال قیام کیا تھا، اسے جنوب مشرقی ایشیا اور مشرق بعید کے کئی معاملات میں بڑی دلچسپی تھی اور وہ ان علاقوں میں گھوما پھرا بھی بہت تھا۔ ابھی ابھی اس کی کتاب، برما، بادشاہت سے جمہوریہ تک، چھپی تھی۔ اس نے سو کے تعلیمی معاملات میں گہری دلچسپی لی ہم شہر کے درمیان ہٹن میں رہتے تھے یہاں سے نیویارک یونیورسٹی کا بہت زیادہ فاصلہ ہے یہاں سے روزانہ بس پر جانا اور واپس آنا سو کی سخت آزمائش تھی۔ بس میں سفر کے دوران اس کے سر کو چکر آنے لگتے ہیں۔ پھر اسے کچھ نابکار لوگ راستے میں تنگ بھی کرنے لگے۔ وہ واشنگٹن سکوائر کے پاس بس سٹاپ سے اتر کر گلی تک جاتی تو راستے میں یہ آوارہ اسے تنگ کرتے۔ جہاں ہم رہتے تھے وہاں سے اقوام متحدہ کا دفتر چند منٹ پیدل کا راستہ تھا میں نے سوچا کیوں نہ یہ وہاں ملازمت کر لے اور پڑھائی بعد میں کرے؟ درخواستیں دینے، ان پر

آتے۔ بڑا موج میلہ ہوا۔ کھانا زبردست برمی ہوتا۔ یوتھان اور اس کے گھر والے آنے والوں کی بڑی آؤ بھگت کرتے۔ لیکن ہمیں اکثر یہ خیال آتا کہ یہ اجتماع چھوٹے ہونے چاہئیں یہ دوسری بات ہے کہ چھوٹے اجتماع میں بھی ہم عوام اور سیاست، دنیا کی صورت حال اور یوتھان کے مسائل کے بارے میں کبھی جاندار گفتگو نہ کر سکے۔ اس کی صرف اور صرف میزبان کی حیثیت رہ جاتی۔ ان دنوں اقوام متحدہ میں برما کا مستقبل مندوب یوسوئن تھا، وہ بھی یوتھان والے علاقے میں رہتا مگر اس کا مکان اتنا بڑا اور پر شکوہ نہیں تھا اور اس کے دعوت نامے تھوڑے سے مختلف ہوتے۔ جنرل اسمبلی کے اجلاس کے دوران وہ ستمبر کے دوسرے ہفتے سے لے کر وسط دسمبر تک مصروف رہتا، برمیوں اور دوسرے وفود کے استقبالئے ہوتے۔ ان دنوں کے علاوہ نیویارک میں رہنے والے برمیوں کو بدھ تیوہار منانے کے لئے بلاتا، ہمیں وہ اس کی بیوی اور بچے اچھے لگتے تھے وہ کشادہ دل تھا ہم برمیوں کو بھیڑوں اور بکریوں میں تقسیم نہیں کرتا تھا۔ بکری انہیں کہا جاتا تھا جو برما میں نی ون کی حکومت کی کارکردگی پر تنقید کرتے تھے اور اکثر دوسروں سے کٹ جاتے اس کے گھر میں فضا ایسی تھی کہ ہم گفتگو بھی کر سکتے تھے، بحث بھی اور دلائل کا تبادلہ بھی بلکہ بعض اوقات خاصی گرما گرم بحث بھی اور کوئی بدمزگی پیدا نہ ہوتی۔

جنرل اسمبلی کے ایک اجلاس کے دوران اس نے سو کو اور مجھے اپنے گھر پر دوپہر کے کھانے پر بلایا۔ برمی وفد کے کچھ ارکان نے کہا تھا کہ وہ ہم سے ملنا چاہتے ہیں۔ یوسوئن تو ہمیشہ بڑے خوشگوار اور بامروت انداز میں ملتا لیکن اب کے لگا کہ یہ دعوت نامہ رسمی سے کچھ زیادہ ہے، صرف رسمی ملاقات تک محدود نہیں، ہم دوپہر میں رورڈیل میں اس کے گھر پہنچے۔ اس کا مستطیل نما کمرہ پھولوں اور سجاوٹی پودوں سے اٹا پڑا تھا۔ برما میں لاکھ کے بنے سنہری اور سیاہ رنگ کے سجاوٹی نمونے بھی ترتیب کے ساتھ پڑے تھے۔ صوفے اور کرسیاں دیواروں کے ساتھ تھیں اور ان کے سامنے کافی کے بڑے میز تھے۔ صوفوں پر برما کے سفیروں کی پوری فوج بیٹھی تھی جو اجلاس میں شرکت کے لئے آئی تھی، ہمیں ان سے متعارف کرایا گیا جن سے پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی پھر سو کو دوسرے کونے پر لے جا کر دو آدمیوں کے درمیان بٹھا دیا گیا۔ مجھے دو اور مردوں کے درمیان بٹھا دیا گیا یہ جگہ وفد کے سربراہ کرنل یون سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ یوسوئن کی بیوی نے جوس کے

گلاس اور نقل وغیرہ کے پیالے مہمانوں کے سامنے رکھوائے اور پھر خود دوسرے دروازے سے اندر چلی گئی تاکہ کھانے کو دیکھے، آخر کھانا ان بڑے لوگوں کے شایان شان ہونا چاہئے تھا۔ ہم نے اور دوسرے لوگوں نے کچھ ادھر ادھر کی بے مطلب باتیں کیں یوسوٹن حسب معمول بڑی نرمی سے مسکرا رہا تھا مگر انداز کشیدہ تھا اب مجھ پر واضح ہو گیا کہ یہ لوگ سو سے ملنے اور اس کے بارے میں اندازے لگانے آئے ہیں: مگر کس لئے؟ مجھے بھی کچھ پتہ نہیں تھا وفد کے سربراہ نے حملے کا آغاز کیا۔ یہ سو اقوام متحدہ میں کیا کام کر رہی ہے؟ اس کے پاس کون سا پاسپورٹ ہے؟ کیا واقعی اس نے یہ پاسپورٹ نہیں ترک کیا؟ اسے پتہ ہونا چاہئے کہ ڈپلومیٹک پاسپورٹ کا استعمال غیر قانونی ہے۔ یہ سخت قسم کی خلاف ورزی ہے اور جتنی جلدی ہو سکے تلافی کر دینی چاہئے۔

سب حاضرین نے اس چڑھائی کو ماتحتوں کے سے خضوع خشوع کے ساتھ سنا۔ کچھ بن بن قسم کی آوازیں بھی تھیں جو سو پر حملے سے اتفاق کر رہی تھیں۔ سو بڑے اطمینان اور تحمل کا مظاہرہ کر رہی تھی جو مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس نے بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں بڑے وقار کے ساتھ جواب دیا۔ اس نے بہت پہلے لندن میں برمی سفارت خانے کو پاسپورٹ کے لئے درخواست دی تھی مگر اسے اب تک اس درخواست کا جواب نہیں دیا گیا۔ اس نے یہ بھی نہیں کہا کہ اس غیر معمولی تاخیر کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ اسے نیویارک پڑھنے کے لئے آنا تھا اس لئے اس نے پرانا پاسپورٹ استعمال کیا۔ یہاں اپنا خرچ چلانے کے لئے اسے کام کی ضرورت تھی، خوش قسمتی سے اسے یو این میں ملازمت مل گئی جہاں اس کی برمی قومیت کے لئے پاسپورٹ دکھانا ضروری تھا۔ وہ اب بھی لندن کے سفارت خانے سے اس پاسپورٹ کے آنے کا انتظار کر رہی ہے جس کے لئے درخواست اس نے کئی مہینے پہلے دی تھی، جب نیا پاسپورٹ آ جائے گا تب بڑی خوشی سے پرانا پاسپورٹ چھوڑ دوں گی۔ اسے یقین تھا کہ اس کمرے میں اس کے جو اتنے سارے چمچے اکٹھے ہوئے ہیں انہیں پتہ ہو گا کہ ایک غیر ملک میں اپنے اور کام کرنے کے لئے پاسپورٹ چاہیے جس قسم کا ہو ضروری ہوتا ہے اس نے یہ ساری گفتگو بڑے نرم انداز میں اور خوبصورت برمی زبان میں کی۔

تب لندن میں متعینہ برمی سفیر نے اٹھا سو کی بات کی تصدیق کی لکھا درخواست کئی مہینے پہلے آئی تھی نئے پاسپورٹ کے لئے مگر معمول کے مطابق اسے رنگون بھیج دیا گیا تھا اسے معلوم

بچوں کو لے کر رنگون میں اپنی ماں کے پاس جایا کرتی۔

گھر داری کے ساتھ ساتھ سو نے اب کچھ لکھنا لکھانا بھی شروع کر دیا۔ پڑھنے کے جنون میں اس نے انگریزی اور فرانسیسی میں بہت کتابیں اکٹھی کیں۔ فرانسیسی سے اسے بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ مائیکل کی اپنی بھی لائبریری تھی اس نے تبت سے متعلق تحقیق کے لئے بہت کتابیں اکٹھی کی تھیں اور یوں آکسفورڈ میں ان کا گھر کتابوں سے بھر گیا۔ اور بچے بھی کتابیں پڑھنے لگ پڑے تھے۔ سو نے اب باپ کی سوانح عمری لکھنے کا ارادہ کیا۔ اس نے آغاز جاپان اور جاپانیوں کے مطالعے سے کیا۔ گھر میں برما کے بارے میں انگریزی اور برمی زبان کی بہت کتابیں آئیں۔ جاپان کے بارے میں جاپانی اور انگریزی میں بڑی کتابیں اکٹھی ہوئیں اب اس نے باپ کی زندگی کے بارے میں تحقیق شروع کر دی اس کے علاوہ اس نے سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز لنڈن سے پی ایچ ڈی کرنے کا منصوبہ بھی بنا لیا۔ اس عرصے میں اس کی سرگرمیوں کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے کام میں ڈوب گئی۔

جاپان میں اس کے باپ نے کس طرح زندگی گزاری اور اس کی کیا مصروفیات رہیں یہ جاننے کے لئے اس نے ۱۹۸۵ء میں کیوٹو یونیورسٹی کی طرف سے وظیفے کی پیشکش قبول کر لی۔ وہاں اس نے جاپان برما ایسوسی ایشن کے ارکان سے رابطہ کیا جنہوں نے اس کی ملاقات ان جاپانیوں کے ساتھ کروائی جو اس کے والد اور اس زمانے کے حالات سے آگاہ تھے اور ابھی تک زندہ تھے۔ جس کسی سے اس کی ملاقات ہوئی وہ اسے کوئی نہ کوئی بات بتا دیتا۔ اس کا جاپانی زبان کا محاورہ بڑھا اور رابطے بھی وسیع ہوئے۔ مائیکل ان دنوں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانس سٹڈیز کے وظیفے پر شمالی ہندوستان کے شہر شملہ میں تھا۔ بڑا بیٹا باپ کے ساتھ تھا جبکہ چھوٹا ماں کے ساتھ۔ ۱۹۸۶ء میں اس نے مجھے تین ماہ کے لئے اپنے اور کم کے پاس کیوٹو یونیورسٹی کے انٹرنیشنل ہاؤس میں رہنے کے لئے بلایا۔ جاپان کے وظیفے پر دنیا جہان کے سکالر وہاں آ کر تحقیقی کام کر رہے تھے اور سو کے ان سے بڑے اچھے اور قریبی مراسم تھے۔ پھر سو کو وہیں فیلوشپ مل گئی جہاں مائیکل کام کر رہا تھا۔ میں ۱۹۸۷ء کے شروع میں ہندوستان میں تھی خوش نصیبی کہ انسٹی ٹیوٹ میں میں نے ان کے ہاں ایک ماہ تک قیام کیا۔ انسٹی ٹیوٹ اس بہت بڑی عمارت میں قائم ہے جہاں آزادی سے پہلے

اب سو کا باپ بھی نہیں تھا اس باپ کی بیٹی کی حیثیت سے اب اسے آگے بڑھنا چاہیے۔

سو نے سیاسی پارٹی نیشنل لیگ فار ڈیمو کریسی بنائی، پارٹی کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے اس نے پورے برما کا دورہ کیا جس کا ایک مقصد تو یہ تھا کہ دوسرے شہروں میں اپنی پارٹی کے دفتر بنائے جائیں اور دوسرا اگر اہم مقصد یہ کہ لی ون کے فوجی دور حکومت میں جو آخر میں فوجی کی بجائے سول نقاب پہن چکی تھی لوگ بہت خوفزدہ ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ اب ان لوگوں میں حوصلہ اور ہمت پیدا کی جائے۔ سو کو انگریزی اور برمی دونوں زبانوں پر زبردست قدرت حاصل تھی برمی زبان میں بات کر کے وہ اپنے باپ کی طرح لوگوں کے دلوں تک پہنچتی تھی اور انگریزی زبان کے ذریعے وہ دنیا والوں کو اپنے فکر و عمل سے آگاہ رکھتی تھی اس کے لئے زیادہ اہم کام یہ تھا کہ لوگوں کو برسوں کی مردنی سے بیدار کیا جائے جنہوں نے حال ہی میں احتجاج کر کے زندگی کا تھوڑا سا ثبوت دیا تھا۔ فوجی حکومت کا حکم یہ تھا کہ چار سے زائد افراد کا اجتماع غیر قانونی ہے اس لئے اسے طاقت کے استعمال سے منتشر کیا جا سکتا ہے ایسے حالات میں عوام میں جا کر کام کرنا جسمانی اور ذہنی قوت پر لازماً اثر انداز ہوتا تھا اس کے علاوہ اس عمل میں جاں کے زیاں کا بھی خطرہ تھا۔ سو کی صحت اور زندگی دونوں کا خطرہ مول لینا پڑا۔

ایک موقع پر متذکرہ بالا قانون کے تحت ایک فوجی کپتان نے بندوق کی نالی پر سو اور اس کے حمایتوں کے ایک گروہ کو روک لیا اور کہا کہ اگر آگے بڑھے تو گولی چلا دی جائے گی۔ سو نے کمال سکون سے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ ایک طرف ہو جائیں اور انتظار کریں، اسی دوران وہ خود اکیلی سڑک پر چلی گئی۔ یہ اس کا فوری فیصلہ تھا کہ صرف ایک انسانی زندگی کو خطرے میں ڈالا جائے اور وہ زندگی اس کی اپنی ہونی چاہیے۔ یہ بڑی بہادرانہ چال تھی اور کامیاب رہی، کیونکہ عین اسی وقت ایک طرف سے ایک میجر آیا اور اس نے کپتان کو گولی چلانے سے منع کر دیا مگر یہ سارا عرصہ ایسے گزرا جیسے کوئی تلوار کی دھار پر سے گزرے۔ سو اپنی تربیت کے سلسلے میں بات کرتے ہوئے ہمیشہ یہ کہتی کہ میری تربیت بڑی سخت ہوئی ہے، بہت ہی سخت مگر انتہائی ناخوشگوار اور اچانک غیر متوقع صورت احوال میں بھی تربیت اس کے کام آئی یہ موقع بھی یقیناً اسی قسم کا تھا بہر طور آخری نہیں تھا۔

اس واقعہ کے بارے میں پڑھتے اور سنتے ہوئے مجھے ڈاکھن چبہ، یاد آگئی۔

بے شمار مواقع ہر صورت حال کو بچانے اور تباہی سے گریز کی خاطر اسے حوصلے اور جرات معاملہ فہمی اور فیصلہ، خوش تدبیری، سفارتی حربے اور دوسروں کو شیشے میں ڈھالنے کی ضرورت پڑی۔ اس نے ہمیں ایسے کئی واقعات سنائے اور سو یہ سب کچھ جانتی تھی۔ حتی کہ ڈاکھن چینئ کی ریٹائرمنٹ کے بعد بھی اس کے سامنے ایسی صورت حال پیش آئی، آخر اس جنرل آنگ سان کی بیوی تھی جس نے عمر بھر حوصلہ جرات اور ذہانت کا مظاہرہ کیا۔

سو کے کردار اور اس کی شخصیت کی پختگی کے سرچشموں کی دریافت کی کوشش میں میں نے اس کی کمزوریوں اور کمیوں کا خیال نہیں کیا۔ یقیناً اس میں کمزوریاں ہیں۔ دنیا میں کوئی ایسا ہے جس میں کوئی کمزوری نہ ہو؟ لیکن بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کی خوبیاں خرابیوں کے مقابلے میں اتنی زیادہ ہوتی ہیں کہ آخری حساب کتاب میں خامیاں نظر ہی نہیں آتیں۔ میرے نزدیک سو ایسے ہی ہمہ صفت لوگوں میں شامل ہے۔ جو لوگ اس میں جو خامی سمجھتے ہیں انہیں سو کو یہ بات بتانی چاہئے۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ کردار کا متوازن جائزہ لینا تو میں ایسا کام نہیں کرتی میرا مقصد صرف یہ بتانا تھا کہ والدین سے جو میراث بچے کو ملی یا زمین کو ملی اس سے پودے کی کیسی نشوونما ہوئی اور کیسے پھل پھول آئے۔

سو دیانتداری مقصد سے گہری لگن، انتھک عزم اور یک سوئی سے ایک منزل کے حصول کے لئے سرگرم ہے حس مزاح کے ساتھ ساتھ سنجیدگی بھی اور عذاب و مخاصمت کے مقابلے میں وقار اور ارادہ بھی۔ آکسفورڈ میں گزارے تعلیمی سال، شادی شدہ زندگی، بچوں کی پرورش، کمزوروں اور بوڑھوں کے لئے محبت اور تشویش" وسیع اور بہت دور دور پھیلی دوستیاں، جو اس نے پالی ہیں اور جن میں اس کے قید کرنے والوں نے تھوڑی سی کمی کر دی ہے، اس کی نئی نئی دلچسپیاں، شاندار تعلیمی اور تحقیقی شوق جو اس کے کہنے کے مطابق اس کے شوہر کی دین ہے اور پھر اس کی حالیہ زندگی کے نشیب و فراز ان سب عوامل نے مل کر اس کی زندگی کو ایسی پختگی، اخذ و اختیار کی صلاحیت، اہلیت اور نئے نئے چیلنجوں کو قبول کرنے کا شوق دے دیا ہے جو صرف مقامی اور گروہی نہیں۔ مختصر الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ پسے ہوئے لوگوں کی امیدوں اور جذبوں کا مرکز بن گئی ہے۔ اس لمحے تو یوں لگتا ہے کہ اس کے بڑھنے پھولنے کا عمل رک گیا ہے، وقت ٹھہر گیا ہے لیکن اس کے بڑھنے اور نکھرنے کے عمل کو کسی صورت روکا نہیں جا سکتا۔ اور شاید اب تو اسے پابند قفس کرنے

سو برمی

این پاسٹرنک سلیٹر

جن دنوں آنگ سان سوچی سے میری ملاقات ہوئی ان دنوں میری کچھ اور دوست بھی تھیں، جن کے نام سو تھے۔ لیکن میرے اور میرے خاندان والوں میں بہت جلد ہی اس کا نام ایک دوسری صورت میں نجی سطح پر نمایاں ہو گیا، جب مجھ سے کوئی پوچھتا کہ گزشتہ رات تم کس سے ملی تھیں تو میں کہتی سو سے اب سوال کیا جاتا کون سی سو؟ اور میرا جواب ہوتا سو برمی۔ یہ لقب تھا، خطاب تھا، صرف مجہول سالاحقہ یا سابقہ نہیں تھا، جیسے کیئس مارٹیئس کورلولینس Caius Martius Coriolanus کوریولینس کا لقب، کوریولی نامی شہر کے نام کی حیثیت سے اس کے نام کا حصہ بنا تھا۔ یہ برمی والی نسبت میں نے کبھی سو کے سامنے استعمال نہیں کی تھی مگر یہی لفظ اس وقت اس کے پورے وجود اور کارناموں کی علامت بن گیا ہے۔ ہم دونوں میں آشنائی ۱۹۶۴ء میں ہوئی، ہم دونوں آکسفورڈ سینٹ ہیو کالج میں تازہ واردان تھیں۔ مجھے تسلیم ہے کہ پہل میں نے کی اور وہ اس لئے کہ وہ مجھے بڑی خوبصورت لگی تھی ایک بدیسی شے ـــــ اس میں وہ سب خوبیاں تھیں جن سے میں محروم تھی۔ میں آکسفورڈ گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور تعلیم بھی آکسفورڈ میں ہی حاصل کی تھی نہ تو میں تھی اور نہ ہی ایٹمی اسلحہ کے خلاف مہم کی کارکن ـــــ لیکن سکول اور یونیورسٹی کے دنوں میں چھٹیوں میں دیس بدیس گھومتی رہتی تھی، کبھی یونان میں پاپیادہ، کبھی اسرائیل میں انگوروں اور مکئی کے بھٹوں پر منہ مارتی کبھی بحیرۂ روم میں بحری جہاز کے عرشہ کے مسافر کی حیثیت سے سفر کرتی۔ اور اینا کیرے نینا (ٹالسٹائے کا انتہائی ضخیم

ناول) کو بطور تکیہ استعمال کرتی۔

میری ہم عصر انگریز لڑکیوں کے لاابالی رویئے، نیم عریاں لباس، بے معنی آزادہ روئی، اور بے اعتبار جنسی اخلاقیات کے مقابلے میں مجھے سو کی کسی کسائی لنگی، پورا لباس، پکے اخلاقی اصول اور موروثی سماجی وقار، بہت ہی مختلف بلکہ متضاد اوصاف لگے اور مجھے پسند آئے۔

آکسفورڈ میں پانچ مکمل طور پر زنانہ کالج ہیں ان میں ایک کا نام سینٹ ہیو ہے۔ اس کالج کو اس لئے بھی پسند نہیں کیا جاتا تھا کہ یہ بہت دور واقع ہے۔ یعنی بیلیول یا سینٹ جان کالج سے بائیسکل پر پورے تین منٹ کی مسافت پر اور ہاکی کے حوالے سے بہت بدنام۔ نووار دان کے حوالے سے ہمیں بڑی عمارت میں رکھا گیا جسے سنگین سمجھا جاتا تھا۔ اس عمارت کے دروازے سیاہی مائل بھورے تھے نیم تاریک اور بڑی لمبی لمبی غلام گردشیں تھیں، برتن رکھنے کے لئے میلی میلی سے پڑچھتیاں، جہاں سیدھی سادی گھریلو قسم کی لڑکیاں چائے اور کوکا ابالتی اور پیتی رہتیں۔ جب ہم پہلے پہل اس عمارت میں آئی ہیں تو ایک یہ افسانہ بڑا مشہور تھا کہ کبھی کبھار کوئی مرد اگر ادھر آئے تو اس کی خبر ان پائپوں کو بجا کر دی جاتی تھی جو ہر کمرے میں موجود تھیں اور ان کے ذریعے کمرے گرم کئے جاتے تھے۔ ایک دو دہائی پہلے یہاں عام افواہ ہوا کرتی تھی کہ جن لڑکیوں کے رشتہ دار مرد ملنے والے آتے تھے ملاقات کے دوران ان کے بستر اور چارپائیاں کمروں میں سے نکال کر باہر کاریڈور میں رکھ دی جاتی تھیں۔ بہر طور ہمارے زمانے میں ہم پر لازم تھا کہ رات دس بجے تک واپس آجائیں۔ زیادہ سے زیادہ رات بارہ بجے تک باہر رہا جاسکتا تھا مگر اس کے لئے پاس یا اجازت نامہ حاصل کرنا ضروری تھا۔ جنسی طور پر آزادہ رو چند متین تجربہ کار لڑکیوں اور اعصابی قسم کی نوخیز کنواری لڑکیوں کی موجودگی اور باہمی مکالمہ بازی کے باعث عمارت میں ایسی گرما گرم فضا بن جاتی جیسے ریل کے کسی ڈبے میں ہوتی ہے۔ اس فضا میں سو کا رویہ ہر دو سے مختلف تھا اور وہ اتنی سادہ اور واقعی معصوم نظر آتی کہ اس پر ہنسی آنے لگتی۔ اس زمانے کی سو کے بارے میں میری یادوں میں جو جو باتیں محفوظ ہیں وہ یہ ہیں۔ انتہائی صفائی پسندی، زبردست عزم و ارادہ، جستجو اور تجسس، اور انتہا درجے کی پاک بازی ــــــ مجھے اس کی شکل و صورت کچھ اس طرح کی نظر آتی ہے۔ ایک نمایاں حاشیہ کے نیچے ابروؤں کی

گرمیوں میں جینز کے دو جوڑے خرید لئے اور اس کے ساتھ خوبصورت مولٹن سائیکل بھی جس کے پہیوؤں کو تہہ بھی کیا جا سکتا تھا۔ ایک سہ پہر اس نے یونیورسٹی میں سائیکلنگ کے ٹریک پر سائیکل چلانے کی مشق کی اور اسی دن مشاق ہو گئی۔ آکسفورڈ کی ایک اور شرط بھی ہے اور وہ ہے ہموار سطح اور چھوٹے کناروں والی کشتی پنٹ کا چلانا۔ بہت وزنی اور بے ہنگم ـــــ اسے چلانا گویا کسی سائیڈ بورڈ کو چلانا ہے۔ پنٹ کو چلانے کی مہارت اگر آپ خود حاصل کرنا چاہیں تو یہ مشکل کام ہے۔ کشتی دائروں میں گھومتی اور بے زار کرتی ہے، پھر ہچکولے کھاتی کبھی دائیں کبھی بائیں کنارے سے ٹکراتی ہے اور پھر آپ کو جا کر پتہ چلتا ہے کہ چپو کس طرح چلانا ہے اور منہ زور کشتی کو کیسے قابو کرنا ہوتا ہے۔ ایک روز سو صبح کی دھند میں پنٹ چلانے تن تنہا نکلی اور جب شام کے سائے ڈھلنے لگے اس دھند لکے میں کامیاب و کامراں واپس آئی اور لطف یہ ہے کہ اس نے کشتی رانی میں بھی مغربی آسان لباس نہیں پہنا اپنی لنگی پہن کر کشتی کو کنارے لگاتی رہی۔ اب بات شراب کی ہو جائے جو اس کے لئے ایک شجر ممنوع تھی۔ سو نے ہمیشہ سماجی اور مذہبی بنیادوں پر شراب پینے سے انکار کر دیا تاہم وہ یہ بھی جاننا چاہتی تھی کہ یہ لگتی کیسے ہے؟ سال آخر کے بالکل آخیر میں وہ ایک چھوٹی بوتل خرید لائی. بڑے خفیہ انداز میں مگر وہ کیا تھی. شیری؟ وائین؟ اس کے ساتھ دو ہندوستانی سہیلیاں بھی تھیں. انہوں نے شراب کے لئے بوڈلین لائبریری کی لیوریٹری (غسل خانے) کا انتخاب کیا. جہاں کی فضا ہی اس تجربے کے لئے زہر قاتل تھی بہر طور اس نے پی اور ہمیشہ کے لئے شراب سے تائب ہو گئی۔

ہم دونوں کے پاس اب ڈگریاں تھیں اور انہی کے سبب ہم دو مختلف راستوں پر چل پڑیں۔ سو نیویارک میں اقوام متحدہ میں ملازم ہوئی، پھر بھوٹان اپنے مرد کے پاس چلی گئی جس سے اس نے شادی کی تھی اور جو طالب علمی کے زمانے سے اس کا دوست تھا۔ اس زمانے کی ٹکڑا ٹکڑا یادیں بہت مدھم ہیں۔ جیسے تصویروں کے غائب ہوتے ہوئے خدوخال ـــــ ان میں سے بعض اب بھی بہت نمایاں ہیں ان کا تعلق سو کے خطوں سے ہے. جب سو لندن میں تھی تو اس کی کیفیت یہ تھی کہ بظاہر بڑی پر سکون، سرفراز، سنجیدہ، اداس اور بے منزلی کی فکر میں غلطاں، وہ بہت پر عزم تھی مگر سامنے ایک نامعلوم خلا تھا جسے بہر طور عبور بھی کرنا تھا۔ لیکن اب وہ بھوٹان کی وادیوں میں اپنے خاوند کے پہلو میں کھڑی قہقہے لگاتی نظر

آتی ہے۔ ان کے پاس ایک جیپ ہے اور پہاڑی نسل کا کتا۔ ایک وسیع منظر میں قسمت آزما جوڑا۔ ان کی چمکتی جیپ، اور ان کا کتا ______

اس وسیع منظر میں ایک چھوٹا سا دھبّہ!

پھر سو اور مائیکل اپنے لندن والے چھوٹے سے مگر انتہائی صاف ستھرے فلیٹ میں نظر آتے ہیں اب ان کا بچہ بھی ہے الیگزینڈر...... صوفے پر سہارا دے کر لٹایا گیا، غیر معمولی طور پر سیدھی کمر اور جمے ہوئے سر والا۔ ابھی وہ تین ہفتے کا ہے مگر چال ڈھال میں ماں کا نقش ثانی ہے۔ یہ یادیں بڑی خوشگوار ہیں مگر بہرحال کھو جانے والی۔

ساتویں دہائی میں ہم سب ایک بار پھر واپس آکسفورڈ میں آچکے تھے۔ مائیکل کو سینٹ جانز کالج میں جونیئر فیلوشپ مل گئی تھی۔ میں نے بھی شادی کر لی تھی اور تحقیق کا کام کر رہی تھی۔ سو مائیکل اور الیگزینڈر کچھ عرصہ آکسفورڈ سے باہر ایک بے ہنگم مکان میں رہے اور پھر عین آکسفورڈ کے درمیان واقع ایک فلیٹ میں آگئے جو میرے والی گلی کے نکڑ پر تھا۔ گزشتہ زمانے کی یادیں اب بھی روشن ہیں مگر اب ان میں ایک کسک سی محسوس ہوتی ہے۔ سینٹ جونز کالج والوں نے انہیں جو فلیٹ دیا تھا وہ گراؤنڈ فلور پہ تھا اس کی چھتیں اونچی اور کھڑکیاں بھی بہت بڑی بڑی تھیں، باہر سے بہت کشادہ نظر آتا تھا مگر عملاً ایسا نہ تھا۔ اس میں ایک تو جنوبی رخ پر بہت بڑا کمرہ تھا، لونگ روم، جہاں یہ لوگ عملاً رہا کرتے تھے شمال میں بجھا بجھا سا ماحول تھا جس میں چھوٹا سا کچن، ایک بیڈ روم اور ایک باکس روم جو بچوں کے بھی کام آتا۔ ان کے ساتھ ایک گیسٹ روم تھا جو اکثر مہمانوں کے قبضے میں رہتا۔ ایک تو سو کی بہت ہی پیاری خالہ تھی جو سال کا ایک خاص حصہ ان کے ساتھ گزارا کرتی پھر برمی رشتہ دار آتے۔ بھوٹان کے ملاقاتیوں کے علاوہ اور بھی بہت جاننے والے آتے اور یہ جوڑا ان مشکل حالات میں بھی بغیر کوئی حرف شکایت لب پر لائے ان کی خاطر تواضع کرتا رہتا۔ لائبریری جاتے ہوئے میں اکثر سو کو سائیکل کا پیڈل مارتے دیکھتی وہ اس سائیکل پر قصبے سے سستے پھل اور سبزیاں لاتی جو پلاسٹک کی بڑی بڑی ٹوکریوں میں رکھے ہوتے اور ٹوکریاں خاصی بوجھل ہوتیں۔ میں جب کبھی سہ پہر کو اپنی بیٹی کو لئے سو سے ملنے جاتی ہمیشہ یہی دیکھتی کہ یا تو وہ کچن میں بیٹھی کم خرچ جاپانی طریقے سے مچھلی بنا رہی ہوتی۔ یا سلائی کی مشین پر بیٹھی بے انتہا لمبی چوڑی کھڑکیوں کے لئے کاٹن کے پردے سی رہی ہوتی یا کٹ پرائس

دوسری بات ہے کہ جس قسم کا حسن سلوک سو نے کیا، ان دوستوں نے ایسا تپاک نہیں دکھایا۔ کالج کے زمانے میں اس نے ایک جرمن مصور کی دستگیری شروع کر دی جو میری ماں کا دوست تھا اس مصور کی امداد کے لئے ہم نے اپنے آخری سال میں ایک نمائش بھی کرائی۔ مس پلیشے کو نوجوانی میں گردن توڑ بخار ہو گیا تھا چنانچہ ساٹھ سال کی عمر میں بھی اس کے کچھ بالکل بچوں ایسے اطوار تھے اور اسے سنبھالنا بہت ہی مشکل ہو گیا تھا۔ آخری عمر میں میرا خاوند، سو اور میں اس کی ایک ٹی پارٹی میں بھی گئے۔ اس میں ہمیں بڑی تکلیف اٹھانا پڑی۔ اس پارٹی میں ہمارے سوا اور کوئی نہیں آیا۔ اس نے آخر کار ہمیں کھیروں والے سینڈوچ دیئے جو چھوٹے چھوٹے تھے۔ میرے میاں نے جب دوسرا سینڈوچ لیا تو مس پلیشے ایک دم ان سے اکھڑ گئیں۔ ہمیں اس خاتون پر غصہ بھی آیا اور افسوس بھی۔ اس کے بعد یہ سو تھی جس نے اس خاتون سے دوستی جاری رکھی اسے کھانے پر بھی بلاتی اور بڑی محبت کے ساتھ اس کے گھر ملنے بھی جایا کرتی۔ سو اور میری ماں ان دو چند افراد میں سے تھیں جنہوں نے مس پلیشے کی آخری دنوں کے خفقانی مزاج میں بھی اس کا بہت خیال رکھا۔

یہ ہے سو، ایک نایاب جنس۔ ایک سچی انسان دوست۔ کالج کی میٹرن ہو یا دوسری ادنیٰ ملازمائیں وہ سب کے ساتھ بڑی گرم جوشی، پیار کے ساتھ برابری کی سطح پر ملا کرتی تھی، بالکل اپنے بہت ہی قریبی دوستوں کی طرح۔ وہ دوسروں کو سماجی مرتبہ کے حوالے سے نہیں اخلاقی اعتبار سے قبول یا مسترد کرتی تھی۔ اسے اپنے خاندان کے بعض افراد اور بعض دوست بھی سخت ناپسند تھے اور اس نے اس ناپسندیدگی پر بھی پردہ ڈال رکھا ہوتا (اگر وہ یہاں ہوتی تو وہ میرا یہ سارا پیرا کاٹ دیتی کیونکہ اس کی نظر میں یہ سطور دوسروں کو دکھ پہنچاتی ہیں) میں کبھی کبھی بالارادہ ایسی حرکت کرتی جس کو وہ ناپسند کرتی مگر یہی بات دراصل اس کی دوستی کو اور بھی مزیدار بنا دیتی۔ وہ اخلاقی گراوٹ یا لغزش نظر انداز کر ہی نہیں سکتی تھی بلکہ وہ ہمارے اوٹ پٹانگ قسم کی اخلاقیات کے لئے لٹمس پیپر کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ نہ تو وہ کوئی صالح قسم کی چیز تھی، نہ خود کو غیر معمولی اہمیت دینے والی، طبعاً سادہ سی افہام و تفہیم کی عادی، زمین زادی اور خوش گفتار عام سمجھ بوجھ کی خاتون ہے۔

حالات جیسے جیسے بہتر ہوتے گئے سو کی دلچسپیوں کا دائرہ بھی وسیع ہوتا گیا۔ یہ خاندان پارک ٹاؤن کے ایک خوبصورت گھر میں منتقل ہو گیا۔ پارک ٹاؤن انیسویں صدی کے طریق کی بستی تھی جو ہلال نما باغ کے ارد گرد بنائے مکانات پر مشتمل تھی۔ اس میں سے کئی گلیاں پیچھے نکلتیں جو گنجان آباد تھیں یہ گھر بڑا اونچا مگر لمبائی چوڑائی میں کم تھا، اس کی پانچ منزلیں تھیں جن میں اوپر والی تین منزلوں میں پہلے کرایہ دار تھے، نچلی منزل اور تہہ خانہ میں خاصی مرمت وغیرہ درکار تھی۔ اس گھر میں مائیکل اور سو کو جو مزید مکانیت یا کشادگی حاصل ہوئی وہ پھر ضرورت مند مہمانوں کی بھینٹ چڑھ گئی۔ جو کماتے وہ کرایوں اور فیسوں میں چلا جاتا۔ بہرطور سو کو وقت زیادہ مل گیا اور اس میں وہ نئے نئے چیلنج تلاش کرتی رہی۔ انڈر گریجوایٹ ہی تھی کہ فلسفہ، سیاسیات اور معاشیات چھوڑ کر انگریزی ادب یا فارسزی کے مضامین لینے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئی دوبار اس کی درخواست مسترد کر دی گئی مگر وہ اس انکار سے مطمئن نہیں ہوئی اور نہ اپنی ذہانت سے مایوس اس نے سینٹ ہیوز کالج میں انہیں مضامین کے لئے داخلہ لینے کی درخواست دے دی، سیکنڈ انڈر گریجوایٹ ڈگری کے لئے اس کا امتحان لینے کے لئے اوتھیلو (شیکسپیئر کا ڈرامہ) پر دو مضامین لکھوائے گئے۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ اس نے انتہائی خوبصورت انداز میں یہ مضامین لکھے "غیر جذباتی" اور سبک انداز میں اس نے اس المیئے کا اعلیٰ درجے کا تجزیہ کیا تھا۔ مگر سو کی درخواست کو مسترد کر کے اسے تو نہیں البتہ کالج کو نقصان پہنچایا گیا۔ انگریزی کی بجائے اس نے گھر پر ہی جاپانی زبان پڑھنا شروع کر دی اور پھر اسی میں اپنے باپ کی سوانح حیات لکھی۔ سو نے ایک سال کیوٹو یونیورسٹی میں گذارا اور چھوٹا بیٹا کم اس کے ساتھ رہا۔ پھر ایک سال اپنے خاندان کے ساتھ ہندوستان میں گزارا. سو اور مائیکل دونوں شملہ میں تعلیمی عہدوں پر فائز تھے۔

پھر ہم پر وقت ایسا بھی آیا کہ زندگی نے بگٹٹ دوڑنا شروع کر دیا۔ میں ایک طرف یونیورسٹی میں پڑھاتی تھی دوسری طرف میرے چار بچے تھے۔ سو اپنے طور پر لکھنے پڑھنے میں مشغول تھی, مگر وہ اس سارے شتم پشتم کام سے مطمئن نہیں تھی, اس کی صلاحتیں بڑا میدان مانگتی تھیں۔ تاہم اقوام متحدہ کی ملازمت کے دوران اس کا چٹان ایسا عزم اور موروثی سیاسی اور سفارتی مہارت نے صورت گری اختیار کرنا شروع کی ہم اپنے اپنے طور پر سخت مصروف تھیں تاہم میری ماں سو کے ہمسائے میں رہتی تھیں میں انہیں ملنے جاتی تو سو

سے بھی کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی۔ ہم اس ہلال نما باغ کے ارد گرد چکر لگاتے اپنی پریشانیوں اور تفکرات کا تبادلہ کرتیں۔ اس کے اخلاقی معیار اور عقیدے بدستور پہلے والے استحکام کے ساتھ اس کے ساتھ تھے۔

ہماری زندگی اور بھی پیچیدہ ہوتی جا رہی تھی اب وہ اتنی سادہ نہیں رہی تھی۔ میری ماں بوڑھی ہو رہی تھیں اور بیمار رہتی تھیں۔ کچھ عرصے کے لئے انہیں وہم کی بیماری ہو گئی جس نے ان کو انتہائی نحیف و نزار بنا دیا۔ اتنی کمزور کہ جب میں ان کے سر کو تھپکتی تو میرے ہاتھوں کو بالوں کا احساس کم اور کھوپڑی کی موجودگی کا احساس زیادہ ہوتا۔ میری بہت سی سہیلیاں انہیں ملنے جایا کرتیں سو کو وہ بہت چاہتیں میری ماں کے پاس سو کی موجودگی بہت ہی بھلی لگتی۔

میں معمول کے مطابق ایک صبح جب ماں کو دیکھنے آئی تو دیکھا کہ سو بھی موجود ہے۔ سو نے دراصل یہ منظر دیکھا کہ میری ماں نیم برہنہ، پریشان حال کبھی ادھر کبھی ادھر آجا رہی ہیں، سو انہیں وہاں سے گھر لے آئی۔ وہ جس خوبصورت مشفقانہ انداز میں میری ماں سے باتیں کر رہی تھی اور پھر جاتے جاتے اس نے مجھے جس انتہائی تشویش بھرے انداز سے دیکھا میں وہ سب کچھ کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتی۔ اس کے ایک ہفتے کے اندر اندر اسے اپنی ماں کی تیمارداری کے لئے برما میں بلا لیا گیا۔ اور پھر باقی کا قصہ سب کو معلوم ہے۔

میری ماں کا انتقال بھی تقریباً انہی دنوں میں ہوا جب سو کی ماں نے کوچ کیا تھا۔ میں بھی پارک ٹاؤن کے مکان میں آ گئی۔ جہاں کئی بار صبح کے وقت سولہ سال طویل القامت الیگزینڈر کو سائیکل پر سکول جاتے اور کم کو پریپ سکول کی وردی میں سنجیدہ بورڈ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے دیکھا کرتی۔ گرمیوں کی صبحوں اور خزاں کی دھواں شاموں میں میری ملاقات مائیکل سے بھی ہو جاتی جو بوڑھے کتے پیپی کو سیر کرا رہا ہوتا۔

پھر اور وقت گذر گیا، پیپی مر گیا، اب مائیکل ہارورڈ میں ہے۔ الیگزینڈر لندن میں اور کم بورڈنگ ہاؤس میں۔ سو اپنے گھر میں نظر بند ہے۔ ہر شام جب میں اپنی کار گیراج میں کھڑی کرتی ہوں مجھے سو کا خیال آتا ہے اور پھر ژیٹس Yeats کا ایک مصرع میرے ذہن میں بار بار گردش کرتا ہے۔ ژیٹس نے شروع شروع میں یہ نظم سو جیسے سیاسی مصلح ماؤد گونے Maud Gonne کے نام لکھی، مگر ماؤد سو کے برعکس مسلح بغاوت کا علمبردار

تھا۔ ژیٹس کہتا ہے۔

کتنے لوگوں کو پسند آئی وجاہت تیری
کتنے لوگوں نے ترا حسن سراہا ہو گا
ہاں مگر وہ جو تری روح کا شیدائی ہے

میری طرح بہت سے لوگ سو کے حسن سے متاثر ہوئے ہوں گے مگر ہماری اس سے بے کراں محبت اور اس کی مداحی اس لئے ہے کہ اس کی روح بلند و بالا ہے، اس میں حوصلہ، عزم، اور غیر معمولی اخلاقی قوت ہے اور یہ اوصاف اس کے کردار میں اس وقت بھی جھلکتے تھے جب وہ طالب علم تھی اور جب وہ ماں بنی تھی۔
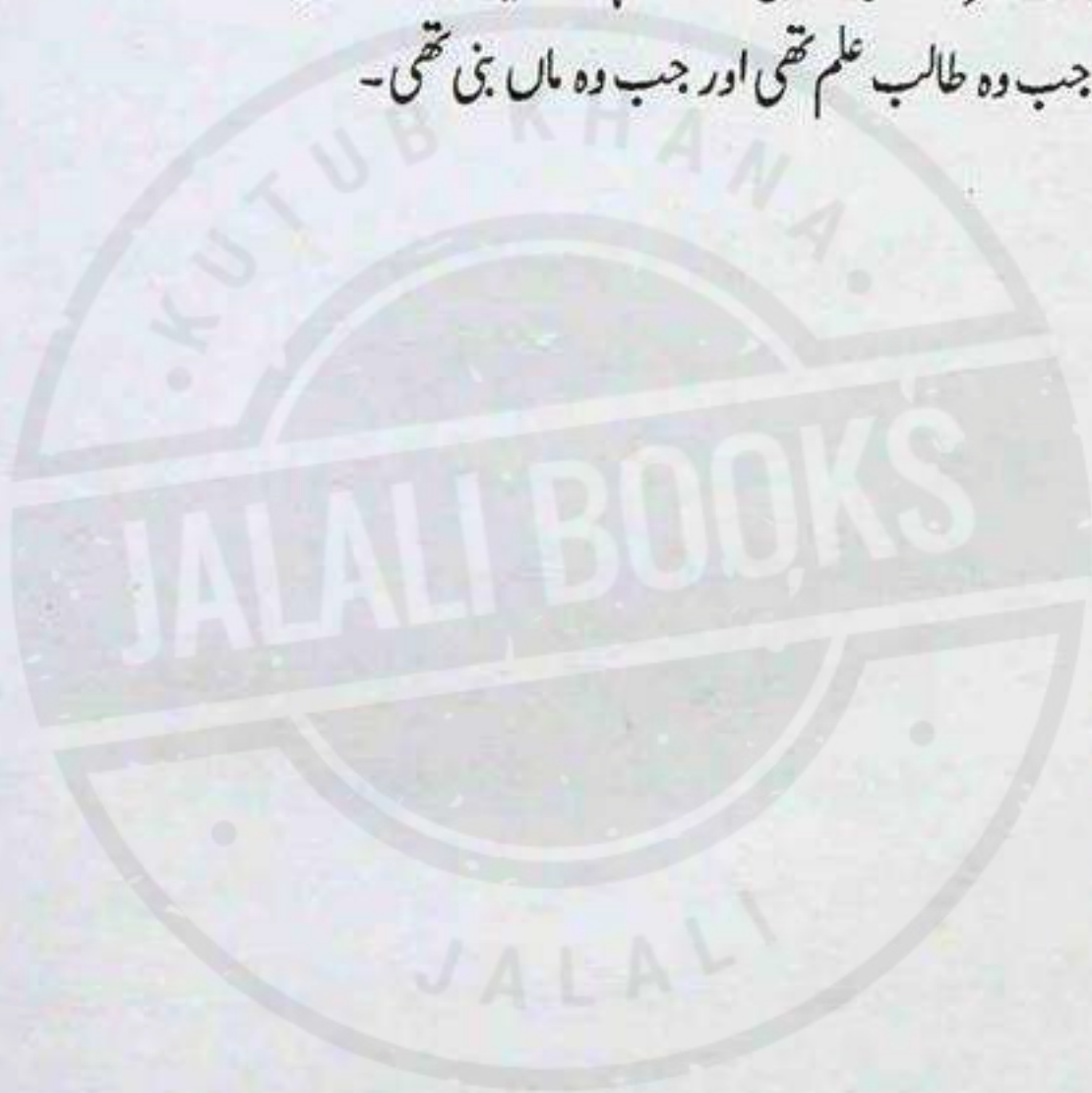
آنگ سان سوچی

از جوزف سلور سٹین

۲۶ اگست ۱۹۸۸ء کو جب وہ فوج کی حمایت یافتہ آمریت کے خلاف عوام کی پرامن بغاوت میں شریک ہوئی اس وقت تک لوگوں کو شائد ہی معلوم ہو کہ آنگ سان سوچی کون ہے اور اس کا مقصد کیا ہے۔ سیتھ مائڈنز نے "نیویارک ٹائمز" میں لکھا۔ "اس سے پہلے وہ سیاست میں نہیں آئی لیکن ایک سفارتی نمائندے نے بتایا کہ اس کا نام ہی عوام پر جادو کر دیتا ہے اور اس جادو کا راز یہ ہے کہ وہ آنگ سان کی بیٹی ہے جو بعد از جنگ قوم پرست تحریک کا لیڈر تھا اور عین برما کی آزادی کے موقع پر قتل کر دیا گیا تھا۔ قوم میں اس کا نام آج بھی بہت محترم ہے اور ابھی لوگوں کے ذہن میں اس کی یادیں تازہ ہیں اور جیسے ہی اس کی بیٹی سیاسی میدان میں اتری وہ برما کی سیاسی جدوجہد کا مرکز بن گئی۔

آج اس کی آواز دبا دی گئی ہے اسے گھر پر نظر بند کر دیا گیا ہے۔ اسے مئی ۱۹۹۰ء کے الیکشن میں حصہ لینے کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ اسے اپنے حامیوں سے رابطے کی اجازت نہیں دی گئی، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ فوجی حاکم اس سے سخت خائف ہیں فوجی حاکموں نے منتخب نمائندوں کو قومی اسمبلی میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دی اور نہ قانونی طور پر حکومت بنانے دی ہے۔ اگر برما میں بھی الیکشن کرنے کا یہ مطلب تھا کہ انڈونیشی ٹائپ کی جمہوریت ویانگ (پتلیوں کا کھیل) پر قائم فوج پتلی والے (والانگ) کے طور پر پردے کے پیچھے بیٹھی، پتلیوں (سیاسی جماعتوں) کو نچاتی رہے تو برما والوں نے اس پتلی تماشا کو دیکھنے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے فوج کے خلاف اور آنگ سان سوچی کے حق

میں ووٹ دیا۔ وہ خود امیدوار نہیں تھی ...... بیرونی حکومتوں نے اور انسانی حقوق کی کئی تنظیموں نے برما کی حکومت سے اپیل کی کہ اسے انتخاب میں حصہ لینے دیا جائے مگر اسے الیکشن سے خارج کر دیا گیا۔ وہ نیشنل لیگ فار ڈیموکریسی کی لیڈر ہے اس حیثیت میں لوگ بے صبری سے انتظار کر رہے ہیں کہ کب اسے رہا کیا جاتا ہے کب وہ قوم کی قیادت سنبھالتی ہے اور لوگوں کے اس خیال کو عملی روپ دیتی ہے کہ وہی برما کی اصل راہ نما ہے۔

آنگ سان سوچی کون ہے، اتنی مختصر سی مدت میں وہ مقبولیت کی اس معراج پر کیسے پہنچ گئی اور پھر ایسے ملک میں جس میں گزشتہ انتیس برسوں سے فوجیوں کا راج ہے جہاں عہد حاضر میں کسی عورت کو قیادت سونپنے کا کبھی سوچا تک نہیں گیا؟ کیا وہ قیادت کی وہ عبا پہننے کے لئے آئی ہے جو چالیس برس پیشتر اس کے مقتول باپ کے سر سے گر گئی تھی یا وہ محض چند دنوں کا کھیل تماشہ ہے؟

برما میں عورت کے لیڈر بننے میں کوئی خاص رکاوٹیں نہیں ہیں۔ برما کی ساری تاریخ گواہ ہے کہ یہاں گھر اور کاج کاج میں عورتوں اور مردوں کو برابر کی حیثیت حاصل ہے۔ شادی تب بھی ایک قسم کا معاہدہ تھی اب بھی ویسا ہی ہے عورتوں کا نام شادی کے بعد بھی وہی رہتا ہے جو شادی سے پہلے۔ طلاق لینا دینا کوئی اچنبھا نہیں اور نہ ہی کوئی طعنہ۔ زیادہ اہم بات یہ کہ ترکے میں عورتیں بھی حصہ دار ہیں۔ صرف بدھ مت کی مذہبی اصطلاحات میں انہیں تھوڑا سا کمتر دکھایا گیا ہے۔ برما کی عہد حاضر کی ایک خاتون نے جس نے قوم کی تاریخ میں اہم کردار بھی ادا کیا ہے، ملک میں عورت اور مرد کے مرتبہ کے بارے میں لکھا ہے۔

> "______ہم اپنے گھروں میں اپنے مردوں کو اولیت دیتی ہیں کیونکہ ہم تادم مرگ انہیں گھر کا سربراہ سمجھتی ہیں۔ یہ مروت ہے جس کا مظاہرہ غالباً ہم اس لئے کرتی ہیں کہ ہمارے حقوق اور ہمارا مرتبہ محفوظ ہے تاہم جو احترام ہم انہیں دیتی ہیں اس کی ایک وجہ ہمارا مذہب بدھ مت ہے، ہمارا ایمان ہے کہ جو نیا بدھ دنیا پر آئے گا وہ مرد ہوگا (تاہم یہ بھی خیال رہے کہ دوسرے جنم میں ہم عورتوں میں سے ہی کوئی مرد بن کر جنم لے سکتی ہے اور اسے بدھ کا مرتبہ حاصل ہو سکتا ہے) ہمارا خیال ہے کہ یہ بات انہیں پیدائشی

طور پر برتری کا احساس دلا دیتی ہے. ذہنی طور پر وہ عورتوں کے مقابلے میں زیادہ بلندیوں تک پہنچ سکتے ہیں" ——

برما کی تاریخ میں ایسی عورتوں کی مثالیں ہیں جنھوں نے اقتدار بھی حاصل کیا اور اقتدار میں شریک کار بھی رہیں، پیگو سلطنت میں پندرھویں صدی میں شن سابو Shin Saw Bu تخت نشین ہوئی اور پھر خود سبکدوشی کے بعد مذہب اور تبلیغ و اصلاح کے لئے وقف ہو گئی۔ کوبونگ Konbaung خاندان میں انیسویں صدی میں برما کے آخری بادشاہ کی ملکہ سپیلیاٹ Supalayat کا اپنے خاوند پر بہت زیادہ اثر تھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ وہ امور سلطنت چلانے میں مشیروں وزیروں کے ساتھ ساتھ شریک کار تھی۔

غلامی کے عہد میں بھی عورتوں نے مختلف پیشوں میں اہم مقام حاصل کیا حتیٰ کہ سیاست میں بھی نمایاں ہوئیں۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں عورتیں رنگون کی سٹی کارپوریشن میں اہم عہدوں پر فائز تھیں، اور اس دہائی کے آخر میں ایک خاتون قانون ساز اسمبلی کی رکن بھی منتخب ہوئی —— رنگون یونیورسٹی کی سٹوڈنٹس یونین نے برما کے قوم پرست لیڈروں کو جنم دیا، اس کی قیادت میں شروع سے ہی طالبات بھی شامل تھیں۔ اور عورتوں نے ۱۹۳۶ء کی تحریک میں بھی حصہ لیا۔ ۱۹۳۷ء میں نئے آئین کے نفاذ پر ایک خاتون اسمبلی کی رکن منتخب ہوئی تھی۔ اس عہد کی نامور خاتون ڈامیا سین Daw Mya Sein بہت بڑی محقق مصنفہ اور استاد تھی وہ بیوی بھی تھی اور ماں بھی اتنی ہی عظیم۔ ایک بڑے قانون دان اور محقق کی بیٹی تھی ۱۹۳۱ء میں لندن میں برما راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں برما کی نمائندگی کی تھی اور پھر دوسری جنگ عظیم شروع ہونے سے پہلے وہ ایک وفد کی سربراہ بن کر چین گئی تھی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد کچھ عورتیں سیاست، انتظامیہ اور سفارتی شعبوں میں بھی رہیں مگر حکومت یا سیاسی پارٹی میں کوئی بھی عورت نمایاں نہ ہو سکی۔ ۱۹۴۷ء کی دستور ساز اسمبلی کے انتخاب میں تین عورتوں نے انتخاب جیتا تھا، چار عورتیں مارے جانے والے لیڈروں کی مائیں تھیں انہیں ان کی جگہ اسمبلی میں نشستیں دی گئیں۔ آزادی کے بعد ۱۹۵۲ء کے پہلے قومی انتخابات میں دو عورتیں رکن بنیں۔ چار سال بعد پانچ نے انتخاب جیتا اور ۱۹۶۰ء میں تین عورتیں رکن منتخب ہوئیں مگر کسی کو بھی وزیر نہیں بنایا گیا نہ اسمبلی پارٹی میں

کوئی عہدہ دیا گیا۔ اس زمانے میں برما کی آئنی صورت حال مختلف تھی وزیراعظم کو اختیار حاصل تھا کہ وہ صوبوں میں سے اپنی کابینہ کے لئے وزیر چن لے جنہیں وہ منتخب کرتا تھا وہ اپنے صوبے کے سربراہ بھی ہوتے تھے۔ ۱۹۵۳ء میں وزیراعظم یونو نے مسز بامونگ چین کو صوبہ کیرن کی نمائندہ نامزد کیا جو اس وقت تک برما کی پہلی اور تنہا خاتون وزیر بنی۔ بعد میں وزیراعظم سے اس کا اختلاف ہو گیا اور اس نے اپنے صوبے میں حزب مخالف کی قیادت کی۔

عہد غلامی اور اس کے بعد سیاسی جماعتوں میں عورتوں کا شعبہ یا شاخ بھی ہوتی تھی۔ دوسری جنگ کے بعد کی غالب پارٹی انٹی فاشسٹ پیپلز فریڈم لیگ DAFPEL کا ایک حصہ ویمنز فریڈم لیگ کے نام سے موسوم تھا۔ ان میں سے بعض خواتین کو انتظامی عہدے بھی دیئے گئے مگر جماعتی سیاست میں وہ کوئی اہم عنصر بن کر نہیں ابھریں۔ ۱۹۶۰ء تک کوئی برمی عورت سفیر نہیں بنی اس سال آنگ سان سوچی کی والدہ ڈاکھن چینی کو ہندوستان میں سفیر مقرر کیا گیا اور ۱۹۶۷ء تک سفیر رہی۔

عہد غلامی میں آزادی کی تحریک کے سلسلے میں بے شمار عورتیں سرگرم رہیں ان میں سے کئی ایک تحریک کے لیڈروں کے ساتھ کام کرتی رہیں مگر انہیں اپنے طور پر کبھی قیادت حاصل نہیں ہوئی۔ ۱۹۶۲ء میں فوجی آمریت شروع ہوئی اس کے بعد عورتوں کا کردار اور بھی کم ہو گیا۔ نئے دستور کے تحت قومی اسمبلی کے ۱۹۷۴ء کے انتخابات میں نو عورتیں منتخب ہوئیں چار سال بعد تیرہ عورتوں نے انتخاب جیتا اس عرصہ میں ہر شعبہ میں فوج اور اس کی تخلیق کردہ سیاسی جماعت ہی غالب رہیں۔ عورتیں مسلح افواج میں تھیں اب بھی ہیں مگر کسی کو کمانڈ یا سینئر پوزیشن نہیں ملی۔

اگرچہ آنگ سان سوچی کو والد اور قوم کے ہیرو کے حوالے سے ایک دم غیر معمولی شہرت اور پذیرائی حاصل ہوئی لیکن اس میں خود بھی بہت سی خوبیاں ہیں جن کی بنا پر وہ خاصی دیر تک اپنی سیاسی حیثیت برقرار رکھے گی پہلی یہ کہ ذہین ہے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ زندگی کے پندرہ سال اس نے برما میں تعلیم حاصل کی جس دوران اس نے دوسرے بچوں کی طرح برمی زبان کے بارے میں علم حاصل کیا اور اس کا استعمال سیکھا بعد میں ہندوستان اور برطانیہ میں قیام کے دوران اس نے اپنی تعلیم جاری رکھی اور ۱۹۶۷ء میں آکسفورڈ کے سینٹ

ہیو سکول سے ڈگری حاصل کی یہاں اس نے سیاست، فلاسفی اور معاشیات کے مضامین پڑھے۔ بعد میں جاپانی زبان سیکھی پھر ۸۶ - ۱۹۸۵ء میں کیوٹو یونیورسٹی میں محقق کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۸۷ء میں اس نے نئی دہلی کے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانسڈ سٹڈیز میں تحقیقی کام کیا۔ ۱۹۸۸ء میں برما سے انگلستان واپسی پر تحقیقی مقالہ لکھنے کے لئے وہ لندن سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز میں داخل ہو گئی۔

وریں اثنا اس نے دو تحقیقی کتابیں اور متعدد مقبول عام قسم کی کتابیں لکھیں۔ اس کی تحقیقی مطبوعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے جدید برمی تاریخ کا کتنا علم حاصل ہے اور اس میں اسے گہری دلچسپی ہے۔ ۱۹۸۲ء میں اس نے اپنے باپ پر ایک طویل مضمون شائع کیا جو بعد میں کتابی صورت میں چھپا۔ ۱۹۸۷ء میں اس نے برمی زبان کے جدید ادب پر ایک تحقیقی مضمون چھاپا۔ آج تک اس کی سب سے نمایاں اہم ادبی تحریر وہ ہے جس میں اس نے ہندوستان اور برما کے عہد غلامی کے ردعمل کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ یہ فکر ارتقا سے متعلق اعلیٰ پائے کی کاوش ہے۔

دوسرے وہ دنیا میں بہت گھومی پھری ہے۔ آکسفورڈ چھوڑنے کے دو سال بعد ۱۹۶۹ء میں وہ نیویارک چلی گئی جہاں وہ اقوام متحدہ کے سیکرٹریٹ میں ملازم ہو گئی ۱۹۷۲ء میں اس نے ایک برطانوی مائیکل سے شادی کر لی جو تبت اور اس علاقے کے امور کا ماہر ہے۔ دونوں بھوٹان میں رہنے لگے، مائیکل شاہی خاندان کا انگریزی کا اتالیق تھا پھر اسے سرکاری ترجمان (ترجمہ کرنے والا) مقرر کر دیا گیا۔ سو نے بھوٹان کی وزارت خارجہ کے لئے اقوام متحدہ کے بارے میں تحقیقی کام کیا۔ دو سال بعد یہ خاندان انگلینڈ آ گیا۔ جہاں آکسفورڈ یونیورسٹی کے تبت اور ہمالیائی علاقے کے امور کے شعبہ میں اسے ملازمت مل گئی۔ آٹھویں نویں دہائی میں وہ اپنی بوڑھی ماں سے ملنے بار بار برما گئی جہاں اصل صورت کا براہ راست مشاہدہ کیا ...... خراب معاشی حالت ...... عوام کے مصائب اور بدعنوان آمرانہ فوجی نظام اس کی تعلیم اور تحریروں اس کے اقوام متحدہ جاپان ہندوستان اور ہمالیائی ریاست کے تجربے، اور برما میں اس کے مشاہدات ان خوبیوں سے لیس ہیں، وہ باقی سارے لیڈروں کے مقابلے میں حکومت پر تنقید کرنے، متبادل نظام کا نقشہ پیش کرنے ...... یعنی اپنے والد کے خیالات کے مطابق جمہوریت کو واپس لانے کے لئے سب سے بہتر پوزیشن

میں تھی۔

قدبُت میں دبلی پتلی اور چھوٹی سی سو...... کئی معاملات میں والد سے ملتی ہے...... ایک گرم جوش مسکراہٹ، چہرے کے مضبوط نقش، تیز آنکھیں، انداز گفتگو سیدھا اور صاف...... اور اپنی موجودگی کا بھرپور احساس دلانے والی۔ جب ۱۹۸۸ء کے دہ انقلاب کی تحریک میں شامل ہوئی تھی اور اس وقت اگر اس کے پاس، سیاسی مہارت اور نہ تجربہ تھا تو اب اس نے بڑی تیزی سے یہ وصف بھی حاصل کر لئے ہیں۔ وہ ہمیشہ روائتی برمی لباس میں ملبوس ہوتی ہے، بامحاورہ بے عیب برمی بولتی ہے ان خوبیوں کے سبب جو کوئی اسے سننے آیا سو نے اس کا دل جیت لیا، وہ اس کے حامیوں میں شامل ہو گیا۔ مانڈلے میں ایک تاجر نے ایک رپورٹر سے کہا "بات سیدھی کرتی ہے اور حیا اور انکساری کے ساتھ۔ جب ہم ایک طرف حکومت کے لیڈر کو سنتے ہیں اور دوسری طرف اسے سنتے ہیں تو ہر برمی جان جاتا ہے کہ ان میں کون اچھا انسان ہے۔" اس نے شروع میں ہی یہ محسوس کر لیا تھا کہ جو لوگ گلیوں بازاروں میں نکل آئے ہیں وہ تبدیلی چاہتے ہیں، کچھ مختلف کچھ نئی قسم کی تبدیلی، چنانچہ اس نے یونو یا کسی دوسرے پرانے لیڈر کی پارٹی میں شامل ہونے سے انکار کر دیا، دراصل یہ لیڈر موجودہ بے قائد تحریک کے لیڈر بننا چاہتے تھے اس کی بجائے پہلے اس نے سابق بریگیڈیر آنگ گئی Aung Gyi کا ساتھ دیا پھر دونوں نے سابق جنرل ٹن یو کے ساتھ مل کر نیشنل لیگ فار ڈیموکریسی بنائی۔

آنگ سان سوچی نے کبھی یہ بات فراموش نہیں کی کہ اسے اس لمحے جو مقبولیت حاصل ہے اس کا سبب صرف اور صرف یہ ہے کہ لوگ اسے اس کے باپ سے ملاتے ہیں اس کی شناخت اس کے باپ کے حوالے سے ہوتی ہے مگر تحریک آزادی کے لیڈروں یا انقلابیوں کی اولاد میں سے صرف وہی اکیلی تو میدان سیاست میں نہیں آئی تھی۔ آنگ سان کے ساتھی، سابق سوشلسٹ پارٹی کے راہنما، اے ایف پی ایف ایل کے بانی رکن اور یونو کی وزارت میں سینئر وزیر کی بیٹی چوچو کیانئر بھی تو اس میدان میں اتری تھی، چند لوگ اس کے جھنڈے کے گرد اکٹھے ہوئے لیکن نہ تو وہ اور نہ ہی کوئی اور آنگ سان کی بیٹی کے برابر کا تھا۔

یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ آنگ سان کون تھا اور وہ برما کے لوگوں کے فکر و خیال

اس کی جنرل سیکرٹری بن گئی۔ اس نے کوچہ بازار میں فوجیوں کے ہاتھوں ان مظاہرین کے قتل کی اور فوج کی طرف سے اقتدار پر قبضہ مضبوط کرنے کی کوششوں کی شدید مذمت اور نکتہ چینی کی۔ جب فوج نے انسانی حقوق کی خلاف ورزی، ظلم و ستم اور ڈرانا دھمکانا زیادہ کر دیا تو اس نے اور سختی سے فوج کو للکارا۔ وہ آزادانہ اور منصفانہ انتخاب کے ذریعے پرامن تبدیلی کا مطالبہ دہراتی رہی مگر جب فوجی حکمرانوں نے اس کے حامیوں کو گرفتار اور پریشان کرنا شروع کر دیا تو صورت حال اور مشکل ہو گئی۔ جیسے جیسے وہ ملک کا دورہ کرتی گئی فوج پر اس کے حملوں میں شدت آتی گئی اور آخر میں اس نے فوج کے رویئے کو فاشسٹ رویہ کہہ دیا اور یہ بھی کہا کہ پرامن تبدیلی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ رویہ ہے۔ جون ۱۹۸۹ء میں اس نے براہ راست نی ون پر الزام لگایا کہ اصل میں فوجی حکومت کا سربراہ وہی ہے، لوگوں کے مصائب کا وہی ذمہ دار ہے اور میرے والد نے جو کچھ حاصل کیا اور حاصل کرنا چاہا تھا۔ اس کو تباہ کرنے والا وہی جنرل نی ون ہے۔

نی ون اور برسراقتدار فوجیوں پر حملہ کرنے سے یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ فوج کو کمزور یا ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتی تھی اس نے کہا۔

> "_______ میں جانتی ہوں کہ فوج ٹوٹی تو ملکی مفاد مجروح ہو گا، ہم تو صرف وہ کچھ چاہتے ہیں جو میرے باپ نے چاہا تھا کہ ایک پیشہ ور فوج جو یہ بات سمجھتی ہے کہ ایک باعزت فوج سیاست میں کبھی ملوث نہیں ہوتی۔ میرے والد نے فوج لوگوں پر جبر کرنے کے لئے نہیں بنائی تھی .... انہوں نے بہت سی تقریروں میں کہا ہے اور خاص زور دے کر کہا ہے کہ لوگوں پر محض اس لئے ظلم نہ کرنے شروع کر دو کہ تمہارے پاس ہتھیار ہیں، آپ کو ملک کی حفاظت کرنی ہے آپ ملک کے لئے ہیں ملک آپ کے لئے نہیں"

سو نے بڑی جلدی بھانپ لیا تھا کہ فوج کی نیت سیاست کو آزادانہ طور پر پھلنے پھولنے کا موقع دینے کی نہیں ہے۔ اگر سیاسی پارٹی کی رجسٹر کرانے کی آزادی ملی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ پارٹی کے نام کا بورڈ لگانا اور اگر جلسہ کرنے کی اجازت ہے تو پانچ افراد سے کم کے اجتماع کو خطاب کرنے کی آزادی ہے اور اگر زائد پٹرول حاصل کرنے کا پرمٹ دیا گیا ہے تو مراد یہ ہے کہ ملک میں دورہ کرلیں اور لوگوں کی حمایت حاصل کریں ٹھیک ہے تو بات

ٹھیک ہو گئی لیکن عملاً یہ ہے کہ سرکاری فرمان کے تحت نہ جلسہ عام ہو سکتا ہے نہ پارٹی لٹریچر چھاپا اور تقسیم کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی آج یا آج سے پہلے کی فوجی حکومتوں پر نکتہ چینی ہو سکتی ہے۔ یوں کچھ بھی کرنا ممکن نہیں رہا۔ اس نے کئی مرتبہ کہا کہ اجتماع کے بارے میں حکم مضحکہ خیز ہے۔ گو انہوں نے اجازت دی ہے کہ لوگ سیاسی جماعت رجسٹر کروائیں مگر وہ ان پارٹیوں کو چلنے ہی نہیں دیتے۔ اخبار کو کوئی آزادی حاصل نہیں، سرکاری اخبار ہر وقت ہم پر حملے کر رہے ہیں مگر ان کا جواب دینے کی کوئی گنجائش چھوڑی ہی نہیں گئی"

گرفتاری تک وہ ایک پختہ کار سیاستدان بن چکی تھی سیدھی اور موثر تقریر کرنے ——— اپنے مخالفوں سے بحث مباحثہ کرنے میں اب وہ کسی لیڈر سے پیچھے نہیں تھی۔

اپنے والد کی طرح آنگ سان سوچی نے مشکل وقت میں جرات اور حوصلے کا مظاہرہ کیا۔ عوام میں اس کی مقبولیت کی وجہ سے حکومت پریشان ہو گئی تھی اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کا مقابلہ کس طور کرے۔ فوجی تبدیلی سے پہلے بھی خفیہ ایجنسیوں اور پولیس نے یہ شوشا چھوڑا تھا کہ وہ کمیونسٹوں کے نرغے میں ہے۔ انہوں نے تھاکن ٹن میا کو اس الزام میں گرفتار کر لیا کہ وہ سو کا مشیر ہے۔ تھاکن برما کی سابق کمیونسٹ پارٹی (بی سی پی) کے پولٹ بیورو کا رکن تھا پھر فوج کی بنائی برما سوشلسٹ پروگرام پارٹی (بی ایس پی پی) کی مرکزی کمیٹی کا رکن تھا۔ اس کے جواب میں سو نے کہا کہ تھاکن پارٹی کے دفتری کام میں تو مدد کرتا ہے مگر نہ تو میں نے اس سے کوئی رائے مانگی ہے نہ اس نے کوئی مشورہ دیا ہے۔

نومبر میں پارٹی بنانے میں سو کے شریک کار آنگ گئی نے بھی اسی قسم کا الزام لگاتے ہوئے کہا کہ سو کو برما کمیونسٹ پارٹی کے ممبروں نے گھیر رکھا ہے اور مطالبہ کیا کہ وہ ان لوگوں کو سامنے سے ہٹا دے۔ اس نے پھر اس بات سے انکار کیا کہ وہ برما کی کمیونسٹ پارٹی کے زیر اثر ہے اور اس کے بعد اس نے این ایل ڈی کے لیڈروں کی حمایت سے آنگ گئی کو پارٹی سے خارج کر دیا۔ مگر الزام تو ختم نہیں ہوا۔ اگلے چند مہینوں میں فوجی ترجمان اسی الزام کو دہراتے رہے۔ جون ۱۹۸۹ء میں حکومت کے ایک ترجمان نے سو کی پارٹی کو ہی برما کی کمیونسٹ پارٹی (جس پر عرصہ ہوا پابندی لگ چکی تھی) قرار دیا۔ اور آنگ سان سوچی یا اس کی پارٹی پر اس قسم کا پہلا حملہ تھا۔ ۵ر اگست ۱۹۸۹ء کو ڈیفنس سروسز انٹیلی جنس کے

ڈائریکٹوریٹ کے سربراہ بریگیڈیئر کھن نیونٹ نے پریس کانفرنس کی اور کہا سو برما کمیونسٹ پارٹی کے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی ہے۔ سو نے شروع میں ہی ان الزامات کی تردید کر دی تھی مگر فوجی حکمرانوں نے یہ راگ جاری رکھا۔

ابتدا میں اپنے احکامات کی عام جلسوں میں خلاف ورزی پر فوجی چپ رہتے مگر جب اس نے ملک کا دورہ شروع کیا۔ اس کے جلسے میں ہزاروں لاکھوں لوگ آنے لگے، سو برما کے سیاسی منظر پر چھاگئی تو انہوں نے جوابی کارروائی شروع کی۔ پہلے وہ لوگوں کو متنبہ کرتے کہ وہ سو کے جلسوں میں نہ جائیں مگر جب وہ آتی جھلک دکھا کر چلی جاتی تو اس کی پارٹی کے ارکان کی پکڑ دھکڑ شروع ہو جاتی۔ دوسرے اس پر ذاتی حملے شروع کر دیئے گئے۔ اس کے بارے میں جنسی نوعیت کے گھٹیا پوسٹر چھاپے گئے اس پر غیر ممالک کے کام کرنے کا الزام لگایا گیا، کہا گیا کہ اگر اسے اقتدار حاصل ہو گیا تو وہ ملک کو فروخت بھی کر دے گی اور آخر میں یہ کہ وہ بدھ مت کے خلاف ہے۔ اس نے پہلے الزام کو نظر انداز کر دیا مگر دوسرے اور تیسرے الزام کا بھرپور جواب دیا ۱۹۸۹ء کے موسم بہار میں جب سان سوچی نے حکومت کے خلاف زیادہ تیز زبان استعمال کرنا شروع کی تو سیاسی بحران بڑھنے لگا۔ اس کے جلسوں میں لوگوں کا ہجوم بڑھ گیا، غیر ملکی صحافی اس کے انٹرویو کے لئے آنے لگے اور پھر دنیا بھر میں اس کے نظریات اور ذات کا چرچا ہونے لگا۔ ۵ راپریل کو ڈینیو بو میں ایک فوجی کپتان نے چھ سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ گنیں لوڈ کریں اور سو پر تان دیں۔ پیشتر اس کے ایک دو تین کی گردان ختم ہوتی ایک میجر نے مداخلت کی، کپتان کے حکم کو منسوخ کیا اور اس کو قتل ہونے سے بچالیا۔ بعد میں فوج کے مقامی حکام نے سو کے حامیوں سے اس واقعہ پر اظہار افسوس کیا مگر ثابت ہو گیا کہ فوج اسے اڑانے دھمکانے کی کوششیں تیز کر چکی ہے۔

حکومت کے خلاف مظاہروں میں مارے جانے والے طلبا کی برسیاں منانے کے دن قریب آرہے تھے اور آنگ سان سوچی اور اس کی پارٹی نے یہ برسیاں منانے کا پروگرام وضع کیا۔ ۲۱ جون کو خراج عقیدت پیش کرنے کی ایسی ہی تقریب تھی جس میں سو اور بے شمار طالب علم شریک تھے کہ فوج نے فائرنگ شروع کر دی ایک آدمی مر گیا۔ جب کشیدگی بڑھ گئی تو ۷ جولائی کو ہونے والی ایسی تقریب اس نے ملتوی کر دی لیکن ۱۹ رجولائی کو اپنے باپ کی یاد میں تقریب منعقد کرنے کا پروگرام بحال رکھا اسی روز اس کے والد کو قتل

کیا گیا تھا فوج نے ایسی تقریبات پر کنٹرول پانا چاہا اسے بلایا کہ حکومت کے سربراہ سے بات چیت کرے اور تقریب کا انتظام مشترکہ طور پر کیا جائے۔ سو نے انکار کر دیا کہ وہ اپنے والد کی یاد میں تقریب اپنے طور پر کرے گی۔ ان واقعات کی وجہ سے کشیدگی بڑھ گئی اس نے اس خیال سے کہ اس کے ساتھ بہت سے طالب علم ہوں گے اور خونریزی نہ شروع ہو جائے تقریب کے لئے موقع پر جانا بھی منسوخ کر دیا۔ اگلے روز فوج نے کام دکھایا۔ اسے گھر میں نظر بند کر دیا۔ اپنے حامیوں اور دنیا جہاں سے اس کے سارے رابطے منقطع کر دیئے۔ اور انہوں نے این ایل ڈی کے چیئرمین ٹن یو کی بھی گرفتار کر لیا۔

اس نے دسمبر ۱۹۸۹ء میں آئندہ الیکشن کے لئے بطور امیدوار اپنے کاغذات نامزدگی جمع کرانے کی اجازت دے دی۔ الیکشن کمیشن نے پہلے مرحلے پر اس کے کاغذات قبول کر لئے مگر اس کے ایک مخالف امیدوار نے جس کا تعلق نیشنل یونیٹی پارٹی (فوج ہی کی پارٹی بی ایس ایس پی کا نیا نام) سے تھا کاغذات کی منظوری پر اعتراض کر دیا۔ اعتراض یہ تھا کہ اس کا رابطہ ایسے مخالف گروپوں سے ہے جو فورسز سے لڑ رہے ہیں۔ یہ اعتراض قبول کر لیا گیا۔ اس کے خلاف الیکشن کمیشن کو براہ راست اپیل کی گئی کہ اس کے کاغذات درست قرار دیئے جائیں مگر ۷ افروری کو سرکاری طور پر اس سیٹ سے جن امیدواروں کے ناموں کا اعلان کیا گیا ان میں سو کا نام نہیں تھا۔ جس سے ظاہر ہوا کہ اس کی اپیل مسترد کر دی گئی تھی۔

جن لوگوں نے برما میں ہونے والے بعد کے واقعات پر نظر رکھی ہے کہا ہے کہ اگر آنگ سان سوچی کو الیکشن لڑنے کی اجازت دے دی جاتی وہ یہ بازی جیت بھی جاتی۔ مگر اسے الیکشن نہیں لڑنے دیا گیا اور اس کے بڑے بڑے حامی یا تو جیل میں ڈال دیئے گئے تھے یا گرفتاری سے بچنے کے لئے چھپ گئے پھر پارٹی میں آنگ سان سوچی اور بریگیڈیئر ٹن یو کے علاوہ اور کوئی مشہور نام بھی نہیں تھا چنانچہ پارٹی کو ان کے بغیر صرف مقامی شاخوں اور فوج کی طرف سے دھمکیوں اور ہراساں کرنے کی کارروائیوں کا بہادری سے مقابلہ کرنے والے عام لوگوں پر انحصار کرنا پڑا۔

فوج نے عام لوگوں کو جتنا بھی ہراساں کیا اس کے باوجود فوجی راج میں الیکشن کے نتائج نے سبھی کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ ۲۳۴ پارٹیوں کا اندراج ہوا تھا ان میں صرف

۹۳ نے اپنے امیدوار کھڑے گئے ووٹ ڈالنے سے بہت پہلے ہی پتہ چل گیا تھا کہ لوگوں کی بھاری اکثریت این ایل ڈی کے ساتھ ہے چنانچہ اس نے ۴۸۵ حلقوں کے انتخاب میں ۳۹۲ نشستیں جیت لیں اس کے علاوہ دوسری پارٹیو ں نے ۲۶ نشستیں جیتیں۔ نیشنل یونٹی پارٹی (سرکاری پارٹی) کو صرف دس نشستیں ملیں۔ ایک معروف ایشیائی رسالے نے لکھا کہ یہ انتخاب پارٹیوں کے درمیان نہیں تھا یہ تو ایک ریفرنڈم تھا جس میں این ایل ڈی عوام کے ملی مطالبات کی حمایت کر رہی تھی اور این یو پی (سرکاری) موجود نظام کی حمایت کر رہی تھی۔ ہر چند آنگ سان سوچی خود امیدوار نہ تھی مگر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ لوگوں نے فوج اس کے حامیوں اور ساتھیوں کے خلاف اور آنگ سان سوچی کے حق میں ووٹ ڈالا تھا۔

این ایل ڈی کی فتح برما میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکی۔ شروع سے ہی فوج نے یہ بات واضح نہیں کی تھی کہ آیا فوج الیکشن کے فوراً بعد اقتدار منتقل کر دے گی یا مستقبل میں کسی نامعلوم تاریخ کو یہ کام ہو گا۔ لیکن سرکاری ترجمان دونوں طرح کی باتیں کرتے رہے عموماً وہ یہ کہتے رہے کہ الیکشن کے بعد ایک نئی اسمبلی وجود میں آئے گی جو نیا آئین بنائے گی جب نیا آئین بن جائے گا اور لوگ اسے منظور کر لیں گے تو پھر اس آئین کے تحت نیا الیکشن ہو گا اور نئے آئین کے تحت عہدے پر کئے جائیں گے۔ اور پھر وہ اس موضوع پر اور بھی طرح طرح کی خیال آرائی کرتے رہے کہ نئے آئین کے تحت ایک مضبوط حکومت بنی چاہئے۔ اسے ملک کے اتحاد کا ضامن ہونا چاہئے اور ملک میں موجود ۱۳۵ اقلیتوں کی اسے تائید حاصل ہونی چاہئے صرف اس صورت میں انتقال اقتدار ہو گا۔ وریں اثنا فوج اپنے فرمانوں کے ذریعے حکومت چلا رہی ہے اور جمہوریت کو ابھی انتظار کرنا پڑے گا۔

منتخب اسمبلی کے ارکان انتظار کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ آنگ سان سوچی کو خاموش کر دیا گیا ہے وہ گھر پر نظر بند ہے، پارٹی کے قائم مقام یوکئی مونگ اور دوسرے گرفتار کئے گئے۔ ان پر مقدمے چلے اور انہیں سزائیں سنا دی گئیں فوج نے بڑے طریقے سے عوام میں مقبول اپنی حریف کو تباہ کرنے کی پوری کوشش کی۔ دوسری پارٹیوں اور این ایل ڈی والوں کو حکومت مسلسل ہراساں کرنے کی پالیسی پر گامزن رہی۔ چنانچہ اسمبلی کے جو منتخب رکن جیل سے باہر رہ گئے تھے انہوں نے نومبر میں مانڈلے میں ایک خفیہ اجتماع کیا فیصلہ

اگر وہ اپنے والد کے نقش قدم پر چلتی ہے اور سامنے فوجی حکومت کا یہ فرمان آجاتا ہے کہ نئی منتخب اسمبلی کا صرف ایک کام ہے، کہ وہ آئین تیار کرے، تو وہ برسر اقتدار فوجیوں کو اسی وقت چیلنج کرے گی اور مطالبہ کرے گی کہ جو لوگ منتخب ہوئے ہیں۔ وہ قومی اسمبلی کے رکن ہیں اس حیثیت میں وہی حکومت کرنے کے مجاز ہیں۔ وہ جانتی ہے کہ ۱۹۷۴ء کے آئین کے تحت جواب بھی روبہ عمل ہے قومی اسمبلی سب سے بڑا ادارہ ہے اور صرف اس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ اپنے ارکان میں سے ایک لیڈر منتخب کرے اور قانون بنائے۔ وہ ۴۷ - ۱۹۴۶ء میں اپنے والد کے کردار کی تقلید کرتی جب وہ برطانوی راج میں ایگزیکٹو کونسل کا سربراہ بھی تھا اور پھر دستور ساز اسمبلی کے ذریعے ملک کا آئین بھی تیار کر رہا تھا۔ غالباً وہ موجودہ فوجی حکمرانوں سے یہی دو پہلو والی ذمہ داری حاصل کرنے کا مطالبہ کرتی۔

اگر برما میں اپنے طور پر منتخب لیڈروں اور گروپوں کو اپنی مرضی سے قانون اپنے ہاتھ میں لینا ہے تو پھر اسی مسئلہ پر حکمران فوجیوں سے پہلے ہی ٹکراؤ ہو جائے تو وہ بہتر ہے۔ آنگ سان سوچی کا سیاسی کیریر مختصر ہے مگر اسے ملحوظ رکھتے ہوئے فوجیوں سے اس قسم کا ٹکراؤ وہی کر سکتی ہے۔ اب فرض کرلیں کہ وہ قانون ساز اسمبلی اور دستور ساز اسمبلی کی لیڈر بن گئی ہے تو وہ کیا کرے گی، وہ کیا کرنا چاہتی ہے اس بارے میں تو سوائے اس کی گرفتاری سے پہلے کی تقریروں میں ظاہر کئے گئے خیالات کے علاوہ اور کچھ بھی معلوم نہیں؟

اگر آنگ سان سوچی کو الیکشن لڑنے دیا جاتا اور وہ جیت جاتی تب پتہ چلتا کہ وہ کس قسم کی لیڈر ہے اس کی ذہانت، ایک زور دار مہم باز بہت اچھی مقررہ ہونے کے ناطے اس بات میں کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ وہ ایک منتخب اسمبلی کی لیڈر کی حیثیت سے وہ ذمہ دار قیادت کے تمام چیلنج قبول کرنے کے لئے تیار ہوتی۔ اسے عوام میں جو حمایت اور مقبولیت حاصل ہے وہ ایک ایسا اثاثہ ہے جسے وہ بعض ناخوشگوار مگر لازمی کام کرتے وقت استعمال میں لاسکتی ہے۔

ابھی تک یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ وہ بڑی منضبط سوچ کی مالک ہے بڑے غور و خوض کے بعد اس نے مقاصد کا تعین کر رکھا ہے اور ان کے حصول کے لئے منصوبے بنا رکھے ہیں۔ گرفتاری سے پہلے اس کے پاس ان باتوں کے لئے وقت نہیں تھا اور پھر اس نے

اپنی شناخت بھی اس طرح کروائی کہ وہ ایک جمہوری سیاسی نظام قائم کرنا چاہتی ہے جو کچھ لوگوں کو معلوم ہے وہ یہ ہے کہ اس نے زیادہ تر اظہار خیال سیاسی عمل پر کیا ہے جو کسی بھی قابل عمل جمہوری طریق کو چلانے کے لئے ضروری ہے۔ اس طرح یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ سماجی اور سیاسی حقوق کے تحفظ کی علمبردار ہے یہ دونوں حقوق ایک جمہوری نظام کی دین ہوتے ہیں جو لوگوں کی مرضی کے مطابق قائم ہو۔ مگر وہ کس قسم کے نظام کی حمایت کرے گی؟ اس کے دوروں کی تقریروں سے ایک بات واضح ہے کہ جو نظام اس کے والد نے بنایا تھا وہ اس کے احیا کی حامی نہیں ہے۔

اس کے نظریات کا کچھ کھوج اس منشور سے لگ سکتا ہے جو نیشنل لیگ فار ڈیمو کریسی نے نومبر ۱۹۸۹ء کو اپنایا تھا۔ یہ بات واضح نہیں کہ اس منشور میں اس نے کتنا حصہ ڈالا تھا تاہم یہ بات واضح ہے کہ جب اسے قوم کی سربراہی کرنا ہے تو پھر اس نے مستقبل کے بارے میں بھی کوئی نظریہ قائم کیا ہو گا۔ منشور کا اعلان کر دیا گیا تھا اسے منسوخ یا ترک بھی نہیں کیا گیا اس لئے بجاطور پر یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ اس قسم کی کوئی دستاویز یا اعلان اس کے علم اور مرضی کے بغیر نشر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ بھی مان لینا چاہئے کہ یہ دراصل ایک جمہوری تحریک یا انتخاب کی مہم کے لئے جاری کیا گیا بیان ہے، ضروری نہیں کہ یہ مکمل اور جامع دستاویز ہو جو اس کے لکھنے والے یا لکھنے والوں نے برما کے مستقبل کے لئے تیار کی ہو۔

منشور میں بہت سے معاملات کا احاطہ کیا گیا ہے اور بظاہر تقریباً سبھی باتیں اس میں آگئی ہیں۔ اس میں تضادات بھی ہیں اور مبہم اور غیر واضح باتیں بھی۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یا تو مختلف نقطہائے نظر کو اس میں سمونے کی کوششیں کی گئی ہے یا جلدی میں تیار کیا گیا، زیادہ غور و خوض نہیں کیا گیا۔ اس کا آغاز یو این کے انسانی حقوق کے منشور سے اور جمہوریت کے حق میں زوردار تحریر سے ہوتا ہے۔ اس کے مطابق "پارلیمینٹ کو آزاد۔ خود مختار ریاست کی بلا استثناء ساری طاقت اور اختیار استعمال کرنے کا حق حاصل ہے۔" مگر پھر ایک دوسرے بیان سے تضاد پیدا کر دیا جاتا ہے وہ یہ کہ حکومت کی تین پرانی شاخیں ایک دوسرے میں مخل ہونے کی بجائے بالکل الگ الگ اپنا کام کریں۔ سوال یہ ہے کہ اگر پارلیمینٹ سب سے بالاتر ہے تو کیا انتظامیہ اس کے سامنے جواب دہ ہے اور اگر ایسا نہیں تو

شروع ہی سے برابر کی حصہ دار تھیں۔ آزادی سے پہلے کی حکومت میں بھی حصہ دار، آئین کی تیاری اور برما کے مستقبل کے طے کرنے میں شریک کی گئی تھیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے برما کا اہم ترین مسئلہ ہے قومی اتحاد کا، اور اب تک یہ مسئلہ اتنا ہی ناقابل حل ہے جتنا آنگ سان کی موت کے وقت تھا۔

کیا آنگ سان سوچی برما کے مستقبل کی حکمران ہے۔ اس وقت تو یہی لگے گا کہ وہ برما کے مستقبل کی حکمران ہے۔ اس کے ساتھ کا کوئی لیڈر ایسا نہیں جسے برما کے عوام نے اتنا بڑا مرتبہ، اتنی محبت اور اس قدر احترام دیا ہو اور پھر بیرونی دنیا سے بھی حکومتوں نے اس کے حق میں اتنی اپیلیں کی ہوں۔ وہ اپنے باپ پر گئی ہے۔ ذہین، دیانتدار، سخت اور بے خوف۔ مزید یہ کہ یونو کی ناکام جمہوری حکومت ہو یا نی ون کی بدعنوان، نااہل اور ظالمانہ آمریت یا اس کے فوجی جانشین ہوں، سو کا ان سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ ۱۹۶۰ء کے بعد پہلی بار آزادانہ الیکشن ہو رہے تھے، فوجی حکومت نے سو کو اس میں حصہ لینے کی اجازت نہ دے کر غیر شعوری طور پر عوام میں اس کا مقام مزید بلند کرنے میں مدد دی ہے۔ تختہ الٹ کے آنے والی حکومت نے اب اس کو ایک سال کی نظر بندی کے بعد رہا نہ کر کے یا ملک سے باہر نہ نکال کر، یا گھر پر نظر بندی کے علاوہ کوئی اور کارروائی نہ کر کے ہی ثبوت فراہم کیا ہے کہ حکومت آمرانہ طریق سے مسلط ہے۔ سو کو برما میں انسانی حقوق اور جمہوریت کی بحالی کے لئے کام کرنے پر تین عالمی انعامات مل چکے ہیں، دنیا کے لیڈر اس کی آزادی کی اپیلیں کر چکے ہیں جن کے جواب میں فوجی حکمرانوں نے ۱۹۹۱ء کے موسم بہار میں یہ کہا کہ وہ رضاکارانہ طور پر جب چاہے جلاوطن ہو سکتی ہے تاہم اس پر غداری کا مقدمہ چل سکتا ہے جس کی اسے عمر قید یا سزائے موت بھی ہو سکتی ہے۔ مگر اس کارسخاوت سے کوئی بھی بے وقوف نہیں بنا کیونکہ فوجی حکومت تو پہلے ہی اس کی نظر بندی کی مدت تین سال تک بڑھا چکی ہے۔

ایک بدعنوان اور سنگدل فوجی حکومت کے مقابلے میں اس نے جس حوصلے اور ہمت کا مظاہرہ کیا ہے وہ برما کے عوام کے دلوں کو گرماتا رہے گا۔ لوگ اس کی ذاتی قربانیاں بھی جانتے ہیں اور وہ ان کے لئے ایک قابل تقلید مثال بھی بنتی ہے اس طرح خود ان عوام سے اس کا رشتہ مضبوط تر ہوتا ہے جنہوں نے بھاری اکثریت کے ساتھ اس کی پارٹی کو مستقبل میں برما کی جمہوری حکومت قائم کرنے اور اس میں ان کی نمائندگی کرنے کا حق دیا

آنگ سان سوچی

اور

برما میں انسانی حقوق کی جدوجہد

فلپ کریگر

برما یوں تھا جیسے اللہ میاں کے پچھواڑے میں ہو مگر انتہائی تیزی سے حرکت کرتا پوری دنیا کے سامنے آکھڑا ہوا۔ برما کے لوگوں کا انسانی حقوق کے حصول پر اصرار اسے بہت نمایاں کرنے لگا۔ عوام کے خود رو اور بے ساختہ مظاہروں کا آغاز اگست ۱۹۸۸ء میں ہوا۔ پہلے مرحلے میں فطری طور پر یہ سمجھا گیا کہ یہ احتجاج ربع صدی کے سرکاری جبر واستبداد اور ناحق فوجی تشدد کا ردعمل ہے۔ پھر یہ مظاہرے ایک ہمہ گیر اور ہردلعزیز تحریک کا حصہ بن گئے، سینکڑوں ہزاروں لوگ اکٹھے ہوتے اور احتجاجی جلوس نکال لیتے. عام لوگ ان کی علی الاعلان حمایت کرتے ان کے ساتھ چلتے۔ پھر شمال میں واقع بہت بڑے ہمسائے میں بھی یہی ہوا پہنچی اور وہاں ایک برس بعد ہی اتنے زور کے مظاہرے ہوئے کہ برما پس منظر میں چلا گیا۔ دونوں ملکوں برما اور چین میں ان مظاہروں کے خلاف ایک سا ردعمل ہوا دونوں ملکوں میں مخالفت کو دبانے کے لئے انتہائی بھیمانہ سختی کی گئی۔

بنیادی طور پر ایک پہلو سے برما کی تحریک چین کی تحریک سے مختلف اور غیر معمولی ہے۔ طویل عرصے سے بدنظمی میں یک دم ابھرنے والی تحریک پر پرتشدد فوجی جبر سے بدنظمی مزید پھیلی مگر اس صورت حال میں برما کو ایک ایسی لیڈر مل گئی جو تحریک کے لئے عدم تشدد

کے طریقوں کی پرچارک ہے اور جسے لوگوں کی وسیع حمایت اور چاہت حاصل ہے۔ آنگ سان سوچی، اس کی پوزیشن بیک وقت انتہائی مضبوط اور انتہائی کمزور ہے۔ جسمانی طور پر وہ ایسی فوجی حکومت کے رحم و کرم پر ہے جو محض طاقت کے بل بوتے پر قائم ہے لیکن اسی حکومت کو ابھی تک اس پر تشدد کرنے کی جرات نہیں ہوئی۔

انسانی حقوق کے لئے برما والوں کی جدوجہد میں وہ مرکزی راہ نما کی حیثیت سے ابھری ہے اور اس نے اس ضمن میں جو نادر کردار ادا کیا ہے وہ ایسے تین عوامل کا نتیجہ ہے جنہوں نے اس کی ذات کو برما کی جدید تاریخ کا ایک لازمی حصہ بنا دیا ہے۔ دو عوامل تو بہت جانے پہچانے ہیں مگر تیسرے سبب نے پہلے دو اسباب کو ہی نمایاں کیا ہے۔

پہلا یہ کہ وہ جدید برما کی آزادی کے مسلمہ معمار آنگ سان کی بیٹی ہے۔ متعدد اور مستند ذرائع کے مطابق اس کا وجود قوم میں اتحاد لایا اس کا کردار بے داغ تھا اور اس کے دل و دماغ میں ایک آزاد اور جمہوری برما کا تصور رچا بسا تھا۔ عین آزادی کے موقع پر عبوری حکومت کے سربراہ کا اپنی کابینہ کے ساتھ قتل ہونا ملک کو بہت کمزور کرنے کے مترادف ثابت ہوا۔ اور یہ تعجب کی بات نہیں کہ وہ برما کی آزادی کا شہید اعظم اور قوم کے لئے ایک بڑی علامت بن گیا۔ آنگ سان سوچی کو یہ سب کچھ ورثے میں ملا اور اسی سبب وہ عوام کے حقوق اور آرزوؤں کا بھرپور نشان بن کر ابھری۔

دوسرے باپ بیٹی کی یہ مطابقت بجا لیکن اس کے ایک خوفناک پہلو بھی ہے اور وہ ہے تاریخ کا اپنے آپ کو دہرانے کا خدشہ۔ آنگ سان کے قتل کے بعد اس کے ساتھیوں نے حکومت بنائے رکھی اس منتخب حکومت کو اٹھائیس برس پہلے فوجی آمریت نے ختم کر دیا۔ اس حکومت نے کوئی انتخاب نہیں کیا۔ یک جماعتی نظام رائج کیا اور فوج نے ۱۹۶۲ء، ۱۹۷۴ء اور ۱۹۷۶ء بندوق کے زور پر عوام کی احتجاجی پڑتالوں اور مظاہروں اور حکومت کے خلاف جذبات کے اظہار کے دوسرے طریقوں کو دبا دیا۔ جب ۱۹۸۸ء کے عوامی مظاہروں کا آغاز ہوا تو حکومت نے لوگوں کو پھر دبانے کی پالیسی اختیار کی اور اطلاع کی آزادی کو اس حد تک ختم کر دیا کہ یہ تک معلوم کرنا مشکل ہو گیا کہ ان مظاہروں میں کتنے لوگ مارے گئے ہیں اور کتنے قید۔ اگست ۱۹۸۸ء اور جولائی ۱۹۸۹ء کے درمیانی بارہ ماہ کے عرصہ میں کم از کم تین بار فوجیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ مظاہرین کو بالارادہ مارنے کے لئے ان پر

ساتھ ایک سطح پر رکھا ہے، لوگوں کی امیدوں کو کم نہیں ہونے دیا اور ان دو چیزوں کو حکومت اپنے منظم ظالمانہ اقدامات کے باوجود کم نہیں کر سکی۔

آنگ سان سوچی ماضی میں کسی بھی حکومت کی کسی مخالفت تنظیم سے وابستہ نہیں رہی وہ جب کبھی برما میں آئی بھی تو ذاتی کاموں کے لئے اور اس نے کوئی سیاسی تعلق بھی قائم نہیں کیا مگر موجودہ صورت حال میں، وہ ایک دم نمایاں ہونے لگی اور اس نے اپنا آپ دکھانا شروع کیا۔ پہلے اس نے حکومت کو کھلا خط لکھا پھر عام جلسوں اور مظاہروں سے خطاب کرنے لگی، نیشنل لیگ فار ڈیموکریسی بنائی اس کی لیڈر بنی پھر ملک کا دورہ کیا، اگرچہ بعض اوقات اس کے جلسے بندوقوں کے سائے میں ہوئے مگر اس نے بڑے تسلسل سے اپنی تقریروں کو چند بنیادی موضوعات تک محدود رکھا۔ اس طور وہ انسانی حقوق کے حوالے سے اس مقبول تحریک کا اخلاقی اور روحانی مرکز بن گئی۔ ان موضوعات کا مختصراً تذکرہ:

۱۔ اولیت صرف انسانی حقوق کی بحالی کو دی جائے، وہ حقوق ہیں تقریر، اجتماع، تنظیم، خبر اور معلومات کی آزادی منصفانہ انتخابات اور خوف سے آزادی ——— برما میں لوگ ان سارے حقوق سے محروم ہیں جبکہ صرف انہی کی بنا پر قومی اتحاد رہ سکتا ہے اور سماجی ترقی ہو سکتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ سیاسی اور معاشی اصلاحات صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہیں جب یہ حقوق برمی معاشرے کا حصہ بن جائیں۔

۲۔ انسانی حقوق کے حصول کا واحد جائز اور موثر ذریعہ ہے عدم تشدد

۳۔ ریاستوں اور حکومتوں کو چلانے کے لئے شخصیات، دھڑوں اور عارضی طریق کار سے بالاتر کچھ اصول ہوتے ہیں۔ سو جہاں تک برما کا تعلق ہے مطلب یہ ہوا کہ فوج بذات خود انسانی حقوق کی دشمن نہیں ہے۔ فوج بنیادی طور پر ایک دوست ہے اور حکومت میں اس کا ایک جائز کردار ہے (مثلاً سرحدوں کی سلامتی)۔ برما میں انسانی حقوق کا مسئلہ اس وقت پیدا ہوا جب جنرل نی ون کی سربراہی میں فوج نے حکومت غصب کر لی فوج کو اپنی ہدایت کے مطابق اپنے باعزت مقام پر لوٹ آنا چاہئے۔

کاچن وغیرہ میں علیحدگی کی جو تحریکیں موجود ہیں ان کے حوالے سے فوج اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھنے پر تلی ہوئی ہے۔ بہت سے نوجوان برمی بھی حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر ان گروپوں سے جا ملے ہیں ان میں سے کچھ کو اسلحہ کے استعمال کی تربیت دی جائے گی کمبوڈیا میں تو سول نافرمانی نے ملک کو تقسیم سا کر کے رکھ دیا ہے اب برما میں باہمی لڑائی کا بھی بھاری خدشہ ہے۔ تین بنیادوں پر برما میں انسانی حقوق کے حصول کی سیاسی جدوجہد میں آنگ سان سوچی کو بے مثال مقام حاصل ہوا ہے چنانچہ فطری بات ہے کہ دنیا کی توجہ اس پر مرکوز ہو گئی ہے۔ ۱۹۹۰ء میں اسے ناروے میں تھورولف رافٹو میموریل انعام برائے انسانی حقوق دیا گیا تھا۔ یورپی پارلیمینٹ نے سخاروف انعام برائے آزادی فکر دیا۔ یہاں مختصراً یہ بتانا مقصود ہے کہ آنگ سان سوچی کو برما میں انسانی حقوق کے حصول کی جدوجہد میں فکر و عمل کی کن کن منزلوں سے گذرنا پڑا اور اس ضمن میں کون کون سے عناصر یا واقعات اس کی فکری اور عملی تشکیل میں ممد ثابت ہوئے۔ برما کی حالیہ تاریخ کے روز بروز واقعات کے حوالے سے آنگ سان سوچی کا کردار کیسے بنا اس کا ذکر زیادہ تر اسی کے الفاظ میں مندرجہ ذیل دو سیکشنوں میں کیا گیا ہے۔

______ اس کے بعد بین الاقوامی سطح پر اس کے بارے میں جو کچھ کیا یا کہا گیا ہے اس کا مختصر ذکر ہے۔

آنگ سان سوچی ______ عدم تشدد اور جمہوریت

برما کی موجودہ صورت حال کو سمجھنے کے لئے خود آنگ سان سوچی کی اپنی زندگی اور عدم تشدد کے نظریئے پر اس کے اپنے عمل کا مطالعہ ضروری ہے۔ وہ زور دے کر کہتی ہے کہ تشدد اور عدم تشدد انسانی عمل کے دو بالکل ہی متضاد اور مختلف پہلو ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ برما کی تاریخ میں ان دو مختلف پہلوؤں کے تال میل کے باعث خود اسے بھی ذاتی طور پر افسوس ناک تجربہ ہوا۔ شائد اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس نے اپنے والد کی مختصر زندگی میں برمیوں کے مطالعہ کے بعد جو نظریات، مسائل اور مجبوریاں دیکھیں ان کا عکس بھی اس کے متذکرہ بالا نظریہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ آنگ سان سوچی اپنے باپ سے بہت متاثر ہے اس کے باپ نے بھی مسلسل عسکری حالات و واقعات دیکھے، پھر اس نے پیشگی

اندازہ کر لیا کہ دھڑے بندی بھی ہو گی اور اسی دھڑے بندی کے ہاتھوں اس کی جان گئی۔ باپ کے انہی حالات کے سبب وہ جلد ہی اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ اخلاقی، سماجی اور سیاسی اصولوں کی پاسداری کرنی چاہئے، اس نے باپ کی زندگی سے جو سبق سیکھا وہ بھی انہی اصولوں کا حصہ ہے اور انہی اصولوں پر چلنے سے برما میں جمہوریت کا وہ ڈھانچہ کھڑا اور مضبوط کیا جا سکتا ہے جو اس کے باپ کے قتل کے بعد بہت ہی کمزور اور ناکارہ گیا تھا۔

آنگ سان کو برما کے لوگ صرف بابائے قوم کے طور پر نہیں جانتے وہ اسے فوج کے بانی کی حیثیت سے بھی پہچانتے ہیں وہ بوگیوک کے خطاب سے بھی مقبول اور معروف تھے۔ اس نے برما کے لئے جو کچھ کیا اور اقتدار کے بارے میں جو بے لوث رویہ رکھا ان دو صفات کا اعتراف اس لقب کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ اس نے فوج صرف اس بنیاد پر تشکیل دی تھی کہ وہ برطانیہ اور جاپان کے سامراجی قبضہ کے خلاف برمی قوم کی آزادی کی علمبردار ہو گی۔ اس فوج کی موجودگی آزادی کے لئے برطانیہ سے ہونے والے مذاکرات کی اتنی جلدی کامیابی کا ایک سبب تھی۔ جب تک وہ رہا اس نے فوج کو برما کی دوسری اقلیتوں کے خلاف استعمال کئے جانے والا ہتھیار نہیں سمجھا۔ آنگ سان فوج میں موجود دھڑوں کو اپنے اپنے مقام پر رکھنے کی اہلیت رکھتا تھا، اسی بنا پر اس نے کیرن کی ایک بٹالین کو کھپا لیا۔ یہی وجہ تھی کہ آزادی کے ابتدائی سالوں میں ایک کرن جنرل ہی برما کی فوجوں کا کمانڈر انچیف بنا۔ اس مرحلے پر بھی اونگ سان نے سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کی تقسیم در تقسیم کرنے کی سرگرمیوں کو روکنے لئے فوج استعمال نہیں کی بلکہ مذاکرات کے ذریعے انہیں انتخابات میں حصہ لینے پر راضی کر لیا۔

ایک نومولود جمہوریہ میں طاقتور فوج کی موجودگی کے خطرے کو تو خود اس نے بھی محسوس کر لیا تھا اور اس نے اس بارے میں متنبہ بھی کیا اور کہا "جو فوج سیاست میں ملوث ہو جاتی ہے وہ عزت بھی کھو دیتی ہے اور عوام اس سے نفرت بھی کرنے لگتے ہیں۔" جہاں تک اس کی اپنی ذات کا تعلق ہے جب اس نے آزادی کے لئے مذاکرات شروع کئے تو اپنا فوجی عہدہ پہلے چھوڑ دیا مگر اس کے قتل سے اس کی وہ پیش گوئی سچ ثابت ہوئی جو اس نے برما کو پیش آنے والے مسائل کے بارے میں کی تھی۔ اسے ایک حریف سیاستدان کے وفادار چند فوجیوں نے بغیر کسی وجہ کے قتل کر دیا تھا۔

جب اس کا والد قتل ہوا ہے آنگ سان سوچی دو برس کی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد پونو کی منتخب جمہوری حکومت کے ابتدائی زمانے میں فوج مجموعی طور پر آنگ سان کے حکم کی پابند رہی کہ خود کو سیاست میں ملوث نہیں کرنا۔ آنگ سان سوچی نے بھی اس مرحلے پر فوج کے مثبت کردار کو تسلیم کیا ہے اور واضح طور پر فوج کے بارے میں اپنے باپ کے نظریئے سے اتفاق کیا ہے۔ "جب میں بچی تھی تو مجھے میرے والد کے سپاہی کھیلایا کرتے تھے، میرا فوج سے ایک رشتہ بھی ہے، میری تربیت میں یہ بات شامل کی گئی کہ فوجی دوست ہیں" ـــــــ تاہم جب چھٹی دہائی کے وسط میں فوجی قیادت نی ون کے ہاتھ میں آئی تو فوج میں خاص قسم کی تبدیلی شروع کی گئی جب فوج نے ۱۹۶۲ء میں اقتدار پر قبضہ کیا اس وقت آنگ سان سوچی اپنی ماں کے پاس تھی یہ ہندوستان میں برما کی سفیر تھی۔

جب کامیاب فوجی بغاوت ہوئی اس وقت آنگ سان سوچی سترہ برس کی تھی۔ جن دنوں وہ ہندوستان میں پڑھ رہی تھی اور جب بعد میں دو سال دہلی یونیورسٹی میں پولیٹیکل سائنس پڑھنے آئی تھی یہ اس کی عمر کا وہ حصہ تھا جب اسے خود برما کے واقعات سے باخبر ہونے کی ضرورت تھی اسی زمانے میں وہ مہاتما گاندھی کے عدم تشدد کے فلسفہ اور اصولوں کی قائل ہوئی گاندھی کی زندگی اسی سے عبارت تھی۔ برما میں اس نے سول نافرمانی کی جو تحریک چلائی اس کی جڑیں ہندوستانی مثال میں تھیں۔ اس نے اپنے لئے گاندھی اور مارٹن لوتھر کنگ دونوں کو مثال قرار دیا۔

اس نے آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم جاری رکھی تین بڑے علوم (سیاست، فلسفہ اور معاشیات) پڑھے کیونکہ بقول اس کے ایک ترقی پذیر ملک کے لئے معاشیات کا علم انتہائی مفید ہے وہ کچھ عرصہ نیویارک میں اقوام متحدہ کے سیکرٹریٹ میں ملازمت کرتی رہی اس کے بعد تبتا لوجسٹ (تبت کے امور کے ماہر) انگریز مائیکل آمرس سے شادی کر لی۔ دو بیٹے پیدا ہوئے ایک ۱۹۷۳ء میں دوسرا ۱۹۷۷ء میں، لندن میں قیام کے دوران اس نے گھرداری اور بچوں کی نشوونما پر توجہ دی، باقاعدگی سے برما بھی جاتی رہی اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں برما کے امور پر تحقیق بھی کرتی رہی اور پڑھاتی بھی رہی۔ یہ اس کی زندگی کا نسبتاً پرامن اور پرمسرت زمانہ تھا جس میں اسے لکھنے کا بھی موقع ملتا رہا پھر اسے پہلے جاپان کیوٹو یونیورسٹی میں وزیٹنگ سکالرشپ ملا پھر ہندوستان کے انڈین انسٹی چیوٹ آف

ایڈوانسڈ سٹڈی شملہ میں فیلوشپ مل گئی۔

اس کے دو بڑے مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی دلچسپی کیا تھی، ایک مضمون باپ کی سوانح عمری ہے اور دوسرے میں آزادی سے پہلے برمی فکر و نظر کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ اس نے بی بی سی سے نشر کئے گئے ایک انٹرویو میں کہا تھا۔ " میں کبھی بھی اپنے ملک اور قوم سے دور نہیں رہی۔

> " مجھے بچپن ہی سے آزادی کی تاریخ اور برما کے سماجی اور سیاسی واقعات میں بڑی دلچسپی رہی ہے۔ جب میرے والد کا انتقال ہوا اس وقت میں دو برس کی تھی، جب میں بڑی ہوئی اور ان کی زندگی کے بارے میں مواد اکٹھا کرنا شروع کیا تب اندازہ ہونے لگا کہ انہوں نے بتیس برس کی عمر میں کیا کچھ حاصل کیا تھا۔ مجھے وہ ایک بڑے محب وطن اور مدبر کی حیثیت سے بہت اچھے لگے اسی ناطے سے میں سمجھتی ہوں کہ برما کی بہبود اور بہتری کے سلسلے میں کچھ ذمہ داریاں مجھ پر بھی عائد ہوتی ہیں۔ "

اگرچہ برما واپس آنے اور پھر حالیہ واقعات میں ملوث ہونے کے باعث آنگ سان سوچی کی تحریریں ادھوری بھی رہ گئیں۔ مگر ہماری توجہ کی مستحق ہیں۔ مثلاً اونگ سان کی سوانح عمری یک طرفہ اور جانبدارانہ بیان نہیں۔ اس میں آنگ سان کے فکر و خیال کے ارتقا اور اس کی زندگی کے واقعات کو بڑی بیانیہ اور غیر جذباتی نثر میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کی خوبیوں اور کمزوریوں کا جائزہ جس بے لاگ انداز میں کیا گیا ہے اس سے ان آرا اور تحریروں کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے جو غیر ملکی اخبار نویسوں نے لکھیں یا مشاہدہ کیں اور جنہوں نے اسے بہت بڑی شخصیت قرار دیا ہے، ایسی ہی بڑی شخصیت جیسی آج کے برما کے عوام کے لئے آنگ سان سوچی بن گئی ہے۔ ایک معروف ایکٹر اونگ لون نے جو نیشنل لیگ فار ڈیموکریسی کا رکن بھی بن گیا تھا اور آج کل حکومت نے اسے قید کر رکھا ہے، آنگ سان سوچی کے۔ ۲۶ر اگست ۱۹۸۸ء کو پہلی بار عوام کے سامنے آنے کا ذکر یوں کیا ہے " ہم سب حیران تھے۔ نہ صرف اپنے باپ جیسی لگ رہی تھی وہ بول بھی اسی طرح رہی تھی، مختصر، مدلل اور موضوع سے متعلق "۔ اس کے موضوعات زیادہ تر وہی ہیں جو اس کے والد کے تھے اس کا جمہوریت کا تصور، اس کی جمہوریت سے ذاتی وابستگی پر مبنی ہے " قومی اتحاد

صرف ڈسپلن سے پیدا ہوتا ہے. مخالفوں سے اچھا سلوک روا رکھا جانا چاہئے خواہ عوام کی ان کی بارے میں کیسی ہی شکایات کیوں نہ ہوں. لیڈر کی بات یا نقطہ نظر پر کنسٹرکٹو تنقید ہونی چاہئے. فوجیوں کو سیاست سے دور صرف اپنے میدان تک تشدد روا ہے, سب سے پہلے بنیادی انسانی حقوق دیئے جائیں جس کا مطلب ہے کہ کثیرالجماعتی بنیادوں پر آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کرائے جائیں۔ آنگ سان کی طرح آنگ سان سوچی کو سیاسی سازشوں اور سیاسی اقتدار کے لئے ہیرا پھیریوں سے شدید نفرت ہے۔ وہ سیاست میں بھی آنگ سان ہی کی طرح شامل ہوئی کہ جب حکومت جمہوریت کے لئے کوئی راستہ کھلا نہ رہنے دے تب سیاست میں آیا جائے۔ ”میں اپنے باپ کی بیٹی کی حیثیت سے ملک میں جو ہو رہا تھا اس سے منہ نہیں موڑ سکتی۔“

اس نے برما اور ہندوستان میں غلامی کے دنوں میں فکر و نظر کے ارتقا کا تقابل کیا. اس میں صرف نصابی انداز میں ہی یہ بات نہیں کی گئی کہ دونوں ملکوں میں آزادی کی تحریکیں کیوں ایک دوسرے سے مختلف انداز میں آگے بڑھیں۔ یہ تعجب کی بات نہیں کہ اس کی تحقیق کا تعلق خود اپنے ہی فکری ارتقا سے پیوستہ ہے۔ اس نے برما کی جدید تاریخ کی مشکلات اور خرابیوں کو دیکھا اور برما کی تاریخ کے حوالے سے مہاتما گاندھی کے فلسفہ عدم تشدد پر نظر ڈالی تو ان دونوں میں ایک ایسا اشتراک نظر آیا جس سے برما کے مسائل حل کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ آنگ سان سوچی کی فکر کا سب سے منفرد پہلو یہ ہے کہ اس نے برما کے حالات میں گاندھی کے نمایاں فلسفہ عدم تشدد کی افادیت کو دیکھ لیا۔ یہ خوبی اس نے باپ سے حاصل نہیں کی. خود ڈھونڈی اور اپنے اندر اس کی نشوونما کی ہے۔

مضمون میں شروع کا نکتہ وہی ہے جو جنوبی ایشیا (اور دوسرے ملکوں میں بھی) کی قومی تحریکوں کی تاریخ میں جانا پہچانا ہے۔ دونوں ملکوں میں برطانیہ کے سیاسی اور فوجی غلبہ کے باوجود لوگوں میں یورپی کلچر کی خوبیوں کی توصیف ہونے لگی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برما اور ہندوستان دونوں میں اپنے پرانے ورثے, شناخت اور نظریئے کے تحفظ کے ساتھ یورپ کی فکری ترقی اور تجربے کے حسب حال پہلوؤں کو مقامی صورت میں ڈھالنے اور اختیار کرنے کی وکالت کی گئی آنگ سان سوچی نے خاص طور پر جن نکات پر زور دیا وہ ہیں (۱) برما میں دیسی بنیاد والی جمہوریت (۲) تعلیم کے بارے میں برمیوں کا رویہ ہے کہ تعلیم فرد یا قوم کی

حافظ ہی نہیں ہے، اس کا مقصد تھا کہ اعلیٰ ترین علم پر قدرت حاصل ہونا جس سے روشن خیالی پیدا ہوتی ہے۔ جن لوگوں کا تعلیم کے بارے میں ایسا نظریہ ہو وہ انگریزوں کی تعلیمی پالیسی کو کیسے آسانی سے قبول کر سکتے ہیں جس کا مدعا ہی یہ ہو کہ یہ تعلیم دراصل ملازمت حاصل کرنے کی عملی تربیت ہے۔ جو سامراج نے آکر پیدا کی ہے۔ برما کے اجتماعی مزاج میں اشرافیہ کے لئے ناپسندیدگی ہمیشہ سے نقش رہی ہے۔ برما میں وسیع پیمانے پر یہ بات تسلیم کی جاتی تھی کہ ایک قومی قسم کی تعلیم معاشرے میں جس قدر عام کی جا سکتی ہے کی جائے۔ رنگون یونیورسٹی ایکٹ مجریہ ۱۹۲۰ء کے بائیکاٹ کا پس منظر بھی یہی بری نظریہ تھا۔ اس کی مخالفت اس لئے کی گئی تھی کہ ایسے ادارے تو پھر صرف کھاتے پیتے اور مراعات یافتہ طبقے ہی کے لئے مختص ہو جائیں گے"______

آنگ سان سوچی بیان کرتی ہے کہ رنگون یونیورسٹی ایکٹ کے بائیکاٹ سے کس طور نیشنل سکول قائم کئے گئے جنہیں چلانے کے لئے لوگوں نے چندہ دیا۔ یہ ادارے حب الوطنی کے جذبے اور مغربی نصاب تعلیم کے سنگم تھے۔ اور برما کے قوم پرست لیڈروں کی پہلی کھیپ جس میں آنگ سان اور ساتھی بھی شامل تھے. اسی نظام کی پیداوار تھے۔

(iii) جو نوجوان نیشنل سکولوں سے چوتھی دہائی میں فارغ ہوئے انہوں نے قوم پرستی کے جذبے کی بنیاد وسیع کرنے اور اسے ایک فکری ڈھانچہ دینے کی کوشش کی۔ مگر نوجوانی میں گاندھی کی طرح وہ بعض اوقات ایسے غیر ملکی نظریہ کے زیر اثر آجاتے جو انہوں نے پوری طرح سمجھ نہیں رکھا ہوتا تھا۔ ان میں سے اکثریت وقت کے متضاد دھاروں کی زد میں آکر سوشلسٹ نظریات قبول کرتے گئے۔ سوشلزم کو قبول کرنا وہ ترقی پسندی جانتے تھے کہ اس نظریہ کے ذریعے سامراج اور سرمایہ داری دونوں کی مخالفت ہوتی تھی۔ لیکن برما کے معاشرے میں طبقاتی تضاد بہت کم ہے اس لئے برما میں اس کے پھولنے پھلنے کا امکان کم ہی تھا۔ نئی نسل کا بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ فکر و عمل میں کس طرح پکا رشتہ پیدا کیا جائے۔ آنگ سان سوچی نے ان لیڈروں میں

کاغذات بھی ضبط کر لئے گئے چنانچہ اس سے اندرونی یا بیرونی ذرائع سے رابطہ کرنا ممکن نہ رہا اس لئے واقعات کی یہ رپورٹ زیادہ تر چھپے ہوئے مواد خصوصاً اخباروں اور رسالوں سے حاصل کی گئی ہے۔ واردات مرتب کرنے کا مدعا صرف یہ ہے کہ حالات و واقعات کو ایک مربوط شکل میں پیش کر دیا جائے ورنہ اس زمانے کا ریکارڈ نامکمل اور بکھرا بکھرا ہی رہ جائے گا۔

۲۴ر ستمبر ۱۹۸۸ء آنگ سان سوچی نے دو سابق فوجیوں ٹن یو اور آنگ گئی کے ساتھ مل کر نیشنل لیگ فار ڈیموکریسی نامی جماعت بنائی، دونوں فوجیوں کا جنرل نی ون سے اختلاف ہو گیا تھا اور وہ کچھ عرصہ قید بھی رہ چکے تھے۔ پارٹی کی بنیادی دستاویز یا اعلان نامے میں آنگ سان سوچی کی ۲۶ر اگست کی تقریر میں شامل اصولوں کی تفصیل اور وضاحت بھی شامل ہے۔ این ڈی ایل مختصر مدت میں ملک میں حزب مخالف کی سب سے بڑی پارٹی بن گئی اور اس کے باقاعدہ ارکان کی تعداد دس اور تیس لاکھ کے درمیان پہنچ گئی۔

آنگ سان سوچی نے دنیا بھر سے اپیل کی کہ وہ برما کی فوجی حکومت کی طرف سے نہتے برمیوں، بچوں، بدھ بھکشوؤں اور طالب علموں پر ہونے والے تشدد کی مذمت کرے۔ یہ اپیل برما میں غیر ملکی سفیروں اور ایمنیسٹی انٹرنیشنل کے سیکرٹری جنرل کے نام تھی جس میں کہا گیا تھا کہ یہ سوال اقوام متحدہ جنرل اسمبلی کی ۲۷ر ستمبر کے اجلاس میں پورے زور شور سے اٹھایا جائے۔

۱۶ر اکتوبر ۱۹۸۸ء آنگ سان سوچی نے ایمنیسٹی انٹرنیشنل کی توجہ برما میں فوجی حکومت کی طرف سے نوجوانوں کی زبردستی بھرتی پر دلائی، طریقہ یہ تھا کہ حکومت زبردستی نوجوانوں کو اٹھا لیتی اور انہیں ان علاقوں میں بھجوا دیتی جہاں فوجیوں کو باغیوں سے مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ ان نوجونوں سے فوجی ساز و سامان کی نقل و حمل کا کام لیا جاتا ہے دوسرے جہاں جہاں باغیوں نے سرنگیں بچھائی ہیں ان سرنگوں کا پتہ لگانے کے لئے فوجی انہیں اپنے آگے آگے چلاتے ہیں۔

۲۸ر اکتوبر ۱۹۸۸ء برما کی دوسری بڑی پارٹی ڈیموکریٹک پارٹی فار اے نیو سوسائٹی کے لیڈروں نے جریدہ ایشیا ویک کو ایک انٹرویو دیا جس میں انہوں نے مسلح جدوجہد کو ترک کرنے، عدم تشدد کے ذرائع کی حامی سیاسی پارٹیوں سے تعاون کا اعلان کیا، طلبا کا سب

۲ر جون ۱۹۸۹ء فوجی ترجمان نے کہا کہ مئی ۱۹۹۰ء کے انتخابات کے بعد بھی مارشل لاء کی حکومت رہے گی۔ جب تک منتخب اسمبلی نیا آئین منظور نہیں کرتی اور اس آئین کے تحت حکومت نہیں بناتی اس وقت تک موجودہ حکومت رہے گی اس کے جواب میں آنگ سان سوچی نے کہا جب تک انتقال اقتدار کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں ہوتی اس وقت تک این ایل ڈی انتخابات میں حصہ نہیں لے سکتی۔ اس نے مزید کہا کہ این ایل ڈی نے اس بات کا اظہار اور اقرار کیا ہے کہ دفاعی افواج میں بہت اچھے افسر بھی ہیں جو لوگوں کے خواہشات کے مطابق جمہوریت کی تحریک کے سلسلے میں آنے جانے کی آزادی کے بھی قائل ہیں اور جن کی خواہش ہے کہ دفاعی افواج عزت و وقار سے غیر جانبدار رہیں۔ آنگ سان سوچی نے آخر میں کہا کہ این ایل ڈی کسی بھی صورت دفاعی افواج سے ٹکرانا نہیں چاہتی۔

۵ر جون ۱۹۸۹ء حزب مخالف کے بیانات وغیرہ کی اشاعت اور تقسیم کے سلسلے میں فوجی حکومت کی طرف سے لگائی گئی پابندیوں کے بارے میں آنگ سان سوچی نے کہا میرا خیال ہے کہ این ایل ڈی اور دوسری سیاسی جماعتیں جو قانوناً رجسٹرڈ ہیں، اپنی دستاویزات وغیرہ چھاپنے کی مجاز ہیں۔ چنانچہ اس کی پارٹی یہ اشاعتی کام جاری رکھے گی، کیونکہ عوام تک پہنچنے کا ایک ہی بڑا ذریعہ ہے۔ این ایل ڈی کی پوزیشن کے مطابق اس قانون کی تعبیر یوں ہوگی "سیاسی پارٹیاں قانوناً مجاز ہیں کہ وہ آزادانہ طور پر اپنی دستاویزات چھاپیں اور تقسیم کریں" چنانچہ اس تعبیر کی روشنی میں پارٹی کا مواد اشاعت سے پہلے حکام کو طلب کرنے پر بھی نہیں دکھایا جائے گا نہ ان کی منظوری حاصل کی جائے گی۔

۲۱ر جون ۱۹۸۹ء رنگون میں این ایل ڈی کے ہیڈ کوارٹر میں میموریل سروس ہوئی جس کے بعد سنہہ ن سرکل میں ان جگہوں پر پھول چڑھائے گئے جہاں گذشتہ مہینوں میں جمہوریت کے فدائی شہید ہوئے تھے۔ سیکورٹی فورسز نے آنگ سان سوچی کو تھوڑی دیر کے لئے زیر حراست لے لیا۔ اسی دوران مظاہرین اور پولیس میں جھڑپ ہو گئی۔ فائرنگ ہوئی، ایک آدمی مر گیا۔ (بعد میں پتہ چلا کہ مرنے والا حکمران پارٹی کارکن تھا) آنگ سان سوچی نے بعد میں فوج کی مذمت کی کہ اس نے ایک پرامن تقریب کو ختم کرنے کی حماقت کی۔ اس نے کہا کہ اگر جمہوریت کی خاطر جان دینے والوں کی برسیوں پر بھی فوج نے گولیاں

چلائیں تو پھر خونریزی کبھی بھی ختم نہیں ہوگی۔ اس نے دعوے سے کہا کہ حکام یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہم بے چینی پھیلا رہے ہیں مگر ایسی کوئی بات نہیں...... ہمیں فسادات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ جب تک انسانی حقوق اور جمہوری آزادی نہیں ملتی اس وقت تک اس قسم کے انتخابات نہیں ہو سکتے جس قسم کے انتخابات ہم چاہتے ہیں۔

۲۲ر جون ۱۹۸۹ء فوجی حکومت نے آٹھ صفحے کا خصوصی رسالہ چھاپا جس میں این ایل ڈی کو کمیونسٹوں کی تخلیق کردہ پارٹی قرار دیتے ہوئے آنگ سان سوچی پر کافر ہونے سے لے کر فوج کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے تک کے الزامات تک لگائے گئے تھے۔ اس پر سرکاری ریڈیو نے آنگ سان سوچی سے یہ باتیں بھی منسوب کیں............

"دفاعی افواج میں بھی دو صفیں ہیں ایک صف ان فوجیوں کی ہے جو عزت دار ہیں اور عوام کے ساتھ ہیں جب کہ دوسری صف میں بے غیرت فوجی ہیں جو صرف اپنے اقتدار کی عمر لمبا کرنے کی کوشش میں ہیں۔ ہمیں فوج کو زیر اثر لانے کے لئے خاصی جان مارنا پڑے گی۔ بعض فوجی علی الاعلان عوام کے ساتھ ہیں، بعض خاموشی سے عوام کے ہم نوا ہیں لیکن وہ بھی ہیں جو عوام کے مخالف ہیں——"

سرکاری ریڈیو نے آنگ سان سوچی کی مبینہ تقریر کا یہ اقتباس بھی پیش کیا۔

سکولوں کو کھولنے کے مسئلے پر دوبارہ غور کیا جائے کیونکہ سکول کھلنے سے پھر فسادات ہو سکتے ہیں...... جب سکول دوبارہ کھل گئے تو وہ طلبا کو یہ نہ بتا سکی کہ انہیں سکولوں میں جانا چاہئے یا نہیں جانا چاہئے...... لیکن جو سکول جا رہے ہیں اور جو سکول نہیں جا رہے سبھی کو جمہوریت کے لئے جدوجہد کرنی ہے۔"

ریڈیو نے ۱۷ر جون کو سان چونگ اور آنگ سان سوچی کی تقریر کے حوالے سے یہ الفاظ بھی اس سے منسوب کیے۔ "لوگوں کی طرف منصفانہ قوانین کی پابندی کرنی چاہئے غیر منصفانہ قوانین کو نہیں ماننا چاہئے...... این ایل ڈی کو عوام کا ساتھ دینا چاہئے اور حکومت کو چیلنج کرتے رہنا چاہئے۔ نشریہ کے مطابق آنگ سان سوچی کی یہ تقریریں گواہ ہیں کہ وہ

فسادات کو ہوا دے رہی ہے اور لوگوں حتیٰ کہ بچوں تک کو کہہ رہی ہے کہ وہ حکومت کی بات نہ مانیں اس کی مخالفت کریں. اس کے جواب میں آنگ سان سوچی نے صحافیوں کو بتایا کہ "وہ اور اس کی پارٹی کمیونسٹوں کے خلاف ہیں خبر کے مطابق اس نے تسلیم کیا کہ این ایل ڈی میں بعض ایسے لوگ شامل ہیں جو کس زمانے میں کمیونسٹ ہوا کرتے تھے یا ان کا کمیونسٹوں سے رابطہ تھا۔ آنگ سان سوچی نے کہا کہ یہ سب لوگ اس نظریہ کو رد کر چکے ہیں اور اب کمیونسٹ پارٹی کے رکن نہیں رہے" ۲۶ر جون ۱۹۸۹ء آنگ سان سوچی نے متذکرہ الزامات کا ایک پریس کانفرنس میں پھر جواب دیا ______

______ "اس نے جنرل نی ون پر الزام لگایا کہ اب بھی یہی خیال کیا جاتا ہے کہ حکومت کے پردے میں وہی کار فرما ہے وہی فوج کو عوام سے الگ کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اور اسی نے فوج کو اس انداز میں ڈھال دیا ہے تو گویا وہ صرف اور صرف اس کی خاطر بنی ہے .... اس نے کہا کہ نہ وہ کمیونسٹ ہے اور نہ ہی مذہب کے خلاف. اس نے ملک کے فوجی حاکموں کو بدھ کی تعلیمات کے دو نکتے۔ جھوٹ بولنے اور قتل کرنے کی مکمل ممانعت ______ یاد دلائے۔ آنگ سان سوچی نے کہا کہ نیشنل لیگ فار ڈیمو کریسی سنسر کرائے بغیر اپنا مواد چھاپتی اور تقسیم کرتی رہے گی کیونکہ یہ حق ۱۹۶۲ء کے آئین کے تحت ہمیں حاصل ہے. ہم حکومت کی تازہ پابندی کی مخالفت کرتے رہیں گے۔ اس کے علاوہ اس نے ایک پروگرام کا اعلان کیا جس کے مطابق مختلف تاریخوں پر مختلف واقعات سے متعلق تقریبات منعقد کی جائیں گی۔ ۷ر جولائی ۱۹۶۲ء کو حکومت نے رنگون میں اس عمارت کو دھماکے سے اڑا دیا تھا جس میں سٹوڈنٹس یونین کا دفتر تھا۔ ۱۹ر جولائی اس تاریخ کو ۱۹۴۷ء میں اس کے باپ کو قتل کر دیا گیا تھا۔ یہ دن یوم شہیدا: کہلائے گا. ۸ر اگست جب گزشتہ برس فوج نے پھر اقتدار براہ راست اپنے ہاتھ میں لیا ______ اس نے مزید فسادات کی روک تھام کے لئے برما کے فوجی لیڈروں کو اتحاد کی دعوت دی۔

ایمنیسٹی انٹرنیشنل نے اس میں اضافہ کرتے ہوئے بتایا کہ آنگ سان سوچی نے یہ

حکومت کی طرف سے طاقت کے ذریعے مسائل حل کرنے اور اس سبب لوگوں میں پھیلی مایوسی کا ذکر کیا۔ اس موقع پر فوجیوں سے بھرے متعدد ٹرک وہاں موجود رہے۔

۸ر جولائی ۱۹۸۹ء ایک انٹرویو میں:

_____ ”آنگ سان سوچی نے بتایا کہ این ایل ڈی نے ۷ر جولائی کو طلباء کے مظاہروں میں حصہ نہ لینے کو فیصلہ کیا تھا کیونکہ اس کے نزدیک جدوجہد کو آگے بڑھانے کا یا لوگوں میں بیٹھ کر یہ بتاتے کہ ہم کس طور حکومت پر تنقید کرتے ہیں، یہ واحد طریقہ نہیں۔ اس نے اس بات کا اعادہ کیا کہ این ایل ڈی تشدد نہیں چاہتی لیکن گلیوں بازاروں میں مظاہرے کرنے سے مکمل انکاری بھی نہیں۔ اس نے وضاحت کی کہ عدم تشدد پر کاربند ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ ہم کمزور سے بن کر گھروں میں بیٹھ جائیں اور کچھ بھی نہ کریں، اس نے کہا کہ پارٹی کیمونسٹ طریقے بھی استعمال نہیں کرے گی نہ سول نافرمانی کر سکتی ہے، اس نے کہا کہ اس قسم کی سیاسی کارروائی کی اپنی شاندار تاریخ ہے اور اشارہ کیا کہ وہ اپنی تقریروں میں مہاتما گاندھی اور مارٹن لوتھر کنگ کی مثالیں اسی نقطہ نظر سے پیش کرتی رہی ہے۔ اس نے اپنے اس خیال پر زور دیا کہ فوجی کونسل کی طرف سے سیاسی جماعتوں سے مذاکرات سے انکار کے پیچھے بھی نی ون کا ہی ہاتھ ہے۔ اس نے کہا کہ این ایل ڈی فوج والوں کو یہ احساس دلانا چاہتی ہے کہ چند بوڑھے لوگوں کے اقتدار کی بقا کے لئے فوج کو ٹھگوں جیسا کردار ادا کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ اس نے کہا ”ہم چاہتے ہیں کہ فوج غیر جانبدار رہے۔ ایک پیشہ ور فوج کا یہی کردار ہے“۔

۱۰ر جولائی ۱۹۸۹ء ایک انٹرویو میں:

_____ ”آنگ سان سوچی نے تصدیق کی کہ این ایل ڈی اب بھی یہ تقریبات منانے کی تیاریاں کر رہی ہے مثلاً اس کے والد کے قتل کا یوم، پھر نی ون کے استعفیٰ کا دن، ۸ر اگست ۱۹۸۸ء کے مظاہروں اور طالبعلموں کی

شہادت کا دن، ۱۸ر ستمبر کو فوج کا پھر اقتدار پر قبضہ کرنے کا دن۔ اس نے زور دے کر یہ بات کہی کہ این ایل ڈی عدم تشدد کے اصول میں ایمان رکھتی ہے اسی لئے یہ تقریبات اسی اصول کے تحت منائی جائیں گی پارٹی سکیورٹی فورسز سے کوئی ٹکراؤ نہیں چاہتی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ این ایل ڈی تحریک جمہورت کو مضبوط بنانا چاہتی ہے لیکن پر امن طریقے سے اور نظم و ضبط کے دائرہ کے اندر۔ مزید کہا "ہم تشدد نہیں چاہتے" ———

اسی روز آنگ سان سوچی نے رنگون میں سولے پگوڈا کے قریب تیس ہزار کے سے خطا کیا۔ تیس ہزار کا اندازہ اس کا اپنا تھا اور پارٹی کے اس عہد کو دہرایا کہ اس کی پارٹی ظالمانہ نظام کے خلاف مہم کو جاری رکھے گی۔ اس نے اعلان کیا سول نافرانی رہے گی، لوگوں کو دبانے کے لئے بنائے گئے قوانین بھی نہیں مانیں گے تاہم اس مرحلے پر ہماری سول نافرمانی سے مراد یہی ہے کہ فوجی کونسل کے حکم کے خلاف جس قدر پمفلٹ اور مواد چھاپ سکتے ہیں چھاپیں گے اس نے مزید کہا "یہ کوئی پر تشدد عمل نہیں ہے، یہ عمل تو اس قدر پرامن ہے کہ اس کے مقابلے میں ٹائپ رائٹر کی پر انگلی رکھنے سے زیادہ شور ہوتا ہے۔ اپنی تقریر میں اس نے پھرنی ون پر حسب معمول تنقید کی اور کہا کہ وہ آج بھی سیاسی طور پر مضبوط ہے۔ اس کی پارٹی کو یقین ہے کہ ساموئنگ کے پردے میں نی ون ہی حکومت کے تار ہلا رہا ہے۔

۱۶ر جولائی ۱۹۸۹ء آنگ سان سوچی نے کہا کہ حکومت کی بار بار کی تنبیہ کے باوجود اس کی پارٹی اور دوسری مخالف پارٹیاں ۱۹ جولائی کو یوم شہیداں منانے کی تیاریاں کر رہی ہیں۔ سی طرح دوسری برسیاں بھی منائی جائیں گی۔ غیر ملکی ذرائع ابلاغ کو دیئے انٹرویو کے مطابق "، ہر گز ہر گز ٹکراؤ نہیں چاہتے ہم فساد نہیں چاہتے۔ ہم صرف پرامن جلوس نکالنا چاہتے ہیں...... ہم برسیاں بھی مناتے رہے گے...... اور یہ سب کچھ سیاسی مسائل کو طاقت سے حل کرنے کی پالیسی کے خلاف احتجاج ہے" ——— اس نے کہا مجھے یقین ہے کہ سیاسی گرفتاریوں کا سلسلہ ۱۹ جولائی تک ہر روز جاری رہے گا اور اس کے بعد بڑھ جائے گا...... غیر ملکی ذرائع ابلاغ کی رپورٹ کے مطابق آنگ سان سوچی اور این ایل ڈی کی مجلس عاملہ کے ارکان کو توقع ہے کہ انہیں بھی ایک آدھ دن میں گرفتار کر لیا جائے

گا۔ چنانچہ اس کمیٹی کے ارکان کی تعداد نو سے تیرہ کر دی گئی تاکہ حکومت پوری قیادت کو گرفتار کرنے میں کامیاب نہ ہو جائے۔

اس مرحلے پر فوجی کمیٹی نے ایک اور حکم جاری کیا جس کے تحت فوجی افسروں اور جونیئر رینک کے فوجیوں کو بھی سیاسی مظاہرین کو گرفتار کر کے مندرجہ ذیل سزائیں دینے کا اختیار دے دیا، تین سال بامشقت، عمر قید یا پھانسی۔

۱۷ر جولائی ۱۹۸۹ء آنگ سان سوچی نے ایک انٹرویو میں کہا کہ فوجی ٹریبونلوں میں فوری مقدموں کے بارے میں نیا ریگولیشن حکومت کی طرف سے اپنی جابرانہ اقدامات کی کڑی ہے جو عوام کے خلاف کیئے گئے ہیں۔ اس نے کہا کہ این ایل ڈی کے ارکان، طالب علم اور دوسرے نوجوان لوگ شہدا کے مزاروں پر پھول چڑھانے کے لئے پروگرام بنا رہے ہیں وہ انتہائی خاموشی اور پرامن طریق سے جاکر پھول چڑھائیں گے۔ اس نے کہا کہ میرے خیال میں لوگ ان سارے جابرانہ اقدامات اور گرفتاریوں سے تنگ آگئے ہیں۔ اس نے وعدہ کیا کہ یوم شہیداں پر این ایل ڈی کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرے گی لیکن متنبہ کیا کہ اگر مسلح فوجی بھی ساتھ ساتھ ہوئے تو پھر کوئی نہ کوئی مسئلہ پیدا ہونے کا خدشہ ہوتا ہے"

۱۸ر جولائی ۱۹۸۹ء حکومت نے الزام لگایا تھا کہ این ایل ڈی بم دھماکوں میں ملوث ہے۔ آنگ سان سوچی نے اس الزام کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ دہشت گردی کی یہ وارداتیں ہمارے پارٹی اصولوں کے سراسر خلاف ہیں تاہم پارٹی نے مانا ہے کہ جو لوگ حکومت کی تحویل یا جیل میں ہیں یا جنہیں گرفتار کیا گیا ہے ممکن ہے ان میں سے کسی کا ہاتھ ان دھماکوں میں ہو مگر پارٹی نے تو بم دھماکوں کی شدید مذمت کی ہے۔ اگر پارٹی کے رکن ان دھماکوں میں ملوث پائے گئے تو انہیں پارٹی سے نکال دیا جائے گا۔

۱۹ر جولائی ۱۹۸۹ء. این ایل ڈی اور دوسری جماعتوں کی طرف سے یوم شہدا کی تقریب کے منانے کے موقع پر حکومت پہلے ہی کئی ہزار سپاہی رنگون شہر میں لے آئی۔ لائٹ انفنٹری کی تقریباً بارہ بٹالین کی نفری اور لائی گئی، شہر میں صبح چھ بجے سے شام چھ بجے تک کرفیو نافذ کر دیا گیا۔ این ایل ڈی نے جلوس کا پروگرام منسوخ کر دیا اور کہا۔

"ہم لوگوں کو سیدھا موت کے منہ میں نہیں لے کر جانا چاہتے،

اس لئے انسانی جانوں کو بچانے کے لئے یہ فیصلہ کیا گیا ہے۔ این ایل ڈی نے

کر دیا گیا۔ فوجی حکومت نے اعلان کیا کہ آنگ سان سوچی اور ٹن یو کو ایک ایک سال کے لئے ان کے گھروں میں نظر بند کر دیا گیا ہے۔ اس دوران وہ صرف قریبی رشتہ داروں سے مل سکیں گے۔ ان کے ٹیلی فون اور دوسرے نامہ وپیام کے ذریعے ختم کر دیئے گئے۔ وریں اثنا حکام نے این ایل ڈی کی مجلس عاملہ کے دوسرے ارکان کو بھی گرفتار کرنا شروع کیا۔ گرفتاریوں کی اس نئی لہر پر لندن ٹائمز نے اندازہ لگایا کہ این ایل ڈی کے دو ہزار حامی جیلوں میں ہیں۔ ایمنیسٹی انٹرنیشنل نے بتایا کہ مجلس عاملہ کے کم از کم چھ رکن جیل میں ڈال دیئے گئے تھے۔ ان کے ساتھ آنگ سان سوچی کا ذاتی عملہ بھی قید کر دیا گیا تھا۔ دی نیویارک ٹائمز نے امریکی سفارت خانے کے حوالے سے بتایا کہ جمہوریت پسندوں کے ساتھ بعض اوقات بہت برا سلوک کیا جاتا ہے۔ برے سلوک میں مار پیٹ اور تشدد شامل ہے۔"

آنگ سان سوچی نے گھر پر نظر بندی کے جواب میں حکومت سے مطالبہ کیا کہ اسے رنگون کے انسین جیل میں انہی حالات میں رکھا جائے جن حالات میں اس کی پارٹی کے خلاف حکومت کی کارروائی کے بعد گرفتار ہونے والے کارکنوں کو رکھا گیا ہے جب اس کی درخواست نہیں مانی گئی تو اس نے بھوک ہڑتال کر دی۔ بھوک ہڑتال کے دوران اس نے صرف پانی پینا قبول کیا۔ یہ بارہ دن جاری رہی۔ عالمی پریس میں تو اس کی بھوک ہڑتال کی بڑی خبریں تھیں مگر برما کی حکومت نے کہا کہ کوئی بھوک ہڑتال نہیں ہوئی پھر حکام کی طرف سے اسے پکا یقین دلایا گیا کہ اس کے حامیوں سے غیر انسانی سلوک نہیں کیا جا رہا اور ان سے قاعدے قانون کے مطابق سلوک کیا جائے گا۔"

عوامی فیصلہ ماننے سے انکار

آنگ سان سوچی کی بھوک ہڑتال کے بارے میں کہا گیا تھا کہ برما کی حکومت کے لئے یہ سب سے بڑا چیلنج ہے۔ ۸ر اگست کے قتل عام کے خلاف مقررہ یوم پر آنگ سان سوچی کے چالیس حامیوں نے این ایل ڈی اے کے دفتر میں بھوک ہڑتال کی۔ انہوں نے آنگ سان سوچی کی رہائی اور سیاسی آزادی کا مطالبہ کیا۔ اسی روز بدھ بھکشوؤں نے اپنی خانقاہی ریت کے مطابق تقریب کر ڈالی اور فوج اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتی

تھی۔ وہ بڑی تعداد میں اکٹھے ہوئے اور مذہبی رسم کے مطابق گھر گھر سے بھیک مانگنے کے لئے گلیوں میں پھیل گئے۔ یہ دراصل حکومت کی طرف سے لگائے گئے کرفیو کی پابندی کو توڑنے کا مظاہرہ تھا۔

بہر طور جب کہ ان مثالوں سے ظاہر ہے آنگ سان سوچی کی قیادت کا ہالہ بٹ گیا۔ تو پھر اپوزیشن ایک طرح سے لوگوں سے کٹ گئی اور زیادہ تر ایک علامت کے طور پر زندہ رہی۔ حکومت نے اپنی گرفت زیادہ مضبوط بنانے پر زور لگایا۔ آنگ سان سوچی کے ساتھی اور این ایل ڈی کے چیئرمین ٹن یو کو تین سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔ پوتو اور اس کی چھوٹی سی پارٹی کے رکن پکڑے گئے اور گھروں میں نظر بند ہوئے۔ اب سیاسی جلسوں پر پابندی اور الیکشن کے پمفلٹوں کا سنسر موثر طور پر ہو سکتا تھا۔ آنگ سان سوچی کے خلاف کردار کشی کی مہم جاری رہی اور اسے اس کا جواب دینے کا کوئی موقع بھی نہیں دیا گیا۔ اس کا نام الیکشن لڑنے کے اہل امیدواروں کی فہرست سے کاٹ دیا گیا۔ جب اس کا شوہر ڈاکٹر مائیکل آرس اس ملنے برما آیا تو اسے فوج نے ایئرپورٹ پر ہی گرفتار کر لیا اس کے بارے میں کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے کسی قسم کی خبر دینے سے انکار کر دیا گیا اور برطانیہ اور دوسرے مغربی سفارت خانوں کے احتجاج کے باوجود ایسا رویہ اختیار کیا گیا۔ دنیا کو صرف اسی وقت پتہ چلا کہ آنگ سان سوچی کی ہڑتال ختم ہو گئی اور مائیکل آرس کو فوج کی حراست ہی سے سفارتی نمائندوں سے ملوایا گیا۔ دراصل حکومت نے ڈاکٹر ایرس سے کوئی برا سلوک نہیں کیا تھا. وہ اسے آنگ سان سوچی کے گھر لے گئے تھے اور وہیں نظر بند رکھا تھا تاہم جنوری ۱۹۹۰ء کے بعد اسے یا خاندان کے کسی بھی فرد کی آنگ سان سوچی سے ملاقات کرانے سے انکار کر دیا گیا۔ ان کے کم سن بچوں کو برما کی شہریت سے محروم کر دیا گیا اور جولائی ۱۹۹۰ء سے اس کا خط پتر کا سلسلہ بھی ختم کر دیا گیا۔

اپنے جابرانہ اقدامات کے بعد فوج کو اپنے طور پر تسلی ہو گئی کہ وہ انسانی حقوق کے مطالبہ کو دبانے میں کامیاب ہو گئی ہے اور آنگ سان سوچی اور اس کی پارٹی کے دوسرے لیڈروں کی غیر موجودگی کے بعد لوگوں کے لئے سرکاری پارٹی، نیو یونٹی پارٹی (این یو پی) کو ووٹ ڈالنے کے علاوہ اور کوئی متبادل ہی نہیں رہا۔ الیکشن کے دوران غیر ملکی صحافیوں (برمی امور سے آشنا صحافیوں کو نہیں) کو انتخابات کا مشاہدہ کرنے کی اجازت دے دی گئی

ایک مربوط اور مستقل مہم چلائی تو بالکل ڈرامائی طور پر دنیا کو برما کی صورت حال سے باخبر کر دیا۔ صرف اس کی برما میں موجودگی نے دنیا کی توجہ برما کے مسائل و مشکلات پر مرکوز کرا دی اور ان کی توجہ اب بھی لگی ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ اسے سخاروف انعام، رفتو انعام اور ۱۹۹۱ء کا امن کا نوبیل انعام دیا گیا ہے۔ فوجی حکومت کو اندازہ ہے کہ وہ حالات پر کیسے کیسے اثر انداز ہو سکتی ہے اس لئے اسے ان شرائط پر رہا کرنے کی پیشکش کی ہے کہ وہ انسانی حقوق کی مہم کو ترک کر کے برما سے چلی جائے۔ اس کی جان سخت خطرے میں ہے اس کے باوجود اس نے اس پیشکش کو غور کے قابل بھی نہیں سمجھا۔

گزشتہ تین برسوں میں آنگ سان سوچی نے نہ صرف اپنے لوگوں کی قیادت کی ہے بلکہ اس نے مغربی دنیا کو بھی بہت کچھ سکھایا ہے۔ مہم کے ابتدائی دنوں میں ذرائع ابلاغ کو یہ بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ اس خاتون کو کس کھاتے میں اور کیونکر ڈالے۔ انگریز پریس نے اسے بے نظیر بھٹو یا کورزون اکینو کے مماثل قرار دیا۔ مگر ان لیڈر خواتین کو تو ورثے میں پارٹی ملی تھی آنگ سان سوچی کو کوئی سیاسی تنظیم نہیں ملی اور پھر یہ کہ (جنرل ضیا اور صدر مارکوس کے مقابلے میں) برما کی فوجی حکومت مضبوط تھی۔ یہ بات بھی ہے کہ ان خواتین کی شہرت عدم تشدد کی مرہون منت نہ تھی۔ امریکی پریس میں آنگ سان سوچی کو جارج واشنگٹن اور جین فونڈا کے مشابہہ قرار دیا گیا۔ فرانسیسی پریس نے برما کو ایشیا کا پولینڈ اور آنگ سان سوچی کو ہسپانوی ری پبلک لیڈر لا یا سیونارا قرار دیا۔ مگر اب اس قسم کے انوکھے تقابل ختم ہو گئے ہیں اور آنگ سان سوچی کو اب ایک مختلف قسم کی ہستی تسلیم کیا گیا ہے۔ وہ ایک ایسا فرد ہے جس کا بین الاقوامی قدو قامت اخلاقی معیاروں کے مطابق متعین کیا جائے گا اور یہ بھی دیکھا جائے گا کہ اس نے کس طرح انسانی حقوق کے تصور کو ایمان کا جزو بنا کر برما میں اس کا اطلاق کیا اور وہاں ایک عظیم تبدیلی لے آئی۔ تاہم سب سے اہم پہلو اس کی بھوک ہڑتال ہے ان تمام پہلوؤں سے دیکھیں تو اس کا روپ کچھ اور ہی طرح کا ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ جب اس نے بھوک ہڑتال کی تھی تو لندن ٹائمز نے آنگ سان سوچی کو سیدھے سبھاؤ برمی گاندھی لکھ دیا تھا۔

لکھنے والے

فلپ کریگر : آکسفورڈ یونیورسٹی ـ کے جدید تاریخ کے شعبہ میں ویلکم ٹرسٹ کے نامزد فیلو، لندن سکول آف اکنامکس میں لیکچرر، لائبریرین اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں انڈین انسٹی ٹیوٹ کا مشیر۔

این پاسٹرنگ سیلٹر : آکسفورڈ کے سینٹ اینز کالج کے شعبہ انگریزی میں فیلو۔ شیکسپیئر دی ڈائریکٹر کی مصنفہ اور اے وینشڈ پاسٹ دی میمائرز آف الیگزینڈر پاسٹرنگ کی مترجمہ : ۱۹۵۸ء میں ادب کا انعام حاصل کرنے والے بورس پاسٹرنک کی بھانجی (بہن کی بیٹی) : شاعر کریگ رین سے شادی شدہ، آکسفورڈ میں مقیم اور چار بچوں کی ماں

جوزف سلورسٹین : نیو جرسی کی رٹگرز یونیورسٹی میں پولیٹیکل سائنس کا پروفیسر : برما پر بہت سے کتابوں کا مصنف اور مرتب ۶۲ - ۱۹۶۱ء میں مانڈلے یونیورسٹی میں فلبرائٹ لیکچرر : اور ۷۱ - ۱۹۷۰ء میں سنگاپور کے انسٹی ٹیوٹ آف ساؤتھ ایسٹ ایشین سٹڈیز کا ڈائریکٹر

ماتھان ای: اقوام متحدہ کے سیکرٹریٹ کی ریٹائرڈ سینئر سٹاف ممبر۔ آنگ سان سوچی نے اسے بار بار میری "برے وقتوں کی خالہ" سے یاد کیا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اس کا رابطہ آنگ سان کے خاندان سے ہوا اس وقت سے اب تک خاندان کی قریبی دوست ہے۔ عالمی سوِل افسر کی حیثیت سے بہت سے ممالک میں طرح طرح کے فرائض سرانجام دینے مگر برما میں بہت اچھی موسیقار کی حیثیت سے بلاٹ پیان تھان (انگلینڈ پلٹ تھان) کے نام سے جانی جاتی ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آسٹریا میں مقیم

Mashal is a small organisation dedicated to the publishing of books on social, cultural and developmental themes of contemporary relevance. Trends in modern thought, human rights, the role of women in development, issues of governance, environmental problems, education and health, popular science, drugs and creative literature relating to these and other themes are the focus of Mashal's programme.

While Mashal works for the widest dissemination of its publications, this is a non-commercial, non-profit enterprise. Mashal therefore seeks the support of individuals and aid-giving agencies world-wide which consider the foregoing objectives worthy of promotion.

For the publication of this book, Mashal is specially thankful to the Toyota Foundation for its financial support.

مشعل ایک غیر سرکاری اور غیر تجارتی اشاعتی ادارہ ہے جو 1988ء میں لاہور میں بحیثیت فاؤنڈیشن رجسٹر ہوا۔ اس کا مقصد جدید سائنسی، معاشی، معاشرتی اور ادبی رجحانات کی ترویج و اشاعت کے لئے کم قیمت کتابیں شائع کرنا ہے۔ انسانی حقوق، ترقی میں خواتین کے کردار، منشیات، تعلیم، صحت عامہ، بہتر نظم و نسق، ماحولیاتی مسائل، اور ان سے متعلق دوسرے موضوعات مشعل کے پروگرام میں شامل ہیں۔

مشعل اپنے طور پر کتابوں کی اشاعت اور تقسیم کے لئے ہر ممکن وسائل استعمال کرتا ہے، تاہم اس مقصد کے لئے افراد اور قومی و بین الاقوامی امدادی اداروں کی مالی معاونت کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔

مشعل اس کتاب کی اشاعت کے لئے ٹویوٹا فاؤنڈیشن کی مالی امداد کا ممنون ہے۔

برما میں انسانی حقوق اور جمہوریت کے لئے آنگ سان سوچی کی جدوجہد صرف اپنے ملک میں عدل وانصاف کے قیام تک محدود نہیں۔ بلکہ یہ دنیا بھر میں ان سب کی جدوجہد ہے جو اپنے مستقبل کا فیصلہ آپ کرنے کا حق مانگتے ہیں۔ جب تک اس دنیا میں آزادی کی جدوجہد جاری ہے اس وقت تک آنگ سان سوچی جیسی ہستیاں دوسروں کو میدان وغا میں اترنے کی ترغیب دیتی رہیں گی۔ آزادی کے لئے فریاد وسطی یورپ، روس، افریقہ یا ایشیا جہاں کہیں سے بھی بلند ہوتی ہے اس کا آہنگ اس کے معنی ایک ہی ہوں گے۔ سارے انسانوں کو وقار اور عزت دو۔ سارے انسانوں کو امیدیں دو۔

واتسلاو ہادیل

مشعل